انٹرمیڈیٹ

کلیہ اناث

نصابِ سلسلۂ علمیہ جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند جلد اول

(برائے انٹرمیڈیٹ)

(طبع دوم)

تالیف

مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی

سابق رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

نظرثانی طبع دوم

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم - اے - ایل ایل بی (عثمانیہ)

لکچرار کلیۂ جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۸ھ م سنہ ۱۳۴۸ف م سنہ ۱۹۳۹ء

دارالطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

(۱) سیناک خاندان ـــ تحقیقی صدی ق م ـــ سنہ ۱۳ ق

(۲) نند " ـــ سنہ ۴۱۳ ق م ـــ سنہ ۳۲۲ ق م

(۳) موریا " ـــ سنہ ۳۲۲ ق م ـــ سنہ ۱۸۵ ق

(۴) سنگا " ـــ سنہ ۱۸۵ ق م ـــ سنہ ۷۳ ق

(۵) کانو " ـــ سنہ ۷۳ ق م ـــ سنہ ۲۷ ق

(۶) اندھر " ـــ سنہ ۲۷ ق م ـــ سنہ ۲۰۲

(۷) غیر اقوام سنہ ۱ ـــ سنہ ۲۰۲ م ـــ ۳۲۰

(۱) باختر ـــ سنہ ۲۵۰ ق م ـــ سنہ ۱۲۳ ق م

(۲) پارتھی ـــ سنہ ۱۲۳ ق ـــ سنہ ۲۰ ع

(۳) سیتھی ـــ سنہ ۰ م ـــ سنہ ۳۲۰ ع

(۸) سلطنت مگدھ ـــ سنہ ۳۲۰ م ـــ سنہ ۵۰۰ م

(۹) گوجرن ـــ سنہ ۴۸۵ م ـــ سنہ ۶۰۰ م

(۱۰) ہرش ـــ سنہ ۶۰۵ م ـــ سنہ ۶۴۷ ع

(۱۱) طوائف الملوکی ـــ سنہ ۶۴۷ ع ـــ سنہ ۷۰۵ م

(۱۲) عرب فتوحات ـــ سنہ ۷۰۵ م

سنہ ۱۰۲۱ ع

(۱۳) غور خاندان

954

55 تا ۵

فہرست مضامین

تاریخ ہند جلد اوّل

"طبع دوم"

باب ۱

مُقدِمہ

(از صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۰)

باب ۲

ہندوستان کے قدیم باشندے

(از صفحہ ۱۱ تا صفحہ ۲۹)

باب ۳
قوم آریا
(از صفحہ ۳۰ تا صفحہ ۴۴)

باب ۴

باب ۵

باب ٦

(ازصفحہ ۷۳ تا صفحہ ۹۰)

باب ۷

(ازصفحہ ۹۱ تا صفحہ ۱۰۰)

باب ۱۰

ضمیمہ باب ۱۰

باب ۱۱

ضمیمہ باب ۱۱

ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابیں

باب ۱۲

باب ۱۳

مسلمانوں کا تسلّط سندھ پر

باب ۱۴

سلطنت غزنی

تتمہ باب ۱۵

اس عہد کی تاریخیں

باب ۱۶

دیباچہ

جامعۂ عثمانیہ کے نصاب تاریخ کے متعلق تراجم و تالیفات کا کام سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے سپرد ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں مولوی سید ہاشمی صاحب رُکن شعبۂ تالیف و ترجمہ نے طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لیے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی ہے اور اسی تاریخ کا پہلا حصّہ یہ کتاب ہے جس میں ہندِ قدیم کے حالات چند مستند انگریزی تصانیف سے اخذ کرکے بیان کیے گئے ہیں۔

چونکہ اکثر قدیم تاریخی حالات کے متعلق معلومات کا کوئی ذخیرہ یکجا موجود نہیں ہوتا، اس لیے اہلِ فن کو اپنا گوہرِ مقصود حاصل کرنے میں بہت دُور دُور کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ جن دُور افتادہ و منتشر ماخذوں سے اس فن میں وہ اپنی کتابیں لکھتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں، ایک تو ایسے ہیں جو اسی مُلک سے دستیاب ہوئے ہیں مثلاً ہندوؤں کی برائے نام پُرانی تاریخیں، یا اُن کی مذہبی کتابیں اور حکایات، یا مشہور شاعروں کا کلام مہابھارت اور رامائن ہیں جن میں مشاہیر قوم کے حالات نہایت پُرشوکت عبارت میں جوشِ عقیدت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، یا پُرانے راجاؤں کے سکّے ہیں جن کے حروف و نقوش سے بادشاہوں کے نام، اُن کی مدتِ حکومت اور اُن کے تمدن پر۔ یہ ملک والوں کا اثر دریافت کیا جاتا ہے یا آثارِ قدیمہ ہیں جن کی وضع قطع دیکھ کر یا جن کے کتبوں کی عبارت پڑھ کر بانیانِ تعمیر کے حالات منکشف ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے ماخذ غیر مُلک والوں کی تصانیف ہیں اس کی کیفیت یہ ہے کہ میلادِ مسیح علیہ السلام سے کچھ کم چھ سو برس پہلے بودھ مذہب پیدا ہوکر ہندوستان کے باہر جنوبی اور مشرقی ملکوں میں شایع ہوگیا تو ان ملکوں سے بالخصوص چین سے اس مذہب کے پیرو ہندوستان میں تیرتھ کے لیے آنے شروع ہوئے کیونکہ یہ مُلک بانی مذہب کا مولد و مسکن تھا تیرتھ کرنے والوں کا یہ سلسلہ مدت تک قایم رہا، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اب تک قایم ہے۔

لیکن پانچویں اور پہلی صدی قبلِ مسیحؑ میں چند لوگ ایسے آئے جنھوں نے اپنے سفرنامے لکھے، اور سفرناموں میں اِس مُلک کے حالات بیان کیے اور یہ نوشتے یا اُن کے اجزا، اس زمانے تک محفوظ رہ کر محققوں کو دستیاب ہو گئے اور اُن کو اپنے کام میں مدد ملی۔ چینیوں کے علاوہ یونانیوں نے بھی یہاں کے حالات وقتاً فوقتاً قلمبند کیے اور اس کی کیفیت یہ ہوئی کہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد ایشیا میں ایک تہلکۂ عظیم پیش آیا، یعنے بادشاہ مقدونیہ اسکندر اعظم نے یورپ سے اُٹھ کر ایشیا میں ایک وسیع سلطنت قایم کی جس میں ایشیائے کوچک، شام و فلسطین، ایران و خراسان، ترکستان و افغانستان یہاں تک کہ سندھ، پنجاب بھی شامل کر لیے گئے۔ اِس تعلق سے یونانیوں کا گزر ہندوستان میں ہو گیا، اور انھوں نے یہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی۔ جس وقت سکندر کی موت پر اُس کی سلطنت، اُس کے اُمرائے لشکر میں تقسیم ہوئی تو مغربی ایشیا کی کُل سلطنت سلیوقس کے حصے میں آئی چونکہ فتوحاتِ سکندری کا تعلق ہندوستان سے ہو گیا تھا، اس لیے یہاں کے راجاؤں اور یونانیوں میں مُلکی تعلقات پیدا ہوئے، شام و مصر کے سفیر اِس مُلک میں وقتاً فوقتاً آئے جن میں سے بعض نے ہندوستان کے حالات میں کتابیں لکھیں اور اس طرح چند صدیوں کے اندر یونانی زبان میں ایک معقول ذخیرہ ہندوستان کے متعلق معلومات کا پیدا ہو گیا جس کو عُلمائے مغرب نے اِس فن میں ایک بیش بہا سرمایہ سمجھا۔ اِن تصانیف کے صدہا سال بعد، یعنی گیارھویں صدی عیسوی میں علامہ ابو ریحان بیرونی، محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آیا، اور یہاں کے حالات میں اپنی مشہور تصنیف "کتاب الہند" لکھی، اور ایسی لکھی کہ ہند قدیم کی تاریخ میں کوئی تالیف بغیر اس کتاب کے مطالعے کے قطعی دشوار ہے۔ مؤلّف کتاب ہٰذا نے ان تمام ماخذوں کو جن سے اس فن میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، نہایت حُسنِ ترتیب سے اپنی تالیف میں بیان کیا ہے۔

پُرانی تاریخ لکھنے میں جہاں اور مشکلات ہیں ایک یہ بھی ہے کہ واقعاتِ ماضی کو بقیدِ وقت لکھنا جو تاریخ نویسی کی سب سے بڑی شرط ہے اکثر غیر ممکن ہوتا ہے۔ اوّلاً تو ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ جس سے پہلے کے حالات دریافت ہی نہیں ہوتے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ واقعات تو بہت سے دریافت ہوتے ہیں، لیکن ان کے زمانے کا ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ چنانچہ شمالی ہند کے حالات مسیح علیہ السلام سے پانچسو ساٹھ برس پہلے کے مطلق دریافت نہیں ہوتے، اور اگر کسی نے کچھ لکھے بھی ہیں تو وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں،

محض قصّے اور کہانیاں ہیں۔ اب اس زمانے سے تیسری صدی قبل مسیح تک جس قدر حالات معلوم ہوتے ہیں اُن کے زمانوں کا تعین اکثر قیاسی طور پر کیا گیا ہے، یعنی کسی ایک واقعے کے تعلق سے جس کی صحیح تاریخ معلوم ہوگئی ہے باقی واقعات کا زمانہ محض اٹکل سے لکھ دیا ہے۔ جنوبی ہند کے صحیح حالات کا زمانہ اور بھی بعد کا ہے اور اس کی تاریخیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ بجز ایک تاریخ کے، یعنی ۳۲۶ق م کے جس میں اسکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا، اور کسی تاریخ کی صحت پر کامل یقین ہونا مشکل ہے۔ مگر باوجود ان مشکلات کے علمائے مغرب نے تحقیق کے میدان میں حقیقت و قیاس کے وہ وہ کرشمے دکھائے ہیں کہ ذوقِ علم کی لذت اور اہلِ فن کی تشنہ دہانی روز بروز زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے۔

اس کتاب پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں، جس سے مراد آج کل کا سرحدی علاقہ شمال و مغرب، سندھ و پنجاب، آگرہ و اودھ، بنگال و بہار، صوبۂ متوسط ہے۔ ہندوؤں کی بہت سی خود مختار ریاستیں قایم تھیں۔ مثلاً بالکل شمال میں گندھار کی ریاست تھی جس کا پایۂ تخت راول پنڈی کے قریب ٹکسلا کا شہر قوم ٹکا کا بسایا ہوا موجود تھا۔ اس کے جنوب میں جمنا کے کنارے قوم کورو کی ریاست تھی جس کا راجدھانی اندرپرست کا شہر موجودہ دہلی سے بالکل متصل تھا۔ اس کے مشرق میں پنچال کی قوم صوبۂ اودھ اور گنگا و جمنا کے دوآب میں ریاست کرتی تھی۔ اندرپرست کے مغرب میں قوم مت سیس کا دور دورہ تھا۔ انھی سے متصل ایک اور قوم صاحب ریاست سورسین کی تھی جس کا دار الحکومت مدھورا، یا متھرا کا شہر جمنا کے کنارے تھا۔ مالوے میں اونتی قوم کا راج اُجین کے شہر میں تھا جس کا نام ابھی تک یہی چلا آتا ہے۔ ایک قوم اجیین کی تھی جس کا مقام صوبہ جات متحدہ کے شمالی علاقوں کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے مشہور گروہ لچھوی اور والیای تھے جن کا مستقرِ حکومت ویسالی کا شہر صوبۂ بہار میں مظفر پور کے قریب تھا۔ ویسالی سے شمال مغرب میں ودھیائی کی بڑی ریاست تھی۔ ودھیائی کو کوئی اودھ، یا اجدھیا سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی ان دونوں علاقوں سے باہر کی ریاست بتاتا ہے۔ اس طرح نیپال کے علاقے میں گورکھپور سے کسی قدر فاصلے پر سراوتی کا شہر تھا جس میں کوسل کی قوم صاحب حکومت تھی۔ مگر ان تمام ریاستوں میں مگدھ کی ریاست صوبۂ بہار میں سب سے بڑی تھی۔

مگدھ راج کا بانی بنارس کا ایک شہزادہ سیسن ناگ تھا جو پہلے گیا کے پہاڑی حصّوں پر حکومت کرتا تھا اسی راجہ کی اولاد سے پانچویں پشت میں راجہ بم بسارا ہوا جس نے بہار میں اپنا دار الریاست قایم کیا اور اس کا لڑکا اجاتستر مگدھ کا راجہ ہوا اس نے دریائے سون کے کنارے پاٹلی کا قلعہ بنایا جو آگے چل کر مگدھ کا مشہور پائے تخت پاٹلی پترا کے نام سے مشہور ہوا۔ اجاتستر کی ماں لچھویوں کے حکمراں خاندان سے تھی۔ یہ خاندان جیسا کہ اوپر آچکا ہے ملک بہار کے ضلع مظفر پور میں گنگا کے کنارے ایک بڑی ریاست رکھتا تھا اور اس کا دار الحکومت ویسالی، پاٹلی پتر سے ۲۷ میل کے فاصلے پر تھا جس کے کھنڈر اب تک صوبہ بہار میں موضع حاجی پور سے ۲۰ میل کے فاصلے پر گنگا کے قریب نظر آتے ہیں۔ اجاتستر کی شادی شمالی اودھ میں کوسالا کے راجہ کی بیٹی سے ہوئی تھی، اس شادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مگدھ نے کوسالا پر غلبہ پاکر اور زیادہ قوت و وسعت حاصل کرلی۔ ویسالی میں لچھویوں کا راج شخصی نہ تھا بلکہ قوم کے شریف آدمی باہمی صلاح و مشورے سے حکومت کرتے تھے۔ راجہ اجاتستر کے بعد اس کا بیٹا درسک اور درسک کے بعد اس کے لڑکے اودھیا نے راج پاٹ سنبھالا، اور گنگا کے کنارے کسم پور آباد کیا جو پاٹلی پترا سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ غرضکہ مگدھ میں جس کی ابتدا سسن ناگ سے ہوئی تھی اس کی اولاد سے آخری دو راجہ بوردھن نندی اور مہانندی ہوئے۔ اور ان کے زمانے سے اس خاندان کا نام نندی ہوگیا جس کے نو بادشاہ مگدھ کے تخت پر بیٹھے یہاں تک کہ راجہ چندر گپت کا زمانہ آگیا۔

راجہ چندر گپت بڑا جلیل القدر بادشاہ گزرا ہے، اسی کے زمانے میں جین مت اور بودھ مت کے حالات اور ان کے باہمی نزاعات پڑھنے میں آتے ہیں۔ مؤلف نے ان دونوں مذہبوں کے معتقدات اس موقع پر بیان کیے ہیں، اور اس عہد کے تمدن و شایستگی کے حالات بھی جس قدر لکھے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان پر اسکندر مقدونی کے حملے کی مختصر کیفیت بھی بہت خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ کس طرح دریائے اٹک اتر کر ٹکسلہ کے شہر سے گزرتا ہوا پنجاب میں داخل ہوا، اور پھر جہلم اتر کر راجہ پورس سے لڑائی میں مصروف ہوا، اور بیاس تک پہنچا تھا کہ وطن کو مراجعت کا حکم دے دیا۔ اس قصّے کو ختم کرنے کے بعد راجہ چندر گپت کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ اس راجہ سے جو سلسلہ بادشاہوں کا چلا وہ خاندان متوریا کے نام سے موسوم ہوا۔ چندر گپت کی سلطنت عروج پر تھی کہ مغربی ایشیا کے مقدونی بادشاہ

سلیوقس نے جس کا دارالحکومت شام میں تھا ہندوستان پر حملہ کیا، مگر راجہ چندر گپت نے اس حملے کا ایسا جواب دیا کہ سلیوقس کو سخت نقصان پہنچا، اور اقلیم اسکندری سے بلوچستان، کابل، ہرات، و قندھار کے علاقے راجہ چندر گپت کے حوالے کرنے پڑے۔
اس ناکامیابی کے بعد سلیوقس نے میگاستھنیز یونانی کو اپنا سفیر بناکر راجہ چندر گپت کے دربار میں بھیجا۔ اس سفیر نے یہاں کے حالات میں اپنی مشہور کتاب "انڈیکا" لکھی۔ اس کے بعد بھی ملوک سلیوقیہ سے پاٹلی پتر میں سفارتیں آتی رہیں۔ ۲۹۸ ق م میں چندر گپت کا دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ اس راجہ کی سلطنت دریائے نربدا سے لے کر شمال میں تمام ہندوستان، اور ہندوستان سے آگے کل افغانستان و بلوچستان تک تھی۔ مؤلف نے ان تمام حالات کو اپنی تالیف میں سلسلہ وار بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔
چندر گپت کی موت پر مگدھ راج کا مالک اس کا بیٹا بندوسار ہوا۔ اس کے زمانے میں مغربی ایشیا کے بادشاہ سلیوقس نے ایک دوسری سفارت بھیجی اور اشوک پسرِ بندوسار کے عہد میں مصر کے بادشاہ بطلیموس فیلادلفیوس نے بھی اپنا سفیر روانہ کیا۔ اس زمانے کے مفصل تاریخی حالات بیان کرنے کے بعد اس راجہ کے ذاتی اوصاف اور اس کے پائے تخت کی رونق اور بادشاہی محلوں اور مکانات کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔
پاٹلی پتر کے ذکر میں یونانی مورخ لکھتے ہیں کہ اس کی شان و شوکت کے سامنے سوسہ اور اصطخر بھی کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اشوک کے ذکر میں باختر، و، پارتھیا یعنی بلخ، و، بخارا، و، خراسان کی یونانی ریاستوں کا اور ان کے بادشاہوں اور سیتھی قوم کے خروج کا بھی ذکر آیا ہے۔ پھر راجہ کنشک کا حال آتا ہے اور یہاں بتایا گیا ہے کہ غیر قوموں کا اثر ہند کے لوگوں پر کس حد تک پڑا۔ راجہ کنشک کے بعد مگدھ راج کو پھر فروغ ہوا۔ اب مگدھ کا شاہی خاندان گپت کے نام سے مشہور ہوا۔ بودھ مت اور جین مت کے نزاعات جاری رہے تا آنکہ برہمن مت سب پر غالب آگیا۔ اسی زمانے میں وسط ایشیا سے تاتاری قوموں کا سیلاب ہندوستان میں آیا۔
گپت خاندان کے آخری بادشاہوں کا ذکر کر کے جس میں بکرماجیت بڑا بادشاہ ہوا۔ شاعر کالی داس اور اس کے کلام کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور

چینی سیاح ہوئنگ چنگ کے سفرنامے کا بھی خلاصہ بیان ہوا ہے اور ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابوں کا حال لکھ کر اور راجگانِ کشمیر و نیپال و قنوج و بندیل کھنڈ وغیرہ کی آزاد ریاستوں کا ذکر کرکے راجپوتوں کے نسب سے بحث کی ہے اور پھر بنگالے کے شاہی گھرانے پال اور سین کے حالات درج کیے ہیں۔

اخیر میں دکن خاص اور باقی جنوبی علاقہ جاتِ ہند کی تمام ریاستوں کے حالات اور ان کے نظم و نسق کے طریقوں اور علوم و فنون کا حال لکھ کر تاریخ ہند کے اس حصے کو ختم کر دیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مؤلف کی محنت و جاں فشانی، حسنِ انتخاب و سلیقۂ تحریر کی خوبیوں میں ذرا شبہہ نہیں رہتا، اور اس کتاب کا لطف اس وجہ سے اور بڑھ جاتا ہے کہ اس میں ایسے ملک کے ابتدائی حالات لکھے گئے ہیں جو صدیوں سے ہمارا وطن ہے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کی عقل بڑھاتا ہے اور جس صورت میں وہ اپنے ہی ملک اور وطن کی تاریخ ہو تو جس قدر حبِ وطن سے دل زیادہ متاثر ہوتا جاتا ہے اسی قدر یہ شوق بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ اپنے ملک کی اصلی کیفیت معلوم ہو اور اس کے ابتدائی حالات سے آگاہ ہو کر اپنی موجودہ حالت پر غور کیا جاوے کہ اگر حالت اچھی ہے تو وہ کونسی چیزیں تھیں جنھوں نے اقوامِ عالم کی میزانِ ترقی میں اس کا پلہ بھاری رکھا، اور اگر حالت خراب ہو تو ان چیزوں سے پرہیز کرے جنھوں نے ترقی سے روکا، یا ترقی کرنے کے بعد تاریکی و تنزل کے حوالے کیا۔ علمائے سابق و حال کو اس بات پر اتفاق ہے کہ ترقی عقل، تہذیبِ نفس، حفظِ ملت اور اصلاحِ قوم کے لیے تاریخ کا مطالعہ بڑی چیز ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے طلبا کو ان فوائد کا سبق ملتا رہے گا۔

محمد عنایت اللہ

۳۰ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخِ ہند جلد اوّل

باب ۱

مقدّمہ (۱)

جنوبی ہند کے ایک تاریخ داں[1] نے، علم وفضل کے زور پر اپنی حُبِ وطن کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:-

ہندی تمدن کے بنیادی عناصر کو شمالی ہندوستان کی قدیم سنسکرت پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا گویا ایک دشوار مسئلے کے حل میں اور الجھن پیدا کر دینا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں اصلی ہند ابھی تک بندھیاچل کے جنوب کی سرزمین، یعنے جزیرہ نمائے ہند کا علاقہ ہے۔ ہند کے قدیم باشندے

---

[1] ۔ پروفیسر سندرام پلے۔

باب

تعدادِ کثیر میں یہیں آباد ہیں، جو آریوں کی آمد سے پہلے کی زبانیں بولتے ہیں اور آریوں سے پہلے کے رسم و رواج رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ بھی آریوں کے رنگ میں اس قدر رنگ چکے ہیں کہ موجودہ تمدن کی بناوٹ میں دیسی تانے سے پر دیسی بانے کو جدا کرنا دشوار ہے تاہم اگر یہ امتیاز کہیں ممکن ہے تو وہ اسی جنوبی ہند میں۔ اور جنوب میں ہم جس قدر زیادہ بڑھیں گے اسی قدر زیادہ یہ امکان قوی ہو جائے گا۔ پس تاریخ ہند کے محقق کو اپنی تاریخی جستجو کرشنا، اور کاویری کی وادیوں میں شروع کرنی چاہیئے۔ نہ کہ گنگا کے میدانوں میں جس کا بہت دن سے دستور پڑ گیا ہے۔"

مگر سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند کے قدیم تاریخی واقعات کا بھی کوئی سراغ ہے جس کی بنا پر ہم دراوڑی زبان اور تمدن کی قدامت کا صحیح اندازہ کر سکیں؟ قدیم تاریخ کے جو بُرے بھلے ماخذ آج تک میسر آئے ہیں، قریب قریب وہ سب شمالی ہند کے حالات سناتے ہیں اور جنوبی ہند کے واقعات کا پتا چلتا بھی ہے تو ضمناً۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح تاریخ صرف اُن واقعات کا نام ہو سکتا ہے جن کے متعلق معتبر تحریر اور ٹھیک ٹھیک سنہ موجود ہوں۔ مذہبی قصص، عام روایات یا نظم و نثر سے اس عہد کے تمدن کی ایک دھندلی تصویر نظر میں پھرنے لگتی ہے مگر کچھ ضرور نہیں کہ یہ تصویر ہر شخص کی متخیلہ میں یکساں ہو۔ پس یہ مجموعہ اہل تاریخ کے نزدیک کتنا ہی دلچسپ اور قابل قدر کیوں نہ ہو، تاریخ نہیں کہلا سکتا بلکہ اس کی بنیاد پر بہتر سے بہتر قیاس بھی اس وقت قابل لحاظ مانا جاتا ہے جب کہ تصدیق کے لیے کوئی اور مستند شہادت موجود ہو۔ دوسرے اگر یہ مان لیا جائے کہ شمال میں پہاڑ اور جنوب کی طرف سمندر پھیلا کر قدرت نے برّاعظم ہندوستان کو دیگر ممالک سے علیحدہ ایک ملک بنا دیا ہے، اور اختلافاتِ عظیم کے باوجود یہاں کے تمام باشندوں میں کچھ نہ کچھ یک رنگی پائی جاتی ہے، تو بھی مورخ کی مشکل رفع نہیں ہوتی، کیونکہ کسی ملک کی تاریخ کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہاں کے افراد یا گروہوں کے پریشان حالات

جمع کر دیے جائیں یا ربط و ترتیب کے بغیر ان کے رسم و رواج کے بیان پر اکتفا کی جائے۔ بے شبہہ یہ چیزیں تاریخ کے لوازمات ہیں اور آج کل ان کے سمجھنے اور سمجھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے بایں ہمہ مورخ کا پہلا فریضہ یہی ہے کہ وہ جہاں کی تاریخ لکھنے بیٹھا ہے وہاں کی حکومت یا ارباب حکومت کے کارنامے ترتیب زمانی کے ساتھ تحریر کر دے اور اسی ضمن میں لوگوں کی معاشرت اور دماغی حالت پر بھی اس طرح بحث کرتا جائے کہ پڑھنے والے کو ان واقعات میں اور جمہور کے اندرونی حالات و افکار میں باہم علت و معلول یا لازم و ملزوم کا تعلق نظر آنے لگے؛ لیکن اس اصول کی رُو سے بھی "تاریخ ہند" میں جنوبی ہند کو کوئی نمایاں جگہ نہیں مل سکتی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک اعتبار سے قدیم ہندوستان کی ایک تاریخ لکھنا ہی بے اصولی بات ہے کیونکہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس تمام ملک پر کوئی واحد حکومت نہ تھی اور کبھی کسی اقبال مند راجہ یا مسلمان بادشاہوں کا اس کے حصۂ اعظم پر سکہ رواں ہوا بھی تو چند روز کے بعد پھر مختلف صوبے خود مختار ہو گئے اور ان میں الگ الگ حکومتیں بن گئیں؛ یہی وجہ ہے کہ دورِ وسطیٰ کی فارسی تاریخیں تمام ہندوستان کی تاریخیں نہیں ہیں بلکہ الگ الگ ریاستوں یا حکمراں خاندانوں کے حالات میں لکھی گئی ہیں؛ چونکہ انگریزی مصنفین کی نظر میں اس مجموعۂ تواریخ کو ایک کتاب میں جمع کرنا جس قدر دشوار تھا اسی قدر ضروری یا دلچسپ نہ تھا، لہٰذا انھوں نے ہندوستان کی عام تاریخ میں ان کا بہت کم اور ضمناً ذکر کیا ہے اور اپنی کتابوں میں صرف ان حکومتوں کے حالات لکھے ہیں جو ہندوستان کے حصۂ اعظم پر مسلط تھیں۔ اور اس قسم کی وسیع سلطنتوں کے مرکز بلا استثنا شمالی ہندوستان میں رہے، پس "تاریخ ہند" درحقیقت شمالی ہند کی تاریخ بن گئی جس کی ہمارے فاضل مدراسی پروفیسر کو شکایت ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے اوّل تو ہند کے

تاریخی حالات ہی کم ملتے ہیں، دوسرے جو کچھ ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس دَور میں ایسی بڑی سلطنت جسے ہم مذکورۂ بالا معیار کے مطابق ہندوستان کی حکومت کہہ سکیں، شاید ہی کبھی قایم ہوئی ہو، ورنہ قدیم ہندوستان کا زیادہ زمانہ ملوکِ طوائف کا زمانہ ہے جس میں دیس دیس کا راجہ دعوائے خود سری رکھتا تھا اور کہیں کہیں جمہوری طرز کی حکومت تھی۔ اس انتشار و علیحدگی کے قدرتی اسباب تھے یعنے اُس عہد میں نہ تو آبادی کی اس قدر کثرت تھی نہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذریعے ایسے تھے کہ ایک مرکزی مقام سے دور دراز کے علاقوں پر فرماں روائی کی جا سکے اور نہ اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ قدیم اہلِ ہند کے تصور میں سارے ہندوستان کا "ایک چھتر کے نیچے" آنا ممکن یا کم سے کم قابلِ آرزو ضرور ہو گیا تھا۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم مِن وعن انگریز مصنفوں کے نقشے کے مطابق اپنی کتاب مرتب کرنی چاہیں تو قدیم تاریخ کا دائرہ تنگ ہو جائے گا، اور اس میں صرف چار پانچ بڑے بڑے مہاراجوں کے حالات ہوں گے جو اپنے اپنے زمانے میں ہندوستان کے حصۂ اعظم کو زیر نگین لا سکے تھے۔ اور چونکہ ان کے عہدِ حکومت ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور بعید ہیں اس لیے یہ حالات باہم غیر مربوط اور بہ اعتبارِ سنین بالکل غیر مسلسل ہوں گے۔ حال میں بعض تاریخ نویسوں نے اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور سچ یہ ہے کہ "تاریخ میں جب تک واقعات کی ترتیب زمانی موجود نہ ہو وہ محض بے جوڑ داستانوں کا مجموعہ رہ جاتی ہے اور اصلی مقصد یعنے کسی قوم کی تدریجی ترقی یا تنزل کے اسباب کا سراغ لگانا، فوت ہو جاتا ہے۔ پس ہم بھی چاہتے ہیں کہ حتّی الامکان ہند کے قدیم حالات کو قیدِ سنین اور ترتیب زمانی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے خواہ اس میں بجائے ایک حکومت کے ہمیں ایسی متعدد ریاستوں کے مختصر حالات لکھنے پڑیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی

سیاسی تعلق نہ تھا، البتہ مسلمانوں کے زمانے میں یہ شرط نبھ سکتی ہے کہ صرف اُن بڑی سلطنتوں کے حالات سے بحث کی جائے جو ہندوستان کے حصۂ اعظم پر پھیلی ہوئی تھیں اور "سلطنت ہند" کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہیں۔

(۲)

لیکن قدیم تاریخ لکھنے میں بڑی اُلجھن اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہندوؤں نے اپنی کوئی تاریخ نہیں چھوڑی اور مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ہندوستان کے تاریخی واقعات کا پتا چل سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ وادیٔ سندھ اور وادیٔ راوی کی کھدائیوں سے جو ۱۹۲۲ء سے شروع ہوئیں تاریخ ہند میں ایک بڑا اضافہ ہوگیا۔ یعنے ان وادیوں میں ہزاروں سال کے دبے ہوئے دو شہر اپنے حیرت انگیز تمدن کے ساتھ باہر نکل آئے۔ ایک شہر "مہنجو دارو" ہے اور دوسرا "ہڑپا"۔ ان شہروں کے انکشاف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آریوں کے آنے سے تین ہزار سال پہلے ہندوستان میں دراوڑی قوم کی عملداری تھی اور اس کے بدولت ایک بڑا تمدن پیدا ہو چکا تھا اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آریوں نے دراوڑی تمدن کی خوشہ چینی کی تھی۔ اس لیے ہندوستان کی تاریخ دراوڑی قوم کی آمد اور اس کی عملداری سے شروع کرنی پڑتی ہے اور اس طریقے سے تاریخ ہند میں تین ہزار سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ان مذکورۂ بالا شہروں کا پورا ماحول اور ان کی تمدنی اشیا کا کافی مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ قبل آریائی زمانے کی پوری حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے، اور جن لوگوں نے ان حقائق کی رہنمائی کی اور اپنے مرقعوں میں طالبان تاریخ کے لیے یہ مواد پیش کیا ہے وہ تاریخ کے بڑے محسن ہیں۔ رائے بہادر دیا رام سہانی اور آر۔ ڈی۔ بنرجی صاحب

باب ۱

اور اس کے بعد سر جان مارشل صاحب جنھوں نے یہ کھدائیاں شروع کیں اور بڑی حد تک تکمیل کو پہنچایا اس انکشاف کے ذمہ دار ہیں اور یہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اور جب سے آریا ہندوستان میں آئے تاریخ قدیم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور اس کو ہندوستان کا تاریخی زمانہ کہا جاتا ہے کیونکہ قبل آریائی زمانے کا جب کہ دراوڑیوں کی عملداری تھی کوئی تحریری مواد نہیں ملتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ گو آریا تمام ہندوستان پر چھا گئے اور بڑی بڑی سلطنتیں قایم کیں لیکن اپنی کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ "راجگان کشمیر" کے حالات میں بے شبہ ایک سنسکرت کتاب (راج ترنگنی) موجود ہے اور اس میں ہندوستان کی قدیم روایات بھی جمع کی گئی ہیں لیکن اول تو وہ بارھویں صدی عیسوی کی تالیف ہے دوسرے کشمیر کے ہمعصر واقعات کے سوا اس میں ہندوستان خاص کے متعلق اکثر بے سروپا باتیں درج کر دی ہیں جن پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال نیپال و آسام کے بعض "وقایع" کا ہے اور سنسکرت، تامل یا پراکرت میں واقعات حاضرہ پر اگر کوئی تحریر ملتی ہے تو وہ ایسی شاعرانہ مثنویاں ہیں جنھیں تاریخ نہیں کہہ سکتے، بایں ہمہ اہل تحقیق کے لیے یہ بھی بہت کام کی چیزیں ہیں اور ان میں سب سے زیادہ قابل قدر نظم "رام چرت" ہے جو حال میں دستیاب ہوئی اور بنگالے کے پال خاندان کے راجاؤں کی مدح میں لکھی گئی تھی۔

تاریخ کے ماخذ (۱)

راجہ ہرش اور بیر بکرماجیت کی مدح میں بھی دو مثنویاں ملی ہیں جن میں سے ایک "ہرش چرت" ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں لکھی گئی تھی اور دوسری غالباً بارھویں صدی کے اوائل میں تصنیف ہوئی۔

سنسکرت کی شہرۂ آفاق رزمیہ مثنویاں، یعنے مہابھارت اور رامائن زمانۂ ماقبل تاریخ کی رسم و رواج اور ہندو تمدن کا نہایت دلکش مرقع دکھائی ہیں لیکن ان کی تصنیف کے وقت یا تاریخی زمانے میں

ہندوستان کی جو حالت تھی، اس پر اِن سے کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی اور اِس لیے مورّخ کے لیے وہ اتنی بھی کارآمد نہیں جتنی ہندوؤں یا بودھ اور جینیوں کی بعض مذہبی کتابیں، جن میں شاہی خاندانوں کے نام اور کہیں کہیں تاریخی واقعات محفوظ رہ گئے ہیں۔

تاریخ کے ماخذ (۲)

اِس ناکافی تحریری شہادت کے علاوہ جو ہندوستان پیش کرتا ہے، قدیم تاریخ کا ایک دیسی ماخذ وہ کتبے اور سکّے ہیں جن میں بعض بادشاہوں کے نام، سنین حکومت یا اور کوئی کام کی بات مل جاتی ہے[۱]۔ اس قسم کے کتبے

---

[۱] قدیم کتبات کے متعلق ونسنٹ اسمتھ نے اپنی تازہ ترین کتاب "آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا" مطبوعہ ۱۹۱۹ء میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بلفظہٖ ترجمہ کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا:-

"تاریخ کے ماخذوں کی فہرست میں سب سے پہلی جگہ کتبات کو دی گئی ہے اور مجموعی طور پر دیکھیے تو معلومات کا اُن سے بہتر و معتبر ذریعہ اور کوئی نہیں مگر افسوس ہے کہ اب تک ایسا کوئی کتبہ دستیاب نہیں ہوا جسے یقین کے ساتھ تیسری صدی ق م سے پہلے کا سمجھا جا سکے حالانکہ مذکورہ صدی سے بہت پہلے کے کتبات ملنے کچھ غیر ممکن نہیں ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو ہمارے پاس موجود ہیں، ان ہی میں بعض عہدِ اشوک سے پہلے کے ہوں۔ قدیم ہندوستان کے یہ کتبات جو بالعموم پتھر یا دھات پر کندہ ملے ہیں، بادشاہوں یا حکّام کی سرکاری تحریریں ہیں اور یا مختلف وجوہ سے لوگوں نے خانگی طور پر انھیں کندہ کرا دیا ہے۔ سنگی کتبے زیادہ تر کسی عمارت کی تعمیر یا کسی بُت کے نصب کیے جانے کی اور یا کسی خاص واقعے کی یادگار میں کندہ کیے گئے ہیں۔ اور اس دوسری قسم کی یادگاروں میں کسی سیاح کے مختصر نام سے لے کر سنسکرت کے طویل قصائد تک، مختلف تحریریں کندہ کی ہوئی ملی ہیں۔ یہ قصیدے جن میں فتح مند بادشاہوں کی فتوحات کا بیان کیا گیا ہے "پرسستی" کہلاتے ہیں۔

دھات کے کتبوں میں زیادہ تر وہ شاہی اسناد ہیں جو عطائے جاگیر کی تصدیق میں تانبے پر کھُدوا دی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض (خاص کر دکن میں) بہت طویل ہیں اور ان سے بالعموم بادشاہِ وقت اور اس کے اجداد کا کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی قدیم تاریخ میں سنین کا تعین جس حد تک ہو سکا ہے، وہ ان ہی کتبات کی بنا پر کیا گیا ہے۔ × × × ×" (مقدمہ کتاب صفحہ ۱۶)۔

باب ۱

جنوبی ہند میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں لیکن وہ اتنے پرانے اور قابل قدر نہیں جتنے شمالی ہند کے کتبات ہیں جن میں سب سے مشہور مہاراجہ اشوک کے وہ فرامین یا پند و نصائح ہیں جنھیں اس نے تیسری صدی قبل مسیح میں چٹانوں اور سنگین مناروں پر کھدوا دیا تھا۔ اِن کتبوں سے اس نامور مہاراجہ کی وسعت سلطنت اور اصول جہانبانی کے متعلق بعض نہایت مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اُس کے عہد کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ وہی ہیں۔

تاریخ کے ماخذ (۳)

ہند کے قدیم آریوں نے آیندہ نسلوں کے لیے جو کچھ اپنی تاریخی یادگار چھوڑی اس کی کل کائنات یہ تھی جس کا بالاجمال اوپر بیان ہوا اور کچھ ہندوستان پر منحصر نہیں بلکہ اس نسل کے دوسرے وطن (ایران) کا بھی یہی حال ہے کہ خود اہل ایران کی لکھی ہوئی کوئی قدیم تاریخ میسر نہیں آتی۔ حالانکہ چھٹی صدی ق م میں ان کی شاہانہ تہذیب اور وسیع سلطنت دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ گو علم و فن کی بعض شاخوں میں قدیم آریوں نے ترقیاں کیں لیکن فنِ تاریخ سے انھیں طبعاً کوئی لگاؤ نہ تھا اور اس ضروری شعبے سے غفلت برتنے کی بدولت دیگر اقوام کے مقابلے میں اُن کی دماغی ترقی مشتبہ ہوگئی ہے۔ باقی ہندوستان کے قدیم یا دراوڑی باشندوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جنھیں آریوں نے مغلوب کر کے اپنا غلام بنا لیا تھا۔

اہل ہند کی اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان کی تاریخ کے لیے سب سے زیادہ اُن بدیسیوں کے دست نگر ہوئے جو کسی پیرائے میں بھی اس ملک کے حالات لکھ گئے ہیں۔ ان میں سب سے پرانا لکھنے والا ہیرو دوٹس یونانی ہے جس نے اپنی تاریخ "محاربات ایران" میں دولتِ ایران اور شمالی ہند کے سیاسی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر کہ ہندوستان کے بعض علاقے ہیرودوٹس کے وقت سے بھی پہلے سلطنتِ ایران میں داخل تھے، "نقشِ رستم" کے اس مشہور کتبے سے ثابت ہے جسے داریوش اوّل یا اسفندار نے پائے تخت اصطخر کے قریب کندہ کرایا تھا۔ (۴۸۶ ق م)

یونانی ماخذ

لیکن یہ بہت مجمل حوالے ہیں اور سچ یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں علم ہے،

باب

سکندر اعظم کے حملے سے پہلے بیرونی دنیا کو ہند کی اصلی حالت سے واقفیت کا بہت ہی کم موقع ملا تھا۔ البتہ اس کی وفات کے بعد جب مصر و شام کے بادشاہوں نے ہندوستانی درباروں میں اپنے سفیر بھیجے تو انھوں نے یہاں کے متعلق بہت کچھ حالات جمع کیے جن کے بعض حصے قدیم یونانی و رومی مصنفین کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان سفیروں میں سب سے زیادہ مگاس تھنیز کا نام مشہور ہے۔ جس کی کتاب "انڈکا" کے بعض اجزا زمانے کی دست برد سے بچ گئے اور ہماری تاریخ کا سب سے قدیم ماخذ ہیں۔ خود سکندر کے ساتھ جو لوگ ہندوستان کے حملے میں شریک تھے گو ان کی تحریریں اب ناپید ہیں، لیکن دوسری تیسری صدی عیسوی تک محفوظ تھیں اور انھی کو سامنے رکھ کر ایک رومی عہدہ دار ایریان نے سکندر کے حملے اور ہندوستان کے حالات پر اپنی لاجواب تاریخ مرتب کی تھی جس میں چوتھی صدی قبل مسیح علیہ السلام تک کا ذکر ہے۔

چینی ماخذ

یونانیوں کے بعد ہم سب سے زیادہ چینیوں کے رہین منت ہیں جن میں **سسوماکیان** کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو یونان میں ہیرودوٹس کو ملا۔ اس مورخ نے اپنی کتاب ۱۰۰ ق م کے قریب مکمل کی تھی اور اس میں کہیں کہیں ہندوستان کا بھی ذکر آگیا ہے اور فرانسیسی مترجمین و محققین کی محنت کے طفیل ہمیں ان مجمل حوالوں سے قدیم تاریخ ہند کے سنین کی صحت میں بہت مدد ملتی ہے۔ لیکن سب سے پہلا پردیسی جس کا سفرنامۂ ہند بجنسہٖ سلامت رہ گیا **فاہیان** چینی ہے جو چوتھی صدی عیسوی کے آخر سال روانہ ہوا، اور ۴۰۵ء سے ۴۱۱ء تک ہندوستان میں رہا کہ بودھ مت کی تعلیم کو خاص اس کے مولد میں حاصل کرے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فاہیان ہند کا پہلا چینی سیاح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی پہلے چین کے لوگ جن میں بودھ مت پھیل گیا تھا اپنے مقدس مقامات کی زیارت کرنے یہاں آیا کرتے تھے۔ اور انھی کی زبانی روایتیں سن کر مورخ سسوماکیان نے اپنی معلومات اخذ کی ہوں گی۔ لیکن ان قدیم زائرین میں کوئی ایسا علم دوست نہ ہوا جو اپنی سیاحت کے حالات لکھ لیتا، اور اگر کسی نے لکھے ہوں تو وہ بالکل بے نشان اور

محو ہو گئے جن کا کسی پرانی چینی کتاب میں حوالہ نہیں ملتا، غرض فاہیان چینی کا نام زندہ رہا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانۂ سیاحت کے حالات قلم بند کیے اور "فو کئو کی" (یعنے بودھ سلطنتوں کے حالات) نامی کتاب اپنی یادگار چھوڑی۔ اس کتاب سے ہندوستان کی تاریخ قدیم میں بڑی مدد ملتی ہے اور انگریزی میں اس کے کئی کئی ترجمے شایع ہوئے ہیں لیکن اس بارے میں فاہیان سے بھی کہیں زیادہ ناموری اس کے ایک اور ہم وطن کو حاصل ہوئی جو دو صدی بعد ممالک ہند کی سیاحت کو آیا، اور ۶۲۹ سے ۶۴۵ء تک ہندوستان کے قریب قریب ہر گوشے میں پھر کر اس نے اپنا لاجواب سفرنامہ تحریر کیا جو "مغربی دنیا کے حالات" کے نام سے یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے، اس فاضل سیاح کے نام کے متعلق حال میں سخت اختلاف تھا اور ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اسے "ہیون چوانگ" کہیں یا "ہوان کوان" یا "ہیوئین چوئنگ" یا ہیون تسان (تسانگ یا سانگ) جس سے وہ اوّل اوّل معروف تھا۔ بہر حال ایک محقق کے فیصلے کے مطابق یہ آخری دونوں تلفظ جایز ہیں اور ہم اپنی کتاب میں اُسے "ہیوئین چوئنگ" ہی لکھیں گے۔

اسلامی تواریخ

ہندوستان کے متعلق سب سے آخر میں جس نامور مصنف نے کتاب (تحقیق الہند) لکھ کر تحقیق کا حق ادا کیا وہ علامہ **البیرونی** ہے، اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے بعض حصوں سے مسلمانوں کو آٹھویں صدی عیسوی ہی میں خاصی واقفیت ہو گئی تھی اور اس زمانے کی اسلامی تاریخیں قدیم ہندوستان کے متعلق بعض کار آمد باتیں بتاتی ہیں لیکن بیرونی نے جس محنت اور سالہا سال کی تحقیقات کے بعد ہندوؤں کی علمی زبان اور علوم حاصل کیے اس کی نظیریں خود اس زمانے میں کم ہوں گی پس اتنی وسیع واقفیت کے بعد جو کتاب اس نے تیار کی (۱۰۳۰ء) وہ آج بھی ہندوستان کے قدیم تمدن اور علوم کی بحث میں مستند مانی جاتی ہے۔

باب ۲

ہندوستان کے قدیم باشندے

پہلی فصل :۔ تاریخ ہند کی ابتدا

اب تک ہندوستان کی تاریخ اس وقت سے شروع کی جاتی تھی جبکہ آریا قوم ہندوستان میں آئی اور دراوڑی قوموں کو مغلوب کرکے اپنی عملداری قایم کرلی۔ کیونکہ تاریخ تمدن کا مرقع ہے اور خیال یہ تھا کہ آریا سب سے پہلی متمدن قوم ہے جو ہندوستان آئی اور اسی نے ہندوستان کو سیاست اور معاشرت کے سبق سکھائے لیکن وادیٔ سندھ کی کھدائیوں سے جو پچھلے پندرہ سال کے دوران میں عمل میں آئیں۔ تاریخ ہند سے متعلق اکثر عقائد ٹوٹ پھوٹ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کھدائیوں سے تاریخ ہند میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ محکمۂ آثار قدیمہ کی کوششوں سے جو ۱۹۲۲ء سے شروع ہوئی تھیں دریائے سندھ کی وادی اور جنوب پنجاب میں ہزاروں سال کے زمین میں دبے ہوئے شہر تمدن کے تمام لوازم کے ساتھ باہر نکل آئے۔ اور ان لوازم تمدن کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں آریاؤں کی آمد سے کئی ہزار سال پہلے کی ہیں اور یہ ان لوگوں کی چھوڑی ہوئی ہیں جو آریا نہ تھے

بلکہ آریاؤں کے پیشرو تھے۔ یہ آریاوں سے تقریباً تین ہزار سال پہلے نہ صرف ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے بلکہ جگہ جگہ حکومت کرتے تھے اور ایک بلند تمدن کے رکھوال تھے اور ایسا اچھا تمدن خود آریاوں میں نہ تھا جب وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے تھے اور قرائن یہ ہیں کہ اس پچھلے تمدن کی خود آریوں نے خوشہ چینی کی تھی۔ ان حالات میں تاریخ کی اس اہم کڑی کو چھوڑ کر آریاؤں کی آمد سے سلسلہ جوڑنا ایک بڑی ناحق شناسی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ہندوستان کے ان اقوام سے ضرور واقف تھے جو آریاؤں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں موجود تھے اور دراوڑی کہے جاتے تھے لیکن ان کو وحشی اقوام سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا تھا کیونکہ اول تو ان میں کسی تمدن کا پتہ چلنا دشوار تھا اور دوسرے آریاوں کی تاریخ کے بیشتر اجزا سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کی آمد سے یہ لوگ یا تو شمال سے جنوب میں دھکیل دیے گئے یا غلام بنالیے گئے اور آریائی معاشرے کی ترتیب میں شدر کے مذموم نام سے موسوم ہوئے۔ لیکن وادی سندھ کی کھدائیوں سے یہ خیال باطل ہوگیا اور اس کی جگہ بہت ساری نئی چیزیں منکشف ہوگئیں۔ ایک تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دراوڑی قومیں وحشی نہ تھیں بلکہ بہت مہذب تھیں اور ان کا درجۂ تہذیب آریوں سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ دوسرے خود دراوڑی بھی ہندوستان کے اصل باشندے نہ تھے بلکہ یہ بھی آریاؤں کی طرح باہر سے آئے تھے اور ہندوستان کے اصل باشندوں کو ہٹا کر اپنا قدم جمایا اور سلطنتیں قایم کی تھیں۔ اب نہ صرف تاریخ ہند کو اس وقت سے شروع کرنا پڑتا ہے جبکہ دراوڑی ہندوستان میں آئے اور اپنے تمدن کا جال پھیلایا بلکہ اس سے بھی پیچھے ہٹ کر ان قوموں کا حال بھی دیکھنا ہے جو ہندوستان کے اصلی فرزند کہے جا سکتے ہیں جو دراوڑیوں کے آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور اب بھی ان کے منتشر اجزا ہندوستان کے تمام طول و عرض میں پائے جاتے ہیں اور اس طریقے سے اب ہندوستان کی تاریخ بہت پھیل جاتی ہے اور اس میں تین ہزار سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

دوسری فصل: ہندوستان کے اصل باشندے۔

ہندوستان کے اصلی باشندوں کا حال دریافت کرنا جو دراوڑیوں کے

آنے سے پہلے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سوائے ان منتشر اجزا کے جو اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں پائے جاتے ہیں ان کے حالات دریافت کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے کیونکہ پرانی سنسکرت کی کتابوں میں ان کے متعلق صرف چند اشارے ملتے ہیں جو کسی طرح کافی نہیں ہیں اس کے علاوہ اس قدر حقارت سے ان کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اصل حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس وقت ان باشندوں کی جو آبادیاں پائی جاتی ہیں ان کو دیکھ کر یہ قیاس قایم کرنا پڑتا ہے کہ یہ ہندوستان کے اصل فرزند ہیں اور دراوڑیوں کے آنے سے پہلے یہ تمام ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے اور جب دراوڑی آئے تو یہ مغلوب ہو گئے اور دور دراز گوشوں میں چھپ گئے۔ یا تو دراوڑیوں نے ان کے ساتھ کوئی بھائی چارا پیدا کرنا گوارا نہیں کیا یا ان قوموں نے ان کے ساتھ میل جول پسند نہیں کیا۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑیوں کے آنے کے بعد ان لوگوں نے ہندوستان کے سرسبز میدانوں اور وادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں سکونت اختیار کر لی اور اس وقت یہیں ان کی منتشر آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ یہ باشندے دراوڑیوں کے آنے سے پہلے شمال وجنوب ہند کے ایک بڑے حصے پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ سیاہ، قد چھوٹا اور ناک چوڑی ہوتی تھی اور انھی چیزوں سے ان میں اور دراوڑیوں میں فرق کیا جا سکتا ہے، اور غالباً یہ قیاس بڑی حد تک مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیلون اور سوماٹرا اور نیز آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے ساتھ ان کا نسلی رشتہ تھا کیونکہ ان کی خصوصیات اور زبان ایک سی ہے۔

معلوم نہیں کہ قدیم زمانے میں ان باشندوں میں کوئی اختلاف تھا لیکن اس وقت شمال وجنوب میں جو ان کی آبادیاں پائی جاتی ہیں ان میں رنگ روپ اور زبان کا اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ مختلف ناموں سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ سنسکرت کے قدیم شاعر ایک ـــــ گروہ کو

"دیلبور" کے نام سے یاد کرتے تھے جس کے معنے ہوتے ہیں تیر انداز۔ دوسرا گروہ "مینور" سے یاد کیا جاتا تھا جس کے معنے مچھروں کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اول الذکر وہی ہوں جو آج کل بھیل کہلاتے ہیں اور آخر الذکر وہ ہوں جو مینا کہلاتے ہیں۔ شعر و سخن میں ایک لفظ "ناگا" بھی پایا جاتا ہے جو عجیب مفہوم میں مستعمل ہوا ہے، یعنے اس سے ایسی قوم مراد لی گئی ہے جو کسی قدر الوہیت کے ساتھ آدھے انسان اور آدھے سانپ ہوتے تھے، لیکن قابل انشا پردازان کو جنگجو قوم لکھتے ہیں جو تیر و کمان کے ساتھ مسلح ہوتے تھے اور لوٹ مار کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر قبائل جن کا قدیم ادب میں ذکر آتا ہے وہ سب تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ناگا تھے جن کے مختلف گروہ مختلف نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشی قبیلوں کی جملہ آبادی شمال و جنوب میں ڈھائی کروڑ کے قریب ہے۔ اور ان کا بڑا حصہ شمالی کوہستانی علاقوں میں آباد ہے اور یہ قبیلے مختلف ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں صوبۂ بنگال کے شمال میں نیپال اور سکم کی سرحد پر نیز دار جلنگ اور چیتا کانگ کے کوہستانی حصوں میں یہ وحشی قبائل رہتے ہیں اور ان کی جملہ آبادی ایک لاکھ بہتر ہزار کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ صوبۂ آسام میں تبت کی سرحد پر ایسے قبیلے رہتے ہیں۔ صوبۂ بہار اور چھوٹا ناگپور میں اور اڑیسہ میں یہ قبیلے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا قبیلہ سنتال کہلاتا ہے جس کی تعداد بہت ہے۔ چھوٹا ناگپور بعض پرگنے ان کے نام سے سنتال پرگنے کہلاتے ہیں۔ اس قبیلے نے حکومت کے خلاف ایک مرتبہ یورش بھی کی تھی ان کا گزارا جنگلی جانوروں پر ہے اور کبھی کبھی یہ زراعت بھی کر لیتے ہیں۔ جنوب میں اڑیسہ کے نیچے گنجام، وزیگاپٹم، اضلاع گوداوری اور ریاست حیدرآباد کے ضلع عادل آباد کی پہاڑیوں میں وحشی قبیلوں کی بہت آبادیاں ہیں جو گونڈ بھیل کہلاتی ہیں اور ان کا رنگ بہت سیاہ ہوتا ہے۔ یہ بھی گاہے ماہے زراعت کر لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ زیادہ جنوب میں اور قبیلے ملتے ہیں نیلگری کی

پہاڑیوں میں ایک قبیلہ ملتا ہے جو ٹوڈا کہلاتا ہے۔ ضلع سلیم مدورا میں دوسرے قبیلے ہیں۔ ضلع کوئمبتور۔ اضلاع ملابار کوچین اور ٹراونکور میں بھی ان کے کئی قبیلے ہیں۔

تیسری فصل:۔ دراوڑی قوم

اگر ہندوستان کے اصل باشندوں کو جن کا اوپر ذکر ہوا، اس وجہ سے نظرانداز کر دیا جائے کہ ان میں کبھی تمدن نہیں پیدا ہوا تو ہندوستان کی تاریخ دراوڑی قوم کے تمدن سے شروع ہوتی ہے۔ پندرہ سال پہلے تک اس قوم کو وحشی سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال تھا کہ اُس وقت دراوڑی قوموں میں جو تمدن پایا جاتا ہے وہ سب آریاؤں کا دیا ہوا ہے۔ لیکن وادیِ سندھ کے انکشافات سے ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی ہندوستان کے اصل باشندے نہ تھے بلکہ یہ کہیں باہر سے آئے تھے دوسرے ان میں بہت بڑا تمدن تھا اور یہ آریاؤں کے آنے سے تقریباً چار ہزار سال پہلے تمام ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ اور جب چار ہزار سال کے بعد آریا ہندوستان میں آئے تو ان کے سامنے دراوڑی مغلوب ہوگئے اور ان کی پیش قدمی سے ایسے پیچھے ہٹے کہ بالآخر شمال چھوڑ دیا اور جنوب ہند میں آباد ہو گئے۔ اس وقت تمام دکن اور جنوب ہند انھی قوموں سے آباد ہے جن میں تلنگانہ کے تلنگی زبان بولنے والے کرناٹک کے کنڑی بولنے والے۔ تاملکم کے تامل بولنے والے اور مہاراشٹر کے مرہٹی بولنے والے اور ملیبار کے ملیالم بولنے والے شامل ہیں۔ لیکن آریاؤں کے آنے سے پہلے یہ تمام شمالی ہند میں بھی آباد تھے کیونکہ ویدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب اور دوآبہ میں آریاؤں سے ان کے معرکے ہوئے تھے جب شمال میں آریاؤں کے سیلاب کے مقابلے میں مغلوب ہوگئے تو دکن میں آباد ہوگئے۔ شمال وجنوب کے درمیان بندھیاچل اور ست پڑا کے سلسلے ایسے حائل ہیں کہ

اول تو آریاؤں نے جنوب کی طرف آنے کی ہمت نہیں کی اور کچھ آئے بھی تو بہت تھوڑے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح شمال کی آریائی آبادی میں دراوڑی عنصر بہت کم پایا جاتا ہے اسی طرح جنوب کی دراوڑی آبادی میں آریائی عنصر بہت ہی کم ہے اور اس طرح دکن اور جنوب ہند کو اصل ہندوستان کہنا چاہیئے اور اسی طریقے سے قبل آریائی تاریخ کا مطالعہ یا تو وادیِ سندھ میں ہو سکتا ہے یا وادیِ کرشنا اور کاویری میں۔ چنانچہ پروفیسر سندر رام پلے کے حسب ذیل الفاظ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتے ہیں:۔

"ہندی تمدن کے بنیادی عناصر کو شمالی ہندوستان کی قدیم سنسکرت پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا گویا ایک دشوار مسئلے کے حل میں اور الجھن پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں "اصل ہند" ابھی تک بندھیاچل کے جنوب کی سرزمین یعنے جزیرہ نمائے ہند کا علاقہ ہے۔ ہند کے قدیم باشندے تعداد کثیر میں یہیں آباد ہیں جو آریاؤں کی آمد سے پہلے کی زبانیں بولتے ہیں اور آریوں سے پہلے کے رسم و رواج رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ بھی آریوں کے رنگ میں اس قدر رنگ چکے ہیں کہ موجودہ تمدن کی بناوٹ میں دیسی تانے سے پردیسی بانے کو جدا کرنا دشوار ہے تاہم اگر یہ امتیاز کہیں ممکن ہے تو وہ اسی جنوب ہند میں۔ اور جنوب میں ہم جس قدر زیادہ بڑھیں گے اسی قدر زیادہ یہ امکان قوی ہو جائے گا۔ پس تاریخ ہند کے محقق کو اپنی تاریخی جستجو کرشنا اور کاویری کی وادیوں میں شروع کرنی چاہیئے نہ کہ گنگا کے میدانوں میں جس کا بہت دن سے دستور پڑ گیا ہے۔"

لیکن یہ سوال بڑا پیچیدہ ہے کہ دراوڑی قوم کب اور کہاں سے ہندوستان میں آئی تھی۔ وقت کا تعین تو بڑا ہی مشکل ہے اور دراوڑی تو کجا ہندوستان قدیم کی پوری تاریخ تعین وقت کی متحمل نہیں ہوتی۔ خود آریوں کی تاریخ بہ قید سنہ نہیں لکھی جا سکتی۔ وادیِ سندھ کی کھدائیوں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں ان کے مطالعے سے اس بات کا دھندلا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دراوڑی کس زمانے میں اپنے عروج پر تھے، گو اس میں کوئی یقین نہیں ہو سکتا

باب۲

ان کی آمد کا پتا لگانا تو ناممکن ہے۔ بات یہ ہے کہ وادی سندھ میں اور وادی راوی میں جو شہر "مہنجو دارو" اور "ہڑپا" کے نام سے زمین سے برآمد ہوئے ہیں اس میں بہت سی چیزیں غور طلب ہیں۔ اول تو اس میں مکانات طبق در طبق نکلے ہیں یعنے چند مکان پہلے بنے اور یہ ایک زمانے کے بعد بوسیدہ ہو گئے تو ان کو چھوڑ کر دوسرے مکان بنائے گئے اور جب یہ بھی زمانے کے حوادث کی وجہ سے بے کار ہو گئے اور زمین میں دھنس گئے تو ان پر دوسرے مکان بنائے گئے۔ اس طرح اس وقت تک پانچ طبق تو دریافت ہو چکے ہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ کچھ طبق زمین کے اندر اور ہوں لیکن ان مکانوں کے پانچ طبقوں سے اس شہر کی آبادکاری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یعنے اگر ہر طبقۂ مکان کے لیے دو پشت قرار دیے جائیں تو یہ جملہ پانچ سو سال کی مدت ہوتی ہے جس میں یہ شہر کی آبادکاری اور ترقی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا نہیں چاہیے کہ صرف اسی دوران میں وادی سندھ کے تمام تمدن کا عروج و زوال ہوا۔ کیونکہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ تمدن اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس نقطۂ عروج پر پہنچنے کے لیے اس کو سالہا سال کی کئی ارتقائی منزلوں سے ہو کر گزرنا پڑا ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ شہر "مہنجو دارو" کے زوال کے بعد کئی پشتوں تک یہ تمدن پھولتا پھلتا رہا ہو، اور اس کے زوال کے بعد چند شہر اور پیدا ہوئے ہوں جن کا اب تک پتا نہیں چل سکا۔ لیکن اب یہ سوال کہ وادیِ سندھ کا تمدن کس زمانے میں عروج پر تھا اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کا مقابلہ چند اور تمدنوں سے کیا جائے جو اس کے ہمعصر یا اس کے قریب تر زمانے کے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ عراق اور اِلام کی کھدائیوں میں جہاں اور چیزیں برآمد ہوئی ہیں وہاں پانچ مہریں بھی نکلی ہیں جو اپنی ساخت اور کندن میں وادیِ سندھ کی مہروں کی طرح ہیں۔ اور یہ مہریں عراق کے مشہور مقامات اُر اور کش سے دریافت ہوئی ہیں۔ ان مہروں سے دو باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہیں۔ ایک یہ بات کہ

؎۔ مارشل جلد اول صفحہ ۱۰۳۔

وادیِ سندھ اور عراق وغیرہ میں واسطہ تھا اور تجارتی تعلقات تھے دوسرے یہ دونوں تمدن بڑی حد تک ہمعصر تھے۔ نیز مہروں کی ساخت اور کندن کی چھان بین کر کے اس بات کا پتا لگایا گیا ہے کہ یہ الف ثالث ق م کی ہونی چاہئیں اور اس سے یہ بہ آسانی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وادی سندھ کا تمدن اس زمانے میں پھولتا پھلتا تھا جو یقیناً ۲۸۰۰ ق م سے پہلے ہونا چاہیئے[1]۔ اور جب یہ تمدن الف ثالث ق م میں عروج پر پہنچ چکا تھا تو ظاہر ہے کہ اس سے کئی صدی پہلے اس کی افتاد پڑ چکی تھی۔ اور ممکن ہے کہ دراوڑی قوم جس نے یہ تمدن پیدا کیا تھا اس سے ایک ہزار سال پہلے ہندوستان میں آئی ہو۔ کیونکہ صرف شہر "مہنجو دارو" کی بعض اشیا (۳۲۵۰) ق م یعنے الف رابع تک پہنچ جاتی ہیں[2] اور ان چیزوں کو ترقی پا کر اس منزل تک پہنچنے کے لیے کئی سو سال کی ضرورت ہے۔

لیکن اب یہ سوال بحث طلب ہے کہ دراوڑی کون لوگ تھے، اور یہ کہاں سے آئے تھے، اس کا حل بھی آسان نہیں ہے اس مسئلے کے حل کے لیے نسل انسانی کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ بدن کی ساخت کے اعتبار سے دراوڑی دنیا کی کس قوم یا قومیت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اس مسئلے کی چھان بین کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ موجودہ دراوڑی قوموں کی نسلی چھان بین سے جو تمام جنوب ہند میں آباد ہیں اس بات کا فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ دراوڑیوں کو دیکھ کر ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ پانچ ہزار سال پہلے کے دراوڑی بھی ایسے ہی تھے۔ موجودہ دراوڑی نسلوں کا حلیہ تو یہ ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہوتا ہے، رنگ سیاہی مائل، بال گھنے اور کہیں گھونگر والے ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں سیاہ، سر لمبا، اور ناک چوڑی ہوتی ہے اور کبھی جڑ کے پاس دبی ہوئی ہوتی ہے تاہم اس سے چہرہ چپٹا نہیں معلوم ہوتا، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قدیم دراوڑیوں کا حلیہ بھی یہی ہوگا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں

[1] - مارشل جلد اول صفحہ ۱۰۳-۱۰۴-

[2] - " " " ۱۰۶-

باب ۲

وقتاً فوقتاً ایسا نسلی اختلاط ہوا کہ اس سے بدن کی ساخت میں بہت فرق پڑ گیا۔ چنانچہ بلوچستان میں "بروہی" نامی جو قبیلہ آباد ہے وہ اپنی زبان کے اعتبار سے تو صاف دراوڑی معلوم ہوتا ہے لیکن بدن کی ساخت میں دراوڑی نہیں معلوم ہوتا بلکہ وسط ایشیائی قومی درآمد سے بہت کچھ ایرانی قالب میں ڈھل گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جنوب ہند کے دراوڑیوں کا بھی یہی حال ہوا ہو۔

"مہنجو دارڈ" اور "ہرپا" کی کھدائیوں میں مردوں کے ڈھانچے بھی نکلے ہیں جو اس موضوع کی تحقیق میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان دونوں شہروں میں جو ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں ان کی کھوپریوں اور ہڈیوں کی چھان بین کرنے سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان میں کئی قسم کی کھوپریاں دکھائی دیتی ہیں جو مختلف قومیتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ کم از کم چار نسلیں تو معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہ قیاس ہوتا ہے کہ ایک نسل تو مقامی ہوگی اور باقی باہر کی درآمد ہوگی کیونکہ ان شہروں میں باہر کے تاجر اور مسافر بھی آیا کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اس وقت سندھ اور پنجاب کی آبادی میں مختلف عناصر موجود ہیں۔ لیکن ان چار نسلوں میں مقامی آبادی کونسی تھی ابتک تحقیق طلب ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے دراوڑی اور سمیری ایک ہیں اور ان کا اصل وطن عراق کے مشرق میں تھا۔ یعنی جب یہ پھیلے تو ایک شاخ ان کی سمیر میں آباد ہوگئی اور دوسری ہندوستان آگئی۔ اور یہ قیاس اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان دونوں تمدنوں میں بڑی یکسانی پائی جاتی ہے۔ تمدنی اشیا دونوں جگہ یکساں پائے گئے۔ چنانچہ اس بنیاد پر یہ نظریہ اب ہر جگہ مسلم سمجھا جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے زیادہ چھان بین کی ہے وہ اس نظریے سے بھی اتفاق نہیں کرتے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دراوڑیوں اور سمیریوں کی بدنی ساخت ملتی جلتی نہیں ہے۔ دراوڑیوں کی اصلی بدنی ساخت کا تو اب تک پتا نہیں چلا اور سمیریوں کی جو ساخت بتائی جاتی ہے

باب ۲

وہ کچھ ایسی ہے جیسے اہل یورپ کی اور جب یہ صورت حال ہو تو ہندوستان کے دراوڑیوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سمیریوں کی ایک شاخ تھی کچھ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ غالباً دراوڑی بحر متوسط والی قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ کش نال یعنے عراق اور مہنجوداڑو میں جو ڈھانچے نکلے ہیں ان میں سے اکثر بحر متوسط والی قومی خصوصیت پائی جاتی ہے۔[1]

اگرچہ دراوڑیوں کا جنم بھوم اب تک چھپا ہوا ہے اور اس کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے لیکن یہ تو یقینی ہے کہ یہ قوم مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئی تھی اور حملہ آور اور فاتح کی حیثیت میں آئی تھی۔ اس کی آمد کا پتا "بروہی" قبیلے سے ہوتا ہے جو بلوچستان میں آباد ہے۔ اگرچہ اس قبیلے کی نسلی خصوصیات بہت کچھ خلط ملط ہوگئیں اور اب وہ ایرانی قالب میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی اصلی زبان اب تک باقی ہے۔ یہ اب تک دراوڑی زبان بولتے ہیں۔ اس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ دراوڑی قوم مغرب سے ہندوستان میں آئی تھی اور اگرچہ اب دراوڑی سب جنوب ہند میں سکڑے ہوئے ہیں لیکن قرائن یہ ہیں کہ جب یہ ہندوستان میں آئے تھے تو شمال کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے تھے۔ نسلی اور لسانی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تمام جزیرہ نمائے ہند میں پھیلے ہوئے تھے جس میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ کیونکہ تمام جزیرہ نما کی زبان اور نسلیں ان سے متاثر ہیں۔ ان کے آنے سے ہندوستان کے اصل باشندے جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گئے جہاں وہ آباد ہیں لیکن ان میں اختلاط ضرور ہوا تھا کیونکہ بعض اصل آبادیاں ایسی ہیں مثلاً منڈا زبان بولنے والی آبادیاں وہ اپنے رنگ روپ اور حلیے میں دراوڑی معلوم ہوتی ہیں اور نسلی تحقیق کرنے والوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ آیا یہ دراوڑی ہیں، یا ہندوستان کے اصل باشندے۔

[1] ۔ مارشل جلد اول صفحہ ۱۱۰۔

باب ۱

چوتھی فصل:۔ وادئی سندھ کا تمدن

اگرچہ دراوڑی قومیں تمام جزیرہ نمائے ہند میں پھیل گئی تھیں اور جگہ جگہ ان کی آبادیاں اور عملداریاں تھیں لیکن ان کا تمدن زیادہ تر بڑے دریاؤں کے کنارے پیدا ہوا تھا اور یہ چیز کوئی خلاف قیاس نہیں ہے کیونکہ ہر آبادی پہلے پانی کی سہولت دیکھتی ہے اور جس قدر پانی زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اُس کو زراعت اور دوسری اغراض میں مدد ملتی ہے یعنی بڑے دریاؤں سے نقل وحمل۔ آب پاشی اور تجارت میں غیر معمولی مدد ملتی ہے اور یہ چیزیں تمدن کی بڑی معاون ہیں۔ اسی وجہ سے مصر کا قدیم تمدن دریائے نیل کے کنارے اور عراق کے تمدن دریائے فرات اور دجلے کی وادیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طریقے سے دراوڑی قوم کے عظیم الشان تمدن بھی دریائے سندھ اور پنجاب کے دریاؤں کے کنارے پیدا ہوئے اور بڑھے تھے چنانچہ جن شہروں کا اب پتا چلا ہے ان میں سے ایک "مہنجو دارو" ہے جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہوا تھا اور دوسرا "ہڑپا" ہے جو پنجاب کے مشہور دریا راوی کی وادی میں آباد تھا۔ اول الذکر کا موقع محل تو اس قدر اچھا ہے کہ دراوڑی تمدن کے علمبرداروں کو اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی تھی کیونکہ اس کے کھنڈر لڑکھانا کے میدانوں میں برآمد ہوئے ہیں جو دریائے سندھ اور کوہستان کے درمیان واقع ہیں۔ دریائے سندھ کی آبیاری سے یہ خطہ بڑا زرخیز بنا ہوا تھا۔ قرون وسطیٰ میں ایک اور دریا مہران نامی دریائے سندھ کے متوازی بہتا تھا اور اس میں اس کی زرخیزی بڑھی ہوئی تھی اور اس زمانے میں مختلف شہروں کی وجہ سے اس کی قوت پیداوار روزافزوں ہے اور اسی وجہ سے لاڑکھانا کو نخلستان سندھ کہتے ہیں اور اسی طرح راوی کی وادی بھی شہریت پیدا کرنے میں بڑی معاون تھی۔ پنجاب کا مرکزی شہر

لاہور بھی اسی کی وادی میں آباد ہے۔ اگرچہ اس وقت ہڑپا دریائے راوی سے دور ہٹ گیا ہے لیکن اس کا پرانا راستہ اس شہر کے قریب پڑتا تھا۔ غالباً اس ندی کی سہولتوں کی وجہ سے یہ شہر بہت پُر رونق اور آباد تھا۔ رگ وید میں وادی راوی کے متعلق بہت اشارے ملتے ہیں۔ ایک جگہ تو ایک ایسی لڑائی کا ذکر ہے جو ہریوپا کے مقام پر ہوئی تھی غالباً وہ یہی ہڑپا ہو۔ یونانی مورخ کہتے ہیں کہ سکندر اس جگہ سے گزرا تھا اور یہاں کے رہنے والوں نے اس کا سخت مقابلہ کیا تھا اور جب صلح ہو گئی تو یہاں سے اس کو جو خراج ملا تھا اس سے اس جگہ کی دولتمندی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اگرچہ مہنجو دارو اور ہڑپا کے تاریخی مقامات بہت دنوں سے معلوم تھے کیونکہ مہنجو دارو سے کئی سال پہلے کشان خاندان کے سکے برآمد ہوئے تھے جو دوسری صدی عیسوی کے ہیں۔ اور ہڑپا سے پچاس سال پہلے چند مہریں دریافت ہوئی تھیں جن پر جانوروں کی شکلیں اور حروف تھے، لیکن یہ بات کسی کے حاشیۂ خیال میں نہ تھی کہ ان دونوں جگہ بڑے بڑے تمدن دبے پڑے ہیں اور ان کے انکشاف سے ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً چار ہزار سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ ۱۹۲۱ء سے ان شہروں کی کھدائی شروع ہوئی اور جو لوگ اس انکشافات کے ذمہ دار ہیں وہ تاریخ کے بڑے محسن ہیں۔ ان کھدائیوں سے سیکڑوں چیزیں برآمد ہوئیں جو قدیم دراوڑی معاشرت اور اور تمدن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے تمدن کو آنکھوں کے سامنے لاتی ہیں۔ اس انکشاف تک مصر، عراق اور اشوریا کے تمدنوں کو قدیم تر سمجھا جاتا تھا لیکن ان کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھی اپنے تمدن میں ان ممالک سے پیچھے نہ تھا بلکہ اسی زمانے میں یہ ملک بھی ترقی کر رہا تھا۔ اور یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ مہنجو دارو اور ہڑپا دونوں شہروں میں بڑی یکسانی ہے۔ ایک شہر کی چیزیں بالکل اسی طرح معلوم ہوتی ہیں جیسے دوسرے شہر کی چیزیں۔ مکان، برتن اور مہریں سب ایک ہی طرح کی ہیں۔ ان چیزوں کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شہر ایک ہی زمانے میں

باب ۲

بر سر ترقی تھے۔ اور اگرچہ ان دونوں میں چار سو میل کا فاصلہ ہے۔ تاہم ان دونوں شہروں کے باشندوں کی باہمی آمد و رفت اور میل جول خلاف قیاس نہیں ہے۔ نیز یہ بات بھی بہت معنے خیز ہے کہ یہ دونوں شہر ایک سے زیادہ مرتبہ بنے ہیں کیونکہ جس قدر گہری کھدائی ہوئی گئی طبقے نکلے۔ ایک طبقے کے بعد دوسرا طبقہ نظر آیا۔ مہنجو داڑو میں تو اس قسم کے سات طبقے نکلے ہیں۔ اور ایک طبقہ اور دوسرے طبقے میں تمدنی اعتبار سے کچھ فرق بھی محسوس ہوتا ہے۔ کم از کم مکانوں کی ساخت مختلف معلوم ہوتی ہے اور اس فرق سے تمدن کی ارتقائی منزلیں ظاہر ہوتی ہیں جو مختلف زمانوں میں ہوئی ہیں۔

اب ہم ان چیزوں کو ذرا تفصیل سے دیکھیں گے جو ان شہروں سے برآمد ہوئی ہیں تاکہ اس زمانے کے تمدن کا اندازہ ہو سکے۔ ان میں بہترین چیزیں یہ ہیں۔ ان میں عمارتیں ہیں۔ ہتھیار ہیں۔ گھریلو آلات اور اوزار کاتنے اور کپڑے بننے کے آلات۔ کھانے اور پہننے کے سامان اور مٹی کے برتن ہیں۔ کھلونے اور زیور ہیں۔ فلزات اور قیمتی پتھر ہیں۔ سدھے ہوئے جانوروں کے ڈھانچے اور نمونے ہیں۔ اور سب سے اہم تر چیز برتن ہیں جن پر کندن اور حروف کندہ ہیں وضاحت کے لیے ان چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہیئے۔

شہر اور اس کی ضروریات

کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مہنجو داڑو اور ہڑپا کے شہر طبق در طبق کئی مرتبہ بنے اور آباد ہوئے ہیں۔ ان کی لمبائی اور چوڑائی بھی کافی تھی۔ بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر کے اردگرد فصیل بھی ہوتی تھی اور شہر کی حفاظت کے لیے قلعہ کا سا کوئی استحکام بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ آلات حرب بھی پائے جاتے ہیں جن میں تبر۔ نیزے۔ خنجر۔ گرز اور تیر و کمان ہیں یہ سب حملے کے ہتھیار ہیں۔ سپر اور خود کا سا مدافعتی سامان نہیں ملتا۔ شہر کے چاروں طرف پتھر کی بنی ہوئی سڑکیں ہیں۔ بعض سڑکیں بہت سیدھی معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک سڑک جو بڑے حمام کے برابر سے جاتی ہے بہت سیدھی ہے۔ پیہے دار سواریاں بھی نکلی ہیں جو آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ان کی شکل زمانۂ حال کے ایکوں کی سی ہے جن پر دھوپ کے بچاو کے لیے چھت

باب ۲

ہوتی ہے۔ شہر کا پانی بہنے کے لیے پختہ اینٹ اور پتھر کی پختہ موریاں اور بدر رو بھی بنائے گئے تھے جو اوپر سے ڈھکے ہوتے تھے اور انتظام یہ تھا کہ خانگی مکانوں کا مستعملہ پانی اس کے ذریعے باہر نکل جائے۔ موریوں اور بدر رو کا یہ انتظام اس زمانے کا لحاظ کرتے بہت حیرت انگیز ہے۔ اس کے علاوہ عوام کی ضرورت کے لیے حمام بھی بنائے گئے تھے۔ نیز ہنجو دارد کے بیچ میں ایک بہت بڑا حمام دریافت ہوا ہے جو بجائے خود ایک مطالعے کی چیز ہے۔ یہ پختہ پتھر کا بنایا ہوا ہے جس کے بیچ میں ۳۹ فیٹ لمبا اور ۲۳ فیٹ چوڑا اور آٹھ فیٹ گہرا حوض ہے اور اندر اترنے کے لیے دونوں طرف زینے ہیں اور اس کے چاروں طرف کمرے اور برآمدے ہیں جہاں نہانے والے بیٹھتے تھے۔ ایک بڑی موری کے ذریعے سے پانی خارج کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ حمام اوپر سے بند تھا اس لیے نہانے والوں کے لیے گرم اور صحت بخش تھا۔ اس قسم کے اور حمام بھی پائے گئے جو چھوٹے ہیں اور ان سے دراوڑی تمدن کی رفعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز شہری ضرورت کے لیے بڑے ہال بھی بنائے گئے تھے۔ ان بڑی عمارتوں کی وسعت اور ان کے ستونوں سے یہ قیاس قایم کیا جاتا ہے کہ یہ شہریوں کے اجتماع کے لیے استعمال کیے جاتے ہوں گے جیسے آج کل ٹاؤن ہال ہوتے ہیں ورنہ یہ خانگی مکان تو نہیں ہو سکتے۔

عمارتیں

عمارتیں کئی قسم کی پائی جاتی ہیں۔ کچھ تو رہنے کے مکان ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اپنی ساخت اور ترتیب کا لحاظ کرتے شہری عمارتیں معلوم ہوتی ہیں۔ سکونتی مکان چھوٹے بڑے دونوں طرح کے ہیں۔ سب سے چھوٹا مکان ایسا بھی ہے جس میں صرف دو کمرے ہیں اور بڑے مکانوں میں اس قدر گنجایش ہے کہ بعض تو محل معلوم ہوتے ہیں۔ مکان کی عام ترتیب یہ ہے کہ اس کا صدر دروازہ سڑک پر کھلتا ہے۔ بعض مکانوں کے ایک سے زیادہ دروازے ہیں۔ دروازے سے صحن میں داخلہ ہوتا ہے اور کمرے صحن کے ارد گرد پائے جاتے ہیں اور روشنی کے لیے کمروں میں دریچے بنائے جاتے جو یا تو براہ راست صحن میں کھلتے تھے یا دوسرے کمروں میں

اور صحن میں اینٹ کا فرش ہوتا تھا۔ اور ہر گھر میں حمام ہے جو موری کے ذریعے سے بڑی بدررو سے ملا ہے اور پانی بہنے کا پورا انتظام ہے اور اس میں حفظان صحت کا لحاظ معلوم ہوتا ہے۔ مکانوں میں ایک سے زیادہ منزلیں ہوتی ہیں اور یہ منزلیں زینوں کے ذریعے وابستہ ہیں۔ دیواریں چار پانچ فیٹ موٹی ہوتی ہیں۔ تعمیر میں کمانیں کہیں نہیں ہیں حالانکہ بابل اور مصر کی عمارتوں میں کمانیں پائی جاتی ہیں۔ اکثر عمارتیں اینٹ کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ اینٹیں آگ کی جلی ہوئی ہیں اور بعض جگہ دھوپ سے بھی خشک کی ہوئی ہیں۔ دروازے اور دریچے لکڑی کے ہوتے تھے۔ چونکہ کمان نہیں ہوتی تھی اس لیے لکڑی کے دانسے دے کر دروازوں کو نصب کیا جاتا تھا۔ ویسے عام تعمیری کام اس قدر عمدہ اور پختہ تھے کہ بعض حصے صدیوں کے بعد بھی خراب نہیں ہوئے۔ چنانچہ بڑا حمام آج پانچ ہزار سال کے بعد بھی اچھی حالت میں ہے۔

خانگی زندگی اور اس کے لوازم

جو چیزیں اوپر بیان کی گئیں ان سے شہر اور شہری زندگی معلوم ہوتی ہے لیکن ان کے علاوہ صدہا چیزیں ایسی دریافت ہوئی ہیں جن سے ان شہروں کے رہنے والوں کی گھریلو زندگی کا اچھا خاصا پتا چلتا ہے۔ مکانوں کا حال تو ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ لیکن ان کی بود و باش، وضع قطع اور مشاغل بھی دیکھنا چاہئیں ان کے کھانے میں مختلف جانوروں کا گوشت شامل تھا کیونکہ گھروں کے اردگرد جانوروں کی ہڈیاں اور مچھلی کے فلس پائے گئے۔ لیکن مہنجوداڑو کے کھنڈروں میں گیہوں اور جو کے ذخیرے بھی برآمد ہوئے ہیں اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیہوں ان مصری گیہوں کے مماثل ہیں جو مصر کے قبل تاریخی قبور میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان ذخیروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی غذا میں گیہوں اور جو کا سا غلہ بھی شامل تھا، اور دوسرے یہ کہ یہ لوگ زراعت بھی کرتے تھے۔ اگرچہ اب تک ہل وغیرہ کے سے آلات زراعت کا پتا نہیں چلا جن سے یہ چیز محقق ہو جائے کہ یہ لوگ واقع میں زراعت کرتے تھے، لیکن دریائے سندھ کی وادی میں اس تمدن کا ترقی کرنا زراعت کی بڑی دلیل ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس زمانے میں ہل بھی ایجاد ہو گیا ہوگا گو اب تک وہ کہیں دستیاب نہیں ہوا۔ ظروف بالعموم مٹی کے

ہوتے تھے۔ یہ ظروف سیکڑوں قسم کے چھوٹے بڑے دریافت ہوئے ہیں جو کھانے اور پینے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ رنگین اور منقش ظروف بھی ملے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظروف پہیے پر بنائے جاتے تھے۔ مختلف قسم کے کھلونے بھی ملے ہیں جو مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ بچوں کی دل بہلائی کا سامان تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کھلونوں میں سواری کی شکلیں بھی پائی گئی ہیں، بڑے آدمیوں کا کھیل نَردوں سے ہوتا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی بہتری نَردیں ملتی ہیں اور یہ زمانۂ حال کی نَردوں کی طرح مستطیل نہیں ہیں بلکہ یورپی نردوں کی طرح مکعب ہیں پالتو جانوروں میں بیل۔ بکری۔ بھینس۔ اونٹ۔ ہاتھی اور کتے ہوتے تھے۔ ان سب کے ڈھانچے جگہ جگہ دستیاب ہوتے ہیں اور کھلونوں کے طور پر مٹی میں ان کی شکلیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ گھوڑوں کے ڈھانچے بھی ملے ہیں۔

وضع قطع

مجسموں اور مختلف تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ لباس کس طرح پہنتے تھے۔ مجسمے مردوں کے ہیں اور ان پر شال اُڑھائی گئی ہے اور اس طرح کہ وہ بائیں کندھے کے اوپر اور دائیں کے اندر ہے تاکہ دہنا ہاتھ بالکل آزاد رہے اور کپڑا حارج نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ یہی طریقہ اب بھی غربا اور خوش حال لوگوں میں جاری ہے۔ کپڑے سوت اور اون دونوں کے استعمال ہوتے تھے اور یہیں بُنے جاتے تھے کیونکہ سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کے بے شمار آلات مثلاً چرخے اور تکلے دستیاب ہوئے ہیں اور ایک جگہ سے بُنا ہوا کچھ کپڑا، اور سُوت بھی دستیاب ہوا ہے اور اس کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کی روئی بالکل وہی ہے جو اس زمانے میں ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت غلّے کے ساتھ روئی بھی بُوئی جاتی تھی۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سنسکرت میں روئی کو سندھو کہتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روئی کی کاشت سب سے پہلے سندھ ہی میں ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ بابلی زبان میں بھی روئی کو سندھو کہتے ہیں اور یونانی زبان میں سنڈون۔ اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ممالک میں بھی سندھ سے ہی روئی کی برآمد ہوتی ہوگی۔ اس کے علاوہ تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد، ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے اور اوپر کے

ہونٹ پر بال تراش دیے جاتے تھے اور سر کے بال پیچھے کر دیے جاتے تھے یا تو کاٹ دیے جاتے تھے یا ان کا چٹا بنا دیا جاتا تھا اور عورتوں کے بال پیچھے سے کھلے ہوتے تھے۔ زیور بھی بہت استعمال ہوتا تھا۔ ہار۔ بازو بند۔ انگوٹھی اور کڑے مرد و عورت دونوں استعمال کرتے تھے۔ البتہ کمر پٹے۔ بالیاں اور پازیب صرف عورتیں استعمال کرتی تھیں اور یہ زیور مختلف قسم کے پائے جاتے ہیں جو سونے، چاندی۔ ہاتھی دانت۔ تانبے اور چمکدار پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔ شیشے کی بنی ہوئی چوڑیاں نہیں ملیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شیشہ کہیں استعمال نہیں ہوا حالانکہ عراق اور مصر میں الف ثالث میں شیشہ استعمال ہو چکا ہے۔ قیمتی پتھر بھی دستیاب ہوئے ہیں جو غالباً باہر سے یعنی کشمیر۔ ترکستان۔ تبت وغیرہ سے لائے جاتے تھے۔

مذہب

ہنجوداڑو اور ہڑپا کے انکشافات میں ایسا مواد دستیاب نہیں ہوا جو یہاں کے رہنے والوں کے مذہب کی نشان دہی کرے۔ اگر ان کھدائیوں میں مندر اور بت اور دوسری قسم کی عبادت گاہیں وغیرہ دریافت ہو جاتیں تو دراوڑی قوم کا مذہب بھی روشنی میں آجاتا۔ لیکن اس قسم کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوئی۔ بڑی عمارتیں تو ہیں لیکن ان کے متعلق یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کوئی مندر یا عبادت گاہیں ہیں۔ ان میں کوئی بت یا تصویر نہیں پائی جاتی ان حالات میں دوسرے ذرایع سے قیاس قایم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس مبہم مواد میں جو کسی قدر مذہب کی نشان دہی کرتا ہے۔ عورتوں کی تصویریں اور مجسمے ہیں۔ اور یہ مختلف ہیئت کذائی میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن عورت کی گود میں بچہ ہے اور کہیں اس کے ہاتھ میں روٹیوں کا تھال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ماتا دیوی کا تخیل ہو یعنی ماں کو ایک دیوی کی شکل میں پیش کیا گیا ہو۔ یہ تخیل ہندوستان میں ہمیشہ رہا ہے اور اب بھی موجود ہے اس لیے اس زمانے کے متعلق بھی یہ قیاس قایم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مہر سے مرد دیوتا کا تخیل بھی پایا جاتا ہے۔ ہنجوداڑو سے ایک ایسی مہر حاصل ہوئی ہے جس میں دیوتا یوگی کی شکل میں پیر جوڑے ہوئے تخت پر بیٹھا ہے اور ایک سر میں تین صورتیں ہیں اور دیوتا کے ارد گرد ہاتھی۔ شیر اور بھینس جیسے

باب ۲

جانوروں کی تصویریں ہیں اور تخت کے نیچے ایک ہرن ہے جو دیوتا کو تک رہا ہے۔ اس سے شیو کا رنگ پایا جاتا ہے اور شیو کا تخیل غالباً بہت پرانا ہو، اور وادیٔ سندھ سے ورثے میں ملا ہو۔ ایک اور مہر سے درخت پرستی بھی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اس میں ایک پیپل کا درخت اور اس کے اردگرد چند جانوروں اور انسانوں کی شکلیں جو اس کے پوجنے والے ہیں۔ پیپل کا درخت ہندوستان میں ہمیشہ مقدس رہا ہے اور غالباً یہ تقدس اسی زمانے سے حاصل ہوا ہو، ان کے علاوہ دوسری اور مہروں سے جانور پرستی بھی معلوم ہوتی ہے۔ بعض مہروں پر فرضی اور خیالی جانور ہیں اور بعضوں پر اصلی جانور ہیں۔ اس کے علاوہ سر جان مارشل کا خیال یہ ہے کہ دراوڑی قومیں پانی کو بھی مقدس سمجھتی ہیں کیونکہ ان قدیم شہروں میں اشنان کا غیر معمولی انتظام پایا جاتا ہے۔ نہ صرف ہر گھر میں حمام موجود ہے بلکہ عوام کے لیے عام حمام بھی موجود ہیں جو اپنے تمام انتظام کے ساتھ بہت حیرت انگیز ہیں۔[۲] ان تمام چیزوں کو یکجا کر کے ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ دراوڑی مذہب اپنے زمانے تک محدود نہیں رہا بلکہ بعد کے زمانوں پر بھی اپنا اثر ڈالتا رہا چنانچہ اس وقت بھی اس کی باقیات موجود ہیں۔ ماتا دیوی کا تخیل درخت اور جانوروں کا تقدس اور پانی اور اشنان کی اہمیت اب بھی موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ ان انکشافات سے دراوڑی تمدن کی بڑی حقیقتیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمدن کس درجے پر تھا۔ اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ یہ تمدن صرف ان دو شہروں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ان شہروں سے بہت دور دور تک بھی تمدن کے آثار پائے گئے یعنی سندھ کے مختلف مقامات میں منقش ظروف۔ چوڑیاں اور تانبے کے اوزار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان چیزوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تمام سندھ اس تمدن سے متاثر تھا۔ ادھر مشرق میں دریائے ستلج کی وادیوں میں کھدائیاں کی گئیں تو ان سے اینٹ اور مٹی کے ایسے ظروف حاصل ہوئے جو ہڑپا سے برآمد ہوئے تھے اور دریائے سندھ کے مغرب میں بنّو تک اس کے آثار پائے جاتے ہیں اور

۱ؔ۔ مارشل جلد اول صفحہ ۷۵۔
۲ؔ۔ مارشل جلد اول صفحہ ۹۲-۹۳۔

باب

اس طریقے سے اس تمدن کا وسیع پھیلاؤ معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کے ساتھ ہندوستان کے باہر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑی تمدن کا مغربی ایشیا کے قدیم تمدن سے بھی گہرا رشتہ ہے کیونکہ اَلام اور عراق اور سُمیر میں بھی تمدن پایا جاتا ہے۔ یعنی وادی سندھ کی طرح وہاں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں معاشرے کا شہری صورت اختیار کرنا تانبے اور پیتل کے آلات وظروف کے ساتھ ساتھ گاہے ماہے حجری آلات کا استعمال ہونا اور اسی وجہ سے ان تمدنوں کو "حجری فلزاتی" کہا جاتا ہے۔ کمہار کے پہیے کی ایجاد اور اس کے ذریعے سے اچھے ظروف تیار ہونا پہیے دار گاڑیاں عمارتوں کا بلند کرسی پر بننا، اور جلی ہوئی اور خشک اینٹوں کا استعمال، تحریر کے لیے تصویروں کا استعمال، نیزے، خنجر، تیر وکمان کے ساتھ گرز کا استعمال۔ زیور کا استعمال۔ سونے اور چاندی کے مصنوعات کا تیار ہونا۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ کا تمدن نہ صرف مغربی ایشیا کے تمدنوں کا ہمعصر تھا بلکہ مغربی ایشیا سے اس کے تعلقات تھے اور الف رابع میں ہندوستان اور عراق کے درمیان تجارتی اور تفریحی آمد ورفت ہوتی تھی[1]۔

---

[1]۔ مارشل۔ جلد اول صفحہ ۱۰۲۔

باب ۳

قوم آریا

پہلی فصل: آریوں کی تحقیق

جس زمانے کا حال ہم پڑھ کر آئے ہیں وہ ہندوستان کا قبل تاریخی زمانہ تھا کیونکہ اِس کا کوئی تحریری مرقع موجود نہیں ہے بلکہ صرف آثار و شواہد سے اِس کے متعلق کچھ معلومات ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کا تاریخی زمانہ اِس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ ایک نئی قوم جس کو ہم آریا کہتے ہیں، ہندوستان آئی اور دراوڑیوں کو ہٹا کر اپنا قدم جمایا۔ لیکن اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آریوں کے آتے ہی ہندوستان کی تاریخ شروع ہو گئی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ساتویں صدی ق م سے پہلے آریوں کی کوئی تاریخ معلوم نہیں ہوتی حالانکہ قراین یہ ہیں کہ آریا اس سے بہت پہلے ہندوستان آچکے تھے۔ بات یہ ہے کہ آریوں کی آمد کے بعد سیکڑوں برس کے حالات کا ہمیں صحیح علم نہیں چوتھی یا پانچویں صدی کے جو کتبے یا مذہبی تحریریں میسر آئی ہیں ان سے صرف سو سوا سو برس پہلے تک کے حالات کا کچھ سراغ چلتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کی قدیم تاریخ چھٹی صدی ق م سے شروع ہوتی ہے! اگرچہ وہ بھی نہ مفصل ہے نہ مسلسل۔ بہت سے مقامات کی سرگزشت کا کچھ پتا نہیں اور جہاں کے حالات ملتے ہیں ان میں بھی قیاس اور غیر معتبر روایات کا دخل ہے اور پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس اور بعض دفعہ صدیوں کا

وقفہ بیچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس دوران میں جو واقعات پیش آئے ان کا علم ہی نہیں ہو سکا۔ اور جو حالات معلوم ہوتے ہیں ان کو بہ قید تعین نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ کوئی ایسا ماخذ موجود نہیں ہے جس سے وقت اور زمانے کا تعین ہو سکے۔ کتبوں اور سکّوں کے ذریعے سے راجگان کے نام اور ان کے منتشر واقعات جوڑ لیے جاتے ہیں اور زمانے کا تعین کرنے کے لیے قیاس سے کام لینا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ قیاس کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ تاہم ان تمام تاریخی مجبوریوں کے باوجود چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے اس کو ہندوستان کا تاریخی زمانہ اس وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ قبل آریائی زمانے کے مقابلے میں آریائی زمانے کی تاریخ زیادہ واضح ہے اور کسی قدر تحریر میں اس کا مواد مل جاتا ہے۔

پہلے آریوں کے متعلق یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کون لوگ تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور کب آئے تھے؟ یہ ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے اور اس وجہ سے پیچیدہ ہے کہ اس کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس زمانے کی تاریخ ہے نہ کتبے۔ یہ حیات انسانی کے ابتدائی مدارج تھے جبکہ انسانوں کے گروہ اور قبیلے اپنی تلاشِ معاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے تھے اور جہاں ان کو معاشی ذرائع ملتے تھے دور دور ٹھکانا کر لیتے تھے۔ اسی طریقے سے تمام دنیا کی آبادی تقسیم ہوئی ہے۔ اور ملک آباد ہوئے ہیں۔ اس عالم وحشت کا کون مرقع رکھتا۔ لیکن تحقیق کرنے والے کچھ نہ کچھ پتا لگا ہی لیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس وقت اس نسلی چھان بین کرنے کا ذریعہ زبان ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا مقابلہ کیا جائے تو ان کی نوعیت اور ساخت کے اعتبار سے ان کو دو، تین خاندانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ زبانوں کا ایک بہت بڑا خاندان وہ ہے جس کو آریائی کہا جاتا ہے جو ہندوستان سے لے کر بحر اوقیانوس تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یعنی جو زبانیں ہندوستان۔ ایران۔ اور ترکستان۔ یونان و روم اور اسکینڈ نیوی ممالک میں بولی جاتی ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ یعنی نہ صرف صدہا الفاظ ان زبانوں میں مشترک ہیں بلکہ الفاظ اور جملوں کا جوڑ توڑ اور ان کی ترکیبیں

یکساں ہیں۔ حروفِ تہجی کی بہت کچھ آوازیں ملتی جلتی ہیں۔ ایران کی زبان جس میں اس ملک کی مقدس کتابیں آوستا اور ژند و پاژند لکھی گئی ہیں اور سنسکرت زبان میں کوئی فرق بھی نہیں معلوم ہوتا، یہ آوستا، اور رگ وید کے ٹکڑے ایسے ملتے ہیں کہ نہ صرف الفاظ اور فقرے ملتے جلتے ہیں بلکہ بند کے بند ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس طریقے سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ زبانیں بولنے والی تمام قومیں جو ہندوستان سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک پھیلی ہوئی ہیں، ایک ہی ہیں یعنی ایک زمانے میں یہ سب ایک ہی جگہ آباد تھیں۔ جب ان کی آبادی بڑھی اور ذرایع معاش تنگ ہوئے تو یہ اپنی تلاشِ معاش میں دور دور چلی گئیں۔ اور اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لیتی گئیں۔

اس طریقے سے یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آریا قوم جو ہندوستان آئی تھی ان کا دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی سے نسلی تعلق ہے جس کو مجموعی طور پر "انڈو جرمن" کہا جاتا تھا، یا اس کا اب ایک نیا نام "ویراس" تجویز ہوا ہے اور یہ اس پرانے نام سے اس وجہ سے بہتر ہے کہ یہ بے لاگ ہے یعنی اس سے کوئی وطنی لگاؤ نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اب یہ سوال بحث طلب ہے کہ ویراس کا جنم بھوم کیا تھا۔ یہ آبادی کہاں پیدا ہوئی اور بڑھی۔ اس کے متعلق بہت سے نظریے ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آبادی سب سے پہلے ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں رہ گیا اور دوسرے مغرب میں چلے گئے اور بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا اصل جنم بھوم ایشیائے کوچک ہے، یا بعضوں کے خیال میں وسط ایشیا ہے۔ اور بالعموم وسط ایشیا پر اب تک سب کو اتفاق تھا کیونکہ قدیم اور وسطی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اسی ملک میں نسلِ انسانی کی تمام ہل چل ہوتی رہی، اسی جگہ سے بڑی بڑی آبادیاں مشرق اور مغرب میں منتشر ہوئی ہیں، لیکن ایک اور تحقیق سے یہ نظریے بے سر و پا ہو جاتے ہیں اس تحقیق کا صحیح ذریعہ پھر وہی آریائی زبانیں ہیں یعنی ان زبانوں میں زمین۔

لہ۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول صفحہ ۶۶۔

پانی۔دریا۔جانور اور درختوں کے جو نام پائے جاتے ہیں وہ اس تحقیق میں بڑی مدد دیتے ہیں۔آریائی الفاظ سے جو قدیم سے برابر استعمال ہوتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ویراس منطقہ معتدلہ کے رہنے والے تھے کیونکہ جن درختوں کے نام ان زبانوں میں پائے جاتے ہیں وہ آج ایسی ہی سرزمین میں ہوتے ہیں۔ جانوروں میں گھوڑا۔کتا۔ ببر۔بیل اور ہرن کے نام آتے ہیں۔ان ناموں سے اول تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ویراس خانہ بدوش نہیں تھے بلکہ متوطن لوگ تھے۔ کیونکہ توطن کے بغیر پالو جانوروں کا ان کے پاس ہونا خلافِ قیاس ہے۔ اس کے علاوہ اناج کے لفظ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ پرندوں میں ہنس۔ بطخ کے نام ملتے ہیں۔ عقاب کا نام بھی پایا جاتا ہے۔ درندوں میں بھیڑیا، اور ریچھ کے نام موجود ہیں۔ شیر، اور ببر کے نام نہیں۔اس مواد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ویراس کا اصل وطن نہ ہندوستان تھا نہ وسط ایشیا۔ کیونکہ یہ حیوانات اور نباتات تخصیص کے ساتھ یہاں نہیں ہوتے۔وسط ایشیا میں اس زمانے میں اس قدر سرسبزی نہیں تھی۔یورپ کے شمالی اقطاع بھی اس کی نمایندگی نہیں کرتے کیونکہ یورپ کے شمالی اقطاع اس زمانے میں جنگلوں سے پٹے ہوئے تھے۔گھوڑے اور گائے کے لیے خاص سرزمین کی ضرورت ہوتی ہے جس میں تنوع ہو۔یعنی کھلے ہوئے میدان بھی ہوں جہاں گھوڑا رہنا پسند کرتا ہے اور سرسبزی بھی ہو جہاں گائے کی پرورش بھی ہو سکتی ہے۔یعنی ایسی سرزمین جو زراعت اور چراگاہ کی ضرورتیں پوری کرے۔غور سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنگری۔آسٹریا، اور بوہیمیا کے اقطاع میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اور یہ چیزیں مجموعی طور پر اور جگہ نہیں ہیں۔اور اس طرح کسی قدر وثوق کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ویراس کا اصل وطن آسٹریا، اور ہنگری کے زرخیز میدان تھے، اور قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ آسٹریا، اور ہنگری کے میدانوں سے آریائی گروہوں کی نقل و حرکت ۲۵۰۰ ق م سے قبل نہیں ہوئی بلکہ اسی زمانے کے لگ بھگ ان لوگوں نے اپنی تلاشِ معاش میں مشرق کا کوچ کیا اور ہندوستان تک پہنچ گئے۔

باب ۳

جو لوگ ہندوستان آئے ان کو ہم آریا کہتے ہیں جس کے معنی "اعلیٰ ذات" کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ ویراس کی اور شاخوں کی طرح گورے چٹے تھے اس لیے وید لکھنے والوں نے اپنے لیے یہ لفظ استعمال کیا تاکہ اس طریقے سے ہندوستان کے قدیم باشندوں سے جن کو وہ دسیو کہنے لگے امتیاز قایم ہو جائے۔ اگرچہ اکثر اس خاندان کی تمام زبانوں کو آریائی کہا جاتا ہے، لیکن صرف ایرانی اور سنسکرت کو آریائی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ لیکن آریوں کے اور مسایل کی طرح یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ آریا کب ہندوستان میں آئے۔ یہاں بھی صرف قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب آسٹریا، ہنگری میں جو ان کا اصل جنم بھوم تھا، آبادی کی کثرت ہوئی اور ذرایع معاش بہت تنگ ہو گئے تو اس آبادی کا ایک حصہ مشرق کی طرف نکل آیا۔ کچھ لوگ ایران میں آباد ہو گئے اور کچھ آگے بڑھ کر ہندوستان کی طرف نکل آئے۔ ایرانی اور سنسکرت زبانوں کے مطالعے سے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تو طن ایک ساتھ ہوئے ہیں کیونکہ نہ صرف یہ دونوں زبانیں ایک ہیں بلکہ اوستا، اور رگ وید کے بعض بھجن بھی ایک ہی ہیں۔ لیکن ان دونوں قوموں کی مشرق کی طرف کب نقل و حرکت ہوئی اب بھی بحث طلب ہے۔ ابھی چند دن ہوئے کہ جرمنی میں ایک کتبہ دریافت ہوا ہے جس میں ہندوستان کے دیوتاؤں کے نام اندرا وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اور اس کتبے کی تاریخ ۱۴۰۰ ق م کے قریب ہوتی ہے اور قرینہ یہ ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان اور ایران کے آریا آسٹریا سے نکلے ہوں گے اور جو طریقۂ تخیل آسٹریا اور ہنگری کے میدانوں میں تھا وہی مشرق میں اپنے ساتھ لائے۔ ہندوستان میں تو یہ تخیل باقی رہا لیکن آسٹریا اور ہنگری میں باقی نہیں رہا بلکہ اس کی جگہ نئے تخیل پیدا ہو گئے لیکن کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کی جدائی ہوئی تھی وہ تخیل وہاں موجود تھا۔

آریوں کا توطن ہندوستان میں

رگ وید سے جو آریوں کی تاریخ کا سب سے پہلا ماخذ ہے معلوم ہوتا ہے کہ آریا کوہ ہندوکش کو عبور کر کے پہلے افغانستان آئے۔ کیونکہ وید میں کوبا (کابل)، سواستو (سوات) کرومو (خرم) کے نام پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سندھو کا لفظ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریا افغانستان سے

نکل کروادی سندھ میں آباد ہوئے تھے۔ یہیں ان کا پہلا توطن ہوا، اور اسی سندھو سے غالباً تمام ہندوستان کو ہندو کر دیا گیا۔ اس کے بعد پنجاب کے پانچ دریاؤں کے نام تھوڑے فرق کے ساتھ ملتے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ آہستہ آہستہ پنجاب میں آباد ہوئے۔ لیکن پانچ دریاؤں کے ساتھ دریائے سرسوتی کا نام اکثر آتا ہے اور اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غالباً سرسوتی ہوگی جو ستلج اور جمنا کے درمیان واقع ہے اور یہ دریا آریوں کے توطن میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد دریائے جمنا اور گنگا کے نام آتے ہیں اور ان سے مشرقی پھیلاؤ واضح ہوتا ہے۔ ہمالیہ کے نام سے معلوم ہوتا ہے آریوں کی آبادی شمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بنگال اور جنوب ہند کا ذکر نہیں کیونکہ رگ وید کے زمانے میں مشرق اور جنوب ہند میں توطن نہیں ہوا تھا۔ یہ سب توطن یک لخت نہیں ہوا بلکہ آریاؤں کی تمام آبادی قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی چنانچہ رگ وید میں کئی قبیلوں کے نام آتے ہیں۔ یہ قبیلے نہ صرف ہندوستان کے سیاہ فام باشندے یعنی دسیو سے لڑتے رہے کیونکہ ان کو ہٹا کر ملک پر قبضہ کرنا تھا۔ دوسرے یہ آپس میں بھی برسرپیکار ہو گئے کیونکہ ہر قبیلہ اپنا غلبہ چاہتا تھا۔ ہندوستان کے سیاہ فام باشندوں سے ایک رنگ اور دوسرے مذہبی عقاید کا فرق تھا اور اسی وجہ سے آریا ان کو حقیر سمجھتے تھے اور ان کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو مغلوب ہو گئے وہ شودر ہو گئے، جو بھاگ گئے وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں آباد ہو گئے اور جنوب ہند کی طرف نکل آئے۔

دوسری فصل آریوں کا ابتدائی تمدن

آریوں میں شہری زندگی نہ تھی بلکہ یہ دیہی زندگی کے عادی تھے۔ جہاں

آباد ہوتے تھے آس پاس گھر بنا کر رہتے تھے تاکہ اتحاد عمل ہو اور باہمی حفاظت ہو سکے۔ اس طریقے سے دیہات وجود میں آئے۔ گھروں کے ارد گرد باڑ ہوتی تھی یا ایسی حفاظتی تدابیر ہوتی تھیں کہ وحشی جانور گھروں میں نہ گھس آئیں۔ ہر گھر میں مویشی ہوتے تھے جو دیہی زندگی کے لوازم ہیں۔ گائے بہت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے کے شاعر بھی اپنے شاعرانہ انداز میں گائے کو ایک اچھے پُراثر طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ رات کو گائے ڈڈی میں ہوتی تھی اور دن کو چرنے کے لیے چھوڑ دی جاتی تھی اور دن میں تین مرتبہ دودھ دوہا جاتا تھا۔ بیل اور سانڈ ہل جوتنے اور بنڈی (چھکڑا) کھینچنے میں استعمال ہوتے تھے۔ ان کے بعد گھوڑوں کا درجہ ہے۔ یہ میدان جنگ میں رتھ کھینچتے تھے اور گھوڑ دوڑ میں کام آتے تھے۔ دوسرے پالو جانوروں میں بھیڑ۔ بکرا۔ گدھا، اور کتّا تھا۔ زراعت بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ رگ وید کے زمانے میں ہل کا استعمال کثرت سے ہونے لگا تھا۔ ہل جوتنے۔ دانہ ڈالنے، اور درانتی سے فصل کاٹنے اور گٹھے باندھنے اور بالآخر غلّے کے چھاننے اور پھوڑنے (پھٹکنے) کا ذکر آتا ہے۔ لیکن نہروں کا بھی ذکر ہے جن کے ذریعے آبپاشی ہوتی تھی۔ لیکن یہ یقین سے نہیں معلوم ہو سکا کہ کونسا اناج بویا جاتا تھا گیہوں یا جو۔

آریائی معاشرے کی ترتیب پدری طریقے پر تھی۔ اگرچہ رئیسوں کی بیویاں زیادہ ہوتی تھیں۔ لیکن عام لوگ صرف ایک بیوی کرتے تھے۔ ہر گھر میں شوہر آقا ہوتا تھا اور بیوی مالکنی لیکن بیوی اپنے شوہر کی تابع ہوتی تھی عورتوں کا معیار اخلاق مردوں کے مقابلے میں بہت بلند تھا۔ بھائی، بہن اور باپ بیٹی کا رشتۂ ازدواج ممنوع تھا۔ کمسنی کی شادی بالکل مفقود تھی۔ انتخاب شوہر اور زوجہ کی پوری آزادی تھی۔ لڑکیاں شادی سے پہلے اپنے باپ کی حضانت میں اور باپ مر جائے تو بھائی کی حضانت میں رہتی تھیں۔ بعض مرتبہ دولھا کو بڑے عطیے دے کر دلھن حاصل کرنی پڑتی تھی۔ رگ وید میں شادی پر بہت زور دیا گیا ہے اور خاص رسم بتائی گئی ہے اور ایک دفعہ عقد ہونے کے بعد پھر اس کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ باپ اور اس کی اولاد کے تعلقات ایک

رشتۂ محبت سے وابستہ تھے۔ ماں باپ کے بہت حقوق بتائے گئے ہیں۔ باپ کو اپنے بیٹے، بیٹی کی شادی کا پورا اختیار تھا۔ تبنیت کے حقوق تھے۔ جب بیٹے کی شادی ہوتی تو نیا خاندان اس وقت تک باپ کی نگرانی میں رہتا تھا، جب تک باپ ضعیف ہو جائے اور نگرانی کے قابل نہ ہو۔ اب خاندان کس حد تک پھیلتا تھا رگ وید میں کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ تین پشتوں تک ایک ہی خاندان ہوتا تھا، اور قرائن یہ ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد خاندان کی شکست ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے سب بھائی ایک ہی جگہ رہتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں۔ اس طرح ان کے مکان آس پاس ہونا ضروری تھے جو آگے چل کر ایک گاؤں کی صورت میں تبدیل ہو گئے اور ظاہر ہے جب گاؤں پھیلے تو وہ قصبے بن گئے اور بڑی بڑی آبادیاں بن گئیں۔

ذات پات کی تقسیم

جب سے آریا ہندوستان آئے اور پنجاب اور دوآبہ میں پناہ گزین ہوئے ان میں ذات پات کی تقسیم پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ رگ وید میں بھی ذات پات کی تقسیم کا کوئی ضابطہ یا ہدایت موجود ہے۔ بعض لوگ تو وید سے ہی یہ مواد اخذ کرتے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کی طبقہ واری تقسیم کسی مذہبی یا قانونی ہدایت کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی تھی، اگرچہ رگ وید میں ذات پات کی بہت سی جھلکیاں پائی جاتی ہیں اور بہت سے شواہد اس کی تائید کرتے ہیں، تاہم اس کا پورا ارتقاء حالات کے زور سے ہوا۔ بات یہ ہے کہ جب آریا پنجاب میں داخل ہوئے اور پنجاب سے دوآبہ کی طرف بڑھے تو ان کو قدم قدم پر ہندوستان کے سیاہ فام باشندوں سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ چونکہ آریوں کی تمام آبادیاں قبیلوں میں منقسم تھیں اس لیے پہلے تو ہر قبیلہ اپنے سردار کے ماتحت ہندوستانیوں سے مقابلہ کرتا رہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں آریوں کی پیش قدمی بڑھتی گئی دیسیوں نے متحدہ اور پُر زور مقابلے کیے۔ ان کی مزاحمت کے لیے آریائی قبیلوں کو بھی متحد ہونا پڑا اور یہ اتحاد بعد کو چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں کی شکل میں بدل گیا اور جو لوگ پہلے جداگانہ قبیلوں کے سردار تھے وہ سردار نہیں رہے بلکہ نو خیز راجدھانیوں میں سپاہی بن گئے، اور ان سے

باب ۳

ایک مستقل فوجی طاقت کی صورت ہوگئی تاکہ ہر اچانک حملے کی مزاحمت ہو سکے۔ اس سپاہیانہ طبقے کے پیدا ہونے سے یہ فایدہ ہوا کہ جو لوگ زراعت اور صنعت و حرفت میں حصہ لیتے تھے وہ ہتھیار سے دست کش ہوگئے کیونکہ ان کی حفاظت فوجی طبقے سے ہوتی تھی۔ اس کے بعد جب راجدھانیاں وسیع ہوتی گئیں اور تمدن پھیلتا گیا، مذہبی رسوم کی ادائی بھی پیچیدہ ہوگئی۔ پہلے قبیلے کے سردار اپنے قبیلے کی طرف سے قربانی کرتے تھے، لیکن اب قبیلے کے سردار یا راجہ سے رسوم کی پوری ادائی اور روایتوں کی پابندی ناممکن ہوگئی اور یہ کام پروہتوں کے سپرد ہوگیا اور اس طریقے سے برہمنوں کا طبقہ وجود میں آگیا۔ چوتھا طبقہ شدروں کا تھا اور یہ ہندوستان کے سیاہ فام باشندے تھے جو آریوں کے ہاتھ میں مغلوب ہوگئے۔ اور یہ لوگ آریائی معاشرے کی ذیلی خدمات انجام دینے کے لیے مقرر تھے۔

آریوں کی سیاسی تنظیم

آریائی معاشرے کی ترتیب تو کسی قدر واضح ہوگئی لیکن سیاسی تنظیم کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کے زمانے میں ہر قبیلہ اپنے ایک سردار یا راجہ کے ماتحت ہوتا تھا کیونکہ "راجن" کا لقب رگ وید میں ہر جگہ پایا جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجن موروثی ہوتے تھے۔ اس کے سوا کوئی طرز حکومت نہ تھی۔ راجہ کے فرایض زیادہ تر دفاعی سمجھے جاتے تھے یعنے وہ اپنی رعایا کے جان اور مال کی حفاظت کرے۔ چنانچہ دیوداس اور سوداس جیسے راجوں کے فوجی کارناموں کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ زمانہ امن میں اس کے کچھ فرایض نہیں معلوم ہوتے سوائے اس کے راجہ کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ اپنے اور اپنی رعایا کی طرف سے رسم قربانی انجام دینے کے لیے بہت سے پروہتوں کو رکھے۔ راجہ اپنی رعایا سے اس طرح ممتاز تھا کہ اس کا لباس زرق برق ہوتا تھا۔ اس کا محل ہوتا تھا اور اس کے حوالی موالی ہوتے تھے راجدھانی کے مصارف اس طرح پورے ہوتے تھے کہ راجہ کو مغلوب قبیلوں سے خراج اور رعایا سے عطایا ملتے تھے جو بعد کو لازم ہوگئے۔ اس کے علاوہ مفتوحہ علاقوں سے مال غنیمت بھی ملتا ہوگا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ راجہ کے ساتھ

کون عہدہ دار ہوتے تھے۔ صرف "سنانی" اور "گرامانی" کے نام سے دو فوجی عہدہ دار ملتے ہیں جو میدانِ جنگ میں فوجی رہنمائی کرتے تھے۔ البتہ راجہ کا خاص پروہت بہت اہمیت رکھتا ہے جو اوائل میں مذہبی رسوم انجام دیا کرتا تھا۔ آگے چل کر راجہ کو سیاسی مشورہ دینے لگا اور اسی طریقے سے برہمن وزراء پیدا ہوگئے۔ راجہ کو پورے اختیارات حاصل نہ تھے، کیونکہ اس کے ساتھ رعایا کی ایک مجلس بھی تھی۔ ویدمیں دو نام "سمتی" اور "سبھا" پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ سمتی کو افرادِ مملکت کی بڑی مجلس اور سبھا کو اکابرِ ملک کی مجلس سمجھتے ہیں۔ لیکن اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سمتی ایک مجلس تھی جس میں قبیلہ کے افراد نشست کرتے تھے اور اپنے امور طے کرتے تھے اور "سبھا" اس مجلس کا مقام تھا۔ اس مجلس میں بادشاہ کی خاص جگہ تھی اور بعض موقعوں پر قبیلے کے تمام افراد شریک ہوتے تھے۔ اب رہا قانون اور انصاف اس کی ویدمیں خاطر خواہ وضاحت نہیں ہے۔ بعض جگہ خونبہا کا ذکر آتا ہے کہ اگر کوئی شخص مار ڈالا جائے تو اس کے معاوضے میں اتنی گائیں دینی چاہئیں۔ رگ ویدمیں جن جرائم کا ذکر ہے وہ چوری ہے جو اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ یعنی ڈاکا۔ نقب زنی اور قزاقی کے ساتھ پائی جاتی تھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرائم اکثر ہوتے تھے۔ ان جرائم کی سزا ان لوگوں کے ذمے تھی جن پر ان جرائم کا اثر پڑتا تھا۔ یہ لوگ مجرم کے متعلقین سے اپنا حرجہ وصول کرلیتے تھے۔ رگ ویدمیں ایک جگہ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو مسروقہ مویشی کی بازیافت کے لیے متعین تھے، اور اس کام کی ان کو مشق بہم پہنچائی گئی تھی۔ قانونِ دیوانی کے متعلق بھی کچھ ایسے ہی منتشر معلومات حاصل ہوجاتے ہیں جیسے فوجداری کے ہیں۔

آریوں کا مذہب

جس طرح آریوں کی معاشرت سیدھی سادی تھی اسی طرح ان کا مذہب بھی بہت سادہ تھا۔ لیکن بعد کو پروہتوں نے اس کو بہت پھیلایا اور پیچیدہ بنایا۔ بات یہ ہے کہ آریوں کے پاس صرف قدرتی عناصر جیسے زمین، آسمان، سورج، آگ، پانی قابلِ پرستش تھے اور یہی خدا سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ بڑے دیوتاؤں میں دیوس یعنی آسمان۔ پرتھوی یعنی زمین اور اندرا یعنی رعد اور

اگنی یعنی آگ وغیرہ شامل تھے اور یہ جانوروں کی شکل میں ظاہر کیے جاتے تھے۔ مثلاً اندرا، بیل کی شکل میں اور آفتاب تیز گھوڑے کی شکل میں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آریا جانوروں کی پرستش کرتے تھے۔ اعتقاد یہ تھا کہ اگر ان دیوتاؤں کی خاطر خواہ پرستش کی جائے تو وہ پوجنے والوں پر اپنا فضل کرتے ہیں۔ پرستش قربانی کے ذریعے عمل میں لائی جاتی تھی۔ چنانچہ سورج کو خوش کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ گھوڑے کی قربانی کرے کیونکہ اس ذریعے سے سورج میں نئی طاقت پیدا ہوتی اور یہ اپنے پوجنے والوں پر اپنی عنایت کرتا تھا۔ قربانی کی رسم اس طرح انجام دی جاتی تھی کہ کھلے آسمان کے نیچے آگ جلائی جاتی تھی اور اس کے قریب جانور کی قربانی دی جاتی تھی اور پروہت منتر پڑھتے تھے۔ قربانی میں دودھ۔ اناج۔ گھی۔ گوشت اور سونا بھی داخل تھے۔

تیسری فصل :- رزم ناموں کا زمانہ

تقریباً ۱۰۰۰ ق م سے آریائی تمدن کی ترقی کا دوسرا دور قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ سنہ قیاسی ہے اور اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ رگ وید کے زمانے کے بعد ایک ایسا زمانہ آیا جبکہ آریا پنجاب سے آگے بڑھ کر دوآبے پر چھا گئے اور بہار تک پیش قدمی کی اور اس زرخیز علاقے کے توطن سے ان کے تمدن میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ بڑی بڑی راجدھانیاں قایم ہوئیں۔ مذہبی ادب میں ترقی ہوئی۔ تعلیم و تعلم شروع ہوا۔ ہندوستان کی جغرافی خصوصیات کے اعتبار سے یہ ناممکن تھا کہ آریا پنجاب میں سکڑے رہتے اور دوآبے میں نہ آتے، خود رگ وید کے زمانے میں جبکہ آریا پنجاب پر مسلط ہو گئے تھے آریوں کی ٹولیاں پنجاب کے پانچ دریا عبور کر کے دوآبے میں آتی تھیں، اور اسی طرح جب راستہ صاف ہو گیا تو دوآبے میں ان کی تعداد بڑھنے لگی اور گنگا اور جمنا کی

وادیوں میں توطن ہونے لگا۔ رگ وید کے زمانے میں جو قبیلے تھے ان میں "بھرت" نامی قبیلہ بہت ذی اثر اور طاقتور تھا۔ غالباً تمام پنجاب میں اس کی عملداری تھی۔ اگرچہ برہمناؤں کے زمانے میں یہ غائب ہو گئے تھے لیکن ان کے راجگان کے نام زندہ تھے۔ چنانچہ ایک برہمنا میں ان کے مشہور راجگان کے نام آتے ہیں۔ اس دور میں بھارتوں کی جگہ دوسری نسلوں نے لی جو کورو اور پنچال کے نام سے موسوم ہیں۔ اور بھارت قبیلہ جس کی لڑائیاں مشہور تھیں موجودہ دہلی کے قرب وجوار میں مسلط ہو گیا اور ہستناپور میں اپنی راجدھانی قایم کرلی۔ یہی قبیلہ کورو بھی کہلاتا تھا۔ یہ پیش قدمی یہیں تک محدود نہیں تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں جبکہ بھارت اور کورو ہستناپور میں مسلط ہوئے اور اپنی راجدھانی قایم کر رہے تھے۔ دوسرے قبیلے مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چنانچہ پنچال نامی ایک قبیلہ اس خطۂ زمین پر مسلط ہو گیا جہاں آج کل قنوج واقع ہے۔ کورو کی راجدھانی کی طرح پنچال نے بھی اسی زمانے میں اپنی راجدھانی قائم کرلی۔

گنگا اور جمنا کی زرخیزی نے ان سلطنتوں کو پھیلانے میں بڑی مدد دی اور آریاؤں کے تمدن کو بہت آگے بڑھا دیا۔ پنجاب میں آریا تو محض سپاہی اور کاشتکار تھے۔ لیکن دوآبے میں یہ بڑی حد تک متمدن ہو گئے۔ دیہات اور قصبات آباد ہوئے۔ علمی اور سپاہیانہ تعلیم ہونے لگی۔ طبقہ واری تقسیم جس کی بنیاد رگ وید کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ بہت واضح ہو گئی۔ ہر طبقہ اپنے فرایض منصبی کے ساتھ اس قدر الگ ہو گیا کہ گویا دوسرے سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اس تقسیم عمل سے اس قدر فایدہ ضرور ہوا کہ آریائی تمدن بہت آگے بڑھ گیا۔ شتریوں نے اپنے زورِ بازو سے بڑی بڑی راجدھانیاں قایم کرلیں اور ویش نے زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت کو اپنا پیشہ بنالیا اور برہمن جو محض مذہبی رہنمائی کے لیے وقف ہو گئے تو یہ تخصیص مذہب کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ مذہبی ادب میں بہت اضافہ ہوا۔ رگ وید کی بنیاد پر تین وید اور لکھے گئے۔ اپنشدوں اور برہمنوں میں ان کی تفسیر لکھی گئی تاکہ ویدوں کے مطالب آسانی سے سمجھ میں آسکیں اور اس تفسیر کی اس وجہ سے

باب ۳

ضرورت تھی کہ طبقہ واری تقسیم کی وجہ سے ویش اور شتری ویدوں کے مطالب سمجھنے سے قاصر تھے۔ کیونکہ ان طبقوں کو خود اپنے مشاغل سے اس قدر فرصت نہیں تھی کہ مذہبی ادب کا بھی مطالعہ کریں۔ اس طریقے سے ویدوں کے مطالعے کے لیے نثر و نظم کا ایک بڑا مجموعہ جمع ہو گیا۔ سنسکرت زبان کو بھی بڑی ترقی ہوئی۔ نثر اسی دور میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ برہمن طبقے کی یکجائی سے معاشرت اور سیاست کے اصول بھی بہت کچھ مدون ہو گئے۔ انسانی زندگی کا ایک مقصد قرار دیا گیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے حیات انسانی کے چار حصے کیے گئے اور ہر حصے کے فرایض جداگانہ قرار دیے گئے۔ یہی برہمن جو پروہت کے فرایض ادا کرتے تھے اور راجگان کے ساتھ رہتے تھے، سیاسی مشوروں میں بھی شریک ہونے لگے۔ یہ سیاسی زندگی آگے چل کر بڑے نتایج کا باعث ہوئی۔ یعنی برہمن وزیر بن گئے اور بڑی بڑی راجدھانیاں انھیں کے اشاروں پر چلنے لگیں۔ چنانچہ موریا سلطنت کی تشکیل میں ایک بہت بڑے برہمن وزیر کا ہاتھ تھا۔

مہابھارت

تمدن کی ترقی کے ساتھ جنگ و جدل بھی ناگزیر ہوتی ہے۔ ہستناپور کی راجدھانی بہت پھیلی۔ اس کے پرانے راجہ سنتن کا انتقال ہوا تو اس کی اولاد میں خانہ جنگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس راجہ کا پوتا پانڈو، جو اس کا جانشین ہوا تھا بہت جلد مر گیا، اور پانچ بیٹے چھوڑے تھے جو پانچ پانڈو کہلاتے ہیں۔ یہ اپنے باپ کے انتقال کے وقت چھوٹے تھے ان کی جگہ ان کا اندھا چچا دھرت رشٹ حکمران ہو گیا۔ جب پانڈو سن رشد کو پہنچے تو ان کو گدی نہیں ملی بلکہ دھرت رشٹ نے اپنے بیٹے دریودھن کو اپنا جانشین بنا دیا، اور پانچ پانڈو جلاوطن کر دیے گئے۔ اپنی جلاوطنی میں انھوں نے پنچال کے راجہ دروپد، کی بیٹی سے شادی کی اور اس سلطنت کے زور سے اپنے آبائی وطن کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کشور کورو، پانچ پانڈوؤں اور دھرت رشٹ، کے بیٹوں میں تقسیم ہوا۔ چونکہ تقسیم ہموار نہیں تھی اس لیے خانہ جنگی کا سامان برابر قایم رہا۔ بڑا پانڈو یودھشٹر، بادشاہ تو ہوا، اور موجودہ دہلی کے قریب اپنا ایک علحدہ پائے تخت

اندر پرست کے نام سے آباد کیا۔ لیکن اس کی اخلاقی کمزوریوں نے اس کو بہت دنوں تک بادشاہ رہنے نہیں دیا۔ دُرودھن کے ساتھ قمار بازی ہوئی تو اس میں اپنی دھن دولت۔ راجدھانی اور بیوی ہار دی اور بالآخر یہ ۱۲ سال کے لیے پھر جلا وطن ہو گئے اور ایک دور دراز راجہ کے پاس جا کر نوکر ہو گئے اور بارہ سال گذرنے کے بعد اپنی سلطنت طلب کی۔ لیکن جب اس سے انکار ہو گیا تو لڑائی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ کورو اور پانڈوں میں ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ مہابھارت اسی جنگ کا مرقع ہے۔ اگرچہ مہابھارت کی تمام کہانی ایک فرضی چیز معلوم ہوتی ہے تاہم اس سے اس زمانے کے اخلاق و عادات طور و طریق اور طریقۂ جنگ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ نہ صرف ہندوستان کا بڑا رزمنامہ ہے بلکہ تاریخ کا ماخذ بھی ہے۔

اس کے بعد آریوں کی پیش قدمی بہار کی طرف ہوئی۔ جب گنگا اور جمنا کی وادیوں پر ان کا کافی تسلط ہو گیا تو آریائی قبیلوں نے اور مشرق کی طرف پیش قدمی کی۔ دریائے گنگا عبور کر کے جنگلوں کو چیرتے پھاڑتے گنگا کے مشرقی خطوں میں آباد ہوئے اور وہاں راجدھانیاں قایم کر لیں۔ چنانچہ اس خطے میں جس کو آج کل اودھ کہتے ہیں کوسل اور ترہت یا شمالی بہار میں ویدھے اور موجودہ بنارس کے پاس کاسی کی راجدھانیاں قایم ہو گئیں۔ مگدھ جو جنوبی بہار ہے اور انگا جو مشرقی بہار ہے سب آریوں کے زیر نگین آ گئے۔ شمال میں یہ ہمالیہ تک پہنچ گئے تھے اور جنوب میں بندھیاچل ان کی حد ہو گئی۔ کیونکہ ایک اپنشد میں جنوبی پہاڑوں کا ذکر آتا ہے۔ بندھیاچل کے پہاڑ سمجھے جا سکتے ہیں۔ مختلف برہمنوں میں ان راجدھانیوں کا ذکر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں کے بعد ویدھے کی راجدھانی اپنے تمدن اور طاقت میں شمال کی ایک بڑی سلطنت ہو گئی۔ راجہ جنک اس سلطنت کے بڑے راجہ تھے جن کی اس زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ یہ نہ صرف طاقتور اور اقبالمند بلکہ علوم و فنون کے بڑے سرپرست تھے۔ اس راجہ کو یہ امتیاز ہے کہ

باب ۳

اس نے اپنے ارد گرد بڑے لایق لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔ اس کی سرپرستی میں یجروید کی نظر ثانی ہوئی اور اپنشد لکھے گئے۔ اور اپنشدوں کی تدوین زیادہ تر شتریوں کا کام ہے۔ اور اس طرح مذہبی فلسفے میں بڑا اضافہ ہوا۔ ہندوستان راجہ جنک کے ان علمی کارناموں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کے ہمعصر کوسل کی راجدھانی تھی۔ دسرتھ اسی کے راجہ بتائے جاتے ہیں جن کا پایۂ تخت اودھ تھا۔ ان کی تین بیویاں بتائی جاتی ہیں۔ ایک بیوی کوسلیا نامی تھی جس کے بطن سے رام پیدا ہوئے تھے اور کیکئی کے بطن سے بھارت اور سمیترا کے بطن سے لکشمن وغیرہ تھے۔ دسرتھ نے اپنے بڑے بیٹے رام کو ولیعہد بنانا چاہا تو

رامائن

ان کی دوسری بیوی کیکئی نے اپنے بیٹے کی ولیعہدی پر زور دیا اور دسرتھ نے یہ بات مان لی۔ اس زمانے میں جبکہ رام نے ایک بڑی کمان اُٹھا کر اپنی غیر معمولی طاقت کا ثبوت دیا اور راجہ جنک کی بیٹی سیتا، حاصل کر لی اور اودھ میں اس کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ بھارت کی ولیعہدی کا فیصلہ ہو گیا اور رام کو چودہ سال جلا وطنی کے لیے مجبور کیا گیا۔ رام نے باپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا لیا اور کوسل سے پہلے الہ آباد گئے اور اس کے بعد بندیلکھنڈ اور اس کے بعد دکن کے جنگلوں میں بادیہ نوردی کی۔ یہ جلا وطنی آسانی سے ختم ہو جاتی لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ راون جو لنکا اور جنوب ہندوستان کا راجہ تھا رام کی بیوی سیتا کے حسن پر فریفتہ ہو گیا، اور رام کی عدم موجودگی میں اس کو لنکا اُٹھا لے گیا۔ سیتا کو حاصل کرنے کے لیے رام کو لنکا پر حملے کرنے پڑے، راون کی شکست اور سیتا کی بازیابی اس داستان کا نتیجہ ہے اور جب جلا وطنی کا زمانہ ختم ہوا تو رام کوسل گئے اور باپ کے جانشین ہو گئے جن کا ان کی عدم موجودگی میں انتقال ہو چکا تھا۔ رامائن جس کا لکھنے والا والمیکی بتایا جاتا ہے اس داستان کا دلچسپ مرقع ہے۔ یہ ہندوستان کا بڑا رزمنامہ ہے۔ اگرچہ قصہ فرضی معلوم ہوتا ہے تاہم اس سے بھی تاریخ کی بڑی حقیقتیں معلوم ہوتی ہیں، اگر کچھ نہیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آریا شمال سے دکن میں بھی داخل ہو رہے تھے۔

باب ۳

پہلی فصل:- قدیم خود مختار ریاستیں

ساتویں صدی ق م سے پہلے ہندوستان کی تاریخ پر ظلمت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ ہم پچھلے باب میں بتا آئے ہیں کہ آریا قوم ملک ہندوستان میں کہاں سے آئی اور کب آئی؟ یہ قیاس کہ وہ شمال مغرب کی طرف سے آئی تھی، اس لیے قابل تسلیم نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصوں میں جو لوگ آباد ہیں ان کا رنگ روپ اور خط و خال آریائی ہیں۔ آریائی زبانوں کا دُور دُور تک پھیلا ہوا ہونا شہادت دیتا ہے کہ اس نسل کے افراد نہ صرف ایران و ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے بلکہ مغرب میں ممالک یورپ میں بھی پائے جاتے ہیں مگر یہ بھی اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ جن ملکوں میں آریائی زبان پہنچی وہاں خالص آریا نسل کے لوگ آباد تھے کیونکہ خود زبان کی خوبی یا حکومت و تمدن کی برتری دوسری قوم کے لوگوں میں کسی زبان کو رواج دے سکتی ہے اور یہ لازمی نہیں کہ وہاں کے باشندے نسلاً بھی اسی قوم کی اولاد میں ہوں جس کے قدیم الفاظ آج اُن کی زبان میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں برس تک دوسری قوموں سے میل جول اور آبادی کے بڑے بڑے انقلابات سے جو نتائج پیدا ہوئے ہوں ان کا ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے اور قیاسات کا نام تاریخ نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی تاریخ درکنار ہمیں خود آریوں کی آمد کے بعد سیکڑوں برس کے حالات کا صحیح علم نہیں۔ اور چوتھی یا پانچویں صدی ق م کے جو کتبے یا مذہبی تحریریں[لہ] ملتی ہیں ان سے صرف سو سوا سو برس پہلے تک کے حالات کا سراغ چلتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہند (اور وہ بھی شمالی ہند) کی قدیم تاریخ چھٹی صدی ق م سے شروع ہوتی ہے، اگرچہ وہ بھی نہ مفصل ہے نہ مسلسل۔ بہت سے مقامات کی سرگزشت کا کچھ پتا نہیں اور جہاں کے حالات ملتے ہیں ان میں بھی قیاس اور غیر معتبر روایات کا دخل ہے اور پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس یا زیادہ کا بیچ میں وقفہ پڑ جاتا ہے کہ اس دوران میں جو واقعات پیش آئے ان کا علم ہی نہیں ہو سکا۔ مورخ کی ان معذوریوں کو پیش نظر رکھ کر ہمیں

لہ - اہل تحقیق کے نزدیک اب یہ بات قریب قریب مسلّم ہے کہ ہندوستان میں تحریر کا فن اشور و بابل سے آیا جہاں سامی قوموں کی پُر شوکت سلطنتیں قائم تھیں۔ آٹھویں صدی کے خاتمے، یا ساتویں صدی ق م کے آغاز میں جنوبی ہند کے تاجر وہاں کی رسم کتابت اپنے وطن میں لائے تھے لیکن اس فن کی ترویج و ترقی شمالی ہند میں ہوئی۔

باب ۲

سب سے پہلے ہندوستان کے نقشے پر ایک نظر ڈالنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ چھٹی صدی ق م میں ہندوستان کی کن کن ریاستوں یا قوموں کے ناموں کا پتا چلتا ہے تاکہ بعد کے واقعات مطالعہ کرنے میں مدد ملے:-



(۱) نقشے میں سب سے اوپر ریاست گندھارا کا نام نظر آتا ہے اور قرائین چاہتے ہیں کہ یہی لفظ بعد میں قندھار ہو گیا۔ لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت گندھارا میں زیادہ تر ہندوستان کا وہ ٹکڑا شامل تھا جسے آج کل "شمالی مغربی سرحدی صوبہ" کہتے ہیں۔ غالباً اِس ریاست کے ہندوستان میں داخل رہنے کی وجہ یہی ہے کہ اِس کا پائے تخت یا صدر مقام بھی کوہستان سلیمان کے اِس طرف یعنی موجودہ راولپنڈی کے قریب واقع اور اپنے بانی قبیلہ تکا کے نام سے ٹکا سِلا (یا ٹکسلا) موسوم تھا۔

(۲) کورو کی سلطنت، جس کا پائے تخت اندر پرست موجودہ شہر دہلی کے قریب واقع تھا۔ روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ مت کے عروج سے چند صدی پہلے یہ سلطنت بڑے عروج پر تھی اور پنجاب میں کسی علیحدہ ریاست کا ذکر نہ آنے سے بھی قیاس ہوتا ہے کہ یہ شمالی علاقہ کورو کے زیر نگین ہوگا۔

(۳) کورو کے مشرق میں دریائے گنگا سے کوہستان ہمالیہ تک پنچال یا پنکال قوم کی حکومت تھی اور جنوب کی طرف یہ لوگ موجودہ اودھ کے علاقے تک دوآب میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔

(۴) پنچالوں کے اس جنوبی علاقے اور مکس یا متسیہ قوم کے مُلک میں جمنا حدِ فاصل بناتی تھی، اور اندر پرست کے مغربی اضلاع تک انھی مکسوں کا دور دورہ تھا۔

(۵) اگرچہ ٹھیک ٹھیک سرحدیں بتانا محال ہے، لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ جمنا کے مغرب میں مکسوں کے علاوہ ایک اور قوم شورسینی آباد تھی جن کا صدر مقام مدھورا اسی دریا کے کنارے واقع تھا اور عجب نہیں کہ یہی لفظ بگڑ کر متھرا ہو گیا ہو۔

(۶) اونتی، جس کا پائے تخت قدیم زمانے میں بھی اجین (یا اجینی) تھا، موجودہ مالوے کے علاقے کو کہتے تھے۔ آریا نسل کے لوگوں کا مغرب اور جنوب میں گوداوری تک بعض مقامات پر جا بسنا بھی ثابت ہوتا ہے، لیکن یہ نو آبادیاں غالباً بہت بعد کے زمانے میں بسیں اور نو وارد آریا اوّل اوّل ہندوستان میں صرف مالوے تک پھیلے تھے۔

(۷) وجین قوم کے لوگ موجودہ صوبہ جات متحدہ کے شمالی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے دو سب سے قوی اور مشہور

جنھیں لچھوی[1] یا لکھوی اور وآلبائی کہلاتے تھے ان کا سب سے بڑا مرکز ویسالی نامی شہر تھا جس کا بعض اہل تحقیق نے موجودہ ضلع مظفر پور (بہار) میں اس مقام پر کھوج نکالا ہے جہاں آج کل قصبۂ بساڑ آباد ہے۔ یہ نہایت وسیع و بارونق شہر تھا اور اس کے گرد تین تین فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ وجین قوم کے بڑے بڑے رئیس و راجہ اسی مقام پر رہتے تھے اور اُن کا دوسرا مستقر متھلا ویسالی کے کچھ اوپر شمال مغرب میں آباد تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وِدیہائی گروہ کے لوگوں نے ایک مستقل ریاست الگ بنالی تھی جسے ودیہا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعد کی بھاشا میں وِدھ رہ جائے گا اور اس میں اِودھ میں جو مناسبت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گوتم بودھ کے وقت میں یہاں بہت وسیع اور جمہوری طرز کی سلطنت تھی۔ پس کیا عجب کہ انقلابات زمانہ سے اس سلطنت کا نام صرف ایک صوبے (اودھ) میں یادگار رہ گیا ہو کیونکہ قدیم تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قوی قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ اس لفظ میں الف "غیریت" کا ہے۔ (اَ وِدھ یعنی وہ علاقہ جو وِدھ کے باہر یا غیر وِدھ ہو) لیکن جدید مغربی محققین میں سے کسی کا خیال ادھر نہیں گیا اور بعض مصنف اَودھ کو اجدھیا کی بگڑی ہوئی صورت بتاتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ جو علاقہ اب اَودھ کہلاتا ہے وہاں ان دنوں ایک علیحدہ سلطنت قائم تھی جس کی سلطنت مگدھ کے ساتھ کشمکش کا حال ہم آگے بڑھیں گے۔

(۸) یہ کوسل کی سلطنت تھی جس کا پائے تخت ساوتی یا سراوتی، غالباً موجودہ شہر گورکھپور سے کوئی ستر میل اوپر (گویا نیپالی علاقے میں) واقع تھا۔ چھٹی صدی ق م میں

---

[1] لچھویوں کے متعلق ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ وہ نسلاً اہل تبت کے "منگولی" خاندان سے ہیں۔ ان کا اپنے مُردوں کو میدان میں ڈال دینا یا درختوں پر باندھ دینا، اور اسی طرح بعض جرائم کی سزائیں اہل تبت کے رسم و رواج سے مشابہ ہیں اور دیگر قرائن سے بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تصدیق ہوتی ہے، حتیٰ کہ ونسنٹ اسمتھ کے نزدیک "گمان غالب یہ ہے کہ لچھوی قوم کے قبیلۂ ساکی (ساکیا) کا مشہور منی گوتم بودھ "منگولی" (یا مغلیہ) نسل کا آدمی تھا!" (اوکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا سنہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۴۷)۔

یہ ہندوستان کے چھ بڑے شہروں میں گنا جاتا تھا اور گوتم بودھ کے بہت سے واقعات زندگی کا اس شہر سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اس کی جائے وقوع یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہوئی حالانکہ امید ہوتی ہے کہ وہاں بودھ مت والوں کی کچھ نہ کچھ پرانی یادگاریں اور کتبے ضرور زمین کے نیچے مدفون پڑے ہوں گے۔

(۹) لیکن زمانۂ تاریخی کی سب سے بڑی اور قوی سلطنت، دریائے گنگا کے نیچے اس علاقے میں قائم تھی جو آج کل بہار کے صوبے میں داخل ہے۔ غالباً اوّل اوّل اس کی مغربی حدِ فاصل سون ندی تھی اور جنوب میں بندھیاچل کے پہاڑوں کا وہ سلسلہ جو چھوٹے ناگپور میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن بعد میں اس نے بڑی قوت و وسعت حاصل کی اور ہماری تاریخ کے اس باب میں زیادہ تر اسی سلطنت کا ذکر آئے گا۔[1] ۱۰

دوسری فصل ۔ مگدھ کی سلطنت کا پہلا دور

اوّل اوّل یہ بہت چھوٹی ریاست تھی اور تاریخی زمانے میں یہاں سب سے پہلے سیس ناگ راجہ کا خاندان فرماں روائی کرتا تھا لیکن ساتویں اور چھٹی صدی ق م میں جو ہندوستان کے عقلی تلاطم اور دماغی تگ و دَو کا گویا پہلا تاریخی دَور ہے۔ ذہنی ترقی کا تمدن و سیاسیات پر اثر پڑنا لازمی بات تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اہلِ ہند کے افکار میں اسی ہیجان کی تحریری شہادتیں باقی ہیں جن کے طفیل ہم اس عہد کے سیاسی حالات کا کچھ سراغ چلا سکے ورنہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، خاص اس موضوع (تاریخ) پر ہندوستان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

[1] مذکورۂ بالا نو ریاستوں کے علاوہ بودھوں کی روایات اور پرانوں میں اور سات ریاستوں یا خود مختار قوموں کا نام بھی آیا ہے اور یہ قدیم فہرست کل سولہ ناموں پر مشتمل ہے۔ لیکن جن قوموں کا دائرۂ حکومت بہت تنگ تھا یا جو دوسری ریاستوں کی ماتحت بن گئیں، انھیں ہم نے نظر انداز کر دیا۔ ۱۲

باب ۲

بم بسار راجہ

بہر حال بانیٔ خاندان کے نام کے بعد مگدھ کا سب سے پہلا راجہ جس کے حالات ہم تک پہنچے، بم بسار ہے جو اپنے مورثِ اعلیٰ سیس ناگ کی پانچویں پشت میں تھا۔ اپنے پایۂ تخت کو مستحکم کرنے کے بعد اسی نے ملک ستانی پر کمر باندھی اور انگا کی ریاست کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا (یہ چھوٹی سی ریاست مگدھ کے ہمسایے میں قریب قریب اسی علاقے میں تھی جسے اب ضلع بھاگلپور کہتے ہیں) پھر بم بسار نے کوسل کی راج کماری سے شادی کی اور دوسرا بیاہ لچھویوں کے طاقتور قبیلے میں کیا جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہوا، اور بودھوں کی روایت کے بہ موجب اسے خود اس کے بیٹے اجاتسترو نے مار کر بادشاہی لی، تو مگدھ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ طاقتور سلطنت بن گئی تھی۔ بم بسار کے متعلق[1] اتنا معلوم ہے کہ اس نے اٹھائیس برس راج کیا لیکن اس کی تخت نشینی (۵۸۲ق م) اور موت (۵۵۴ق م) کے سنہ قیاسی ہیں اور بیٹے کے ہاتھ سے مارا جانا بھی کسی قدر مشتبہ یا کم سے کم مبالغہ آمیز روایات پر مبنی ہے کیونکہ اول تو اجاتسترو کی ماں وردھمان مہابیر (Varadhamana Mahavira) کی رشتہ دار تھی اور یہ شخص جین مت کا بانی اور اس لیے گوتم بودھ کا حریف و ہم عصر گزرا ہے۔ دوسری روایتوں میں (پدر کشی) کے جرم قبیح کا اغوا کرنے والا دیودت کو بتایا گیا ہے جو گوتم کا عزیز قریب اور آخر میں سخت مخالف ہو گیا تھا چنانچہ اس نے بودھ مت کے توڑ پر ایک مذہبی فرقے کی بنا ڈالی تھی جو ساتویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں موجود رہا۔

اجاتسترو

مذکورۂ بالا روایات میں اسی (پدر کشی) کو اجاتسترو[2] (Ajatasautr) کی پہلی جنگ کا

---

[1] یہ اور اس باب کے تمام سنین اوکسفورڈ ہسٹری اوف انڈیا مطبوعہ ۱۹۱۹ء کی تازہ ترین تحقیقات کے مطابق صحیح کر لیے گئے ہیں اور ان میں پہلے کی تمام انگریزی تاریخوں سے فرق ہے۔ مولف

[2] اس کتاب میں ہم نے ہندی کا آسان تلفظ اختیار کیا ہے اور کہیں کہیں اصلی یا سنسکرت تلفظ انگریزی (رومن) حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ اسے پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ ۱۲

باب ۲

سبب قرار دیا گیا ہے۔ یہ جنگ کوسل کے راجہ سے ہوئی تھی جس کی بہن مقتول بمبسار کی رانی، یعنی اجاتستر کی سوتیلی ماں تھی اور اپنے شوہر ہی کے غم میں جان سے گزر گئی۔ کوسل کا راجہ بہن اور بہنوئی کا انتقام لینے کے لیے آمادۂ جنگ ہوا لیکن مدت دراز کی کشمکش کے بعد قرینہ کہتا ہے کہ غلبہ مگدھ کے نوجوان راجہ کو حاصل ہوا، اور کوسل کے بوڑھے فرماں روا کو دب کر صلح کرنی پڑی۔ اس قدر تو روایتوں میں بھی تحریر ہے کہ ۱۰
اس نے اپنے شاہی خاندان کی بیٹی اجاتستر کو بیاہ دی تھی لیکن بعد کی تحریروں میں کوسل کی سلطنت کا کوئی ذکر نہیں آتا، اور چوتھی صدی ق م میں یہ تمام ملک مگدھ کی سلطنت کا جزو نظر آتا ہے۔ پس یہ نتیجہ بعید از عقل نہیں کہ اسی جنگ نے کوسل کی قوت توڑی اور مگدھ کو اس کا جانشین، یعنی قدیم ہند کی سب سے قوی سلطنت بنا دیا۔ اجاتستر کی آیندہ مہمات بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تائید کرتی ہیں کہ اپنے سوتیلے نانا پر فتح پا کر وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور گنگا اتر کر شمال میں لچھویوں پر چڑھائی کر رہا تھا جن کی فوجی قوت اور ثروت کی ان دنوں بڑی دھاک تھی۔ یہ آزاد اور جنگجو قبائل بھی مگدھ کے نوخیز فاتح کا حملہ نہ روک سکے اور اجاتستر نے ان کا صدر مقام ویسالی چھین لیا۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجاتستر کی ماں یہیں کے راجہ **چیتنا** کی بیٹی تھی۔ لہذا کچھ عجب نہیں کہ یہ ننھیالی رشتہ بھی ملک پر قابض ہونے میں کارآمد ثابت ہوا ہو۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ اجاتستر نے مگدھ کا علاقہ کوہستان ہمالہ کے دامن تک وسیع کر دیا تھا، اور انھی شمالی مقبوضات کی حفاظت کے لیے سون اور گنگا کے سنگم کے پاس وہ جنگی قلعہ بنایا تھا جس کے گرد بعد میں پاٹلی پتر نامی قدیم ہند کا سب سے مشہور شہر آباد ہوا۔

اجاتستر کے جانشین

اقبال مند اجاتستر نے غالباً ۵۲۷ ق م میں وفات پائی اور گو خود اس کی اولاد میں کوئی ایسا اولوالعزم راجہ نہ ہوا کہ مگدھ کی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتا، تاہم جو قوت و عظمت اس مشرقی سلطنت نے اجاتستر کے عہد میں حاصل کر لی تھی وہ بعد میں بھی کم نہ ہوئی اور اسی ملک کے وارث ہونے کے بعد موریا خاندان کے راجاؤں کو تمام ہند کے فتح کرنے کے ولولے پیدا ہوئے۔

گو موریا خاندان کا ذکر اپنی جگہ پر آگے آئے گا۔ یہاں ہمیں اجاتستر کے

باب ۲

ان جانشینوں کے نام گنا دینے چاہئیں جو قیاساً ۴۱۳ ق م تک مگدھ میں بادشاہی کرتے رہے۔ ان میں پہلے دو، یعنی **درسک** (Darsaka) اور **اُدے** (Udaya) کے کچھ حالات ملتے بھی ہیں لیکن ان کے بعد کے دو جانشینوں کا محض نام ہی نام باقی ہے۔ یعنی **نندی وردھن** اور اس کا بیٹا **مہانندن**۔ اور وہ راجہ نند جو نند خاندان کا بانی سمجھا جاتا ہے ایک نیچ ذات کی عورت سے اسی مہانندن کا بیٹا تھا۔ کم نسل ہونے کی وجہ سے وہ مسندِ شاہی کا جائز وارث نہ تھا، اسی لیے جب اس نے کسی طرح راج پر اپنا قبضہ جما لیا تو "سیس ناگ خاندان" کا بھی کہنا چاہیئے کہ خاتمہ ہو گیا، اور **نند** (Nanda) **خاندان** کی حکومت شروع ہوئی (قیاساً ۴۱۳ ق م)۔

نند خاندان

اس خاندان کے متعلق پرانوں میں جا بہ جا گردشِ زمانہ کی شکایت ملتی ہے کہ آسمان کی سفلہ پروری نے "چھتریوں" کی بجائے "شودروں" کو تختِ حکومت پر لا بٹھایا۔ لیکن اس کے بادشاہوں کے ٹھیک نام اور واقعات کا کچھ پتا نہیں چلتا، تاہم اس بات کی بعض شہادتیں موجود ہیں کہ گو اس خاندان کے راجہ برہمنوں کے دشمن اور غالباً اپنی رعایا میں غیر ہر دل عزیز تھے[1]۔ لیکن فوجی قوت کی ان کے پاس کمی نہ تھی اور ان کا تموّل ضرب المثل ہو گیا تھا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے تو اس وقت بھی اسی خاندان کا کوئی راجہ مگدھ پر حکومت کرتا تھا۔ یونانی مصنفوں نے اس کا نام "زندرامس" بتایا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اصلی نام کیا تھا۔ قدیم یونانی نام بگاڑنے میں سخت بد نام ہیں مگر زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں سنی سنائی اور بے ربط باتوں کے سوا کوئی ایسی روایت بھی ان کو نہیں ملی جس سے نند خاندان کی تاریخ کا سراغ لگانے میں ہمیں مدد ملتی۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ خبر دینے والوں نے سکندر سے جن الفاظ میں مگدھ کی زبردست فوج کا بیان کیا تھا اسے سُن کر مقدونیہ کے

---

[1] برہمنوں یا ہندوؤں کو اس خاندانِ شاہی سے جو نفرت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے سمت سے وہ نوّے برس کم کر دیے جن میں نند خاندان کے راجہ برسرِ حکومت رہے۔ سنین کے اسی طرزِ شمار کو "نند" (یعنی نند کے علاوہ) کہتے ہیں۔ دیکھو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۷۔

تھکے ہارے سپاہی اور بھی بددل ہوئے، اور انھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔

الغرض جو بُری بھلی شہادتیں ملتی ہیں انھیں جوڑ کر جدید اہلِ تحقیق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس خاندان کے نو راجہ نوّے یا اکانوے برس تک فرماں روائی کرتے رہے اور غالباً[1] ۳۲۲ق م میں انھی کے ایک رشتہ دار (چندر گپت) نے نند خاندان کے آخری تاجدار کو معزول کرکے سلطنت پر قبضہ کرلیا، اور اُس خاندانِ شاہی کی ابتدا ہوئی جو "موریا" کہلاتا ہے۔ ۱۰

مگدھ کی تاریخ کو یہاں تک لکھنے کے بعد، مناسب ہوگا کہ موریا خاندان، یا سلطنتِ مگدھ کے آیندہ فروغ کا ذکر، ہم سکندرِ اعظم کے حملے کے بعد کریں، اور اِس فصل میں وہ واقعات ایزاد کردیں جو پانچویں صدی ق م میں ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں گزرے اور ان کا حوالہ ہمارے دیسی یا بدیسی ماخذوں میں باقی رہ گیا۔

ایرانی فتوحات

دارائے گشتاسپ (یا اسفندار) کے کتبے کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ اس میں یہ ایرانی شہنشاہ اپنے مقبوضات میں "ہندوستان" کا نام بھی شمار کرتا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کے لشکرِ گراں میں ہندی تیراندازوں کا بھی ایک دستہ شامل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں نے اوّل اوّل سندھ اور پنجاب کے حالات دریافت کرنے کی غرض سے ایک بحری مُہم روانہ کی تھی اور پھر یہ تمام علاقہ فتح کرکے، اسے دولت ایران کا ایک صوبہ یا ست راپی بنالیا تھا، جس کی سالانہ آمدنی تین سو ساٹھ تیلنت یعنی آج کل کی دس لاکھ انگریزی اشرفی کے برابر ہوتی تھی۔ اِس کی حدود کا ٹھیک پتا نہیں چلتا مگر یہ واضح رہے کہ یہ ست راپی آیریہ (یعنی موجودہ ہرات) اراکوسیہ (یعنی صوبۂ قندھار) اور گندھارا (یعنی شمال مغربی پنجاب) کے علاوہ تھی اور اس لیے موجودہ ملکِ سندھ اور شاید پنجاب کا وہ حصہ اس میں شامل تھا جو

[1] - برہمنوں کے لعن طعن اور دیگر شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آخری نند راجہ بودھ یا جین مت کا پیرو تھا۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحۂ ۵۹۔

باب

آج کل قسمت ملتان میں داخل ہے۔[1]

تیسری فصل۔ تمدن اور معاشی حالات

شہر اور عمارات

مگدھ کے پائے تخت "راج گاہ" (یا راج گرہہ) کے قریب گِری بَج نامی ایک مضبوط پہاڑی قلعہ تھا، اور چھٹی صدی ق م کی پتھر کی عمارتوں میں سے اگر کسی کے کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں تو وہ اسی قلعے کے جس کا دَور ساڑھے چار میل کے قریب تھا۔ قدیم کتابوں سے مستحکم برج وحصار اور شہر پناہ کے عالی شان دروازوں کا سراغ ملتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فصیلوں کے گرد مُسں اور پھر چوڑی چوڑی خندقیں بنائی جاتی تھیں۔ لیکن غالباً یہ شہر کے اندرونی قلعوں کا بیان ہے جن میں شاہی محل اور قلعے کی فوج رہتی ہوگی۔ پروفیسر رہس ڈیوڈ (جس کی کتاب بدھسٹ انڈیا کے بعض ابواب سے ہم نے اس فصل کے لکھنے میں استفادہ کیا ہے) کا خیال ہے کہ شہر کی اصلی آبادی لوگوں کے مکانات اور بازار ان قلعوں کے باہر ہوتے تھے اور ہندوستان کے بعض پُرانے قصبوں میں آج بھی آبادی کا یہی نمونہ موجود ہے۔ چوتھی صدی ق م میں شاہی عمارات کی جو صورت ہوتی تھی، اس کا یونانی سفیر مگاس تھنیز نے تفصیل سے حال بیان کیا ہے اور اس کا ضروری خلاصہ ہم اپنی پہلی جلد میں لکھ آئے ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں راجہ مہاراجوں کے محلات کے بجائے عوام الناس کے مکانات کا مطالعہ کرنا ہے تاکہ اس عہد کی معاشرت کا ٹھیک اندازہ ہو سکے۔

---

[1] داریوش کے ایرانی عہدہ دار ہی اس علاقے میں ممالک شام وعراق (قدیم ارام) کی طرز تحریر لائے تھے، جسے "ارامی" کہتے ہیں اور وہی مقامی تغیر وتبدل سے "خرشتی" تحریر بن گئی جس کے بہت سے کتبے گندھارو خُتن میں دستیاب ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے جو طرز تحریر (براہمی) مُروج ہوئی وہ بھی انھی سامی ممالک سے یہاں آئی تھی اور پُرانی دیوناگری کے حروف اسی کی ترقی یافتہ صورت ہیں۔ (انسائی کلو۔ جلد اوّل صفحہ ۷۳۱)۔

باب ۳

ہماری اس معلومات کا ماخذ بیشتر وہ مذہبی کتب و روایات ہوں گی جن میں ضمناً شہر اور شہر کے مکانات کا ذکر آگیا ہے۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں شہر صرف ذاتی مکانات و دکانات کا مجموعہ ہوتا تھا اور اس قسم کی عمارتیں شاذ و نادر ہی نظر آتی تھیں جنھیں لوگوں کا مالِ مشترک سمجھا جائے۔
۱۰ مناور و معابد کا ابھی تک رواج نہ تھا اور سرکاری کاروبار راجہ کے محل میں انجام پاتے تھے۔ ان کے لیے نہ کوئی دفتر ہوتا تھا نہ کچہری۔ البتہ بالعموم بعض چوراہوں پر یا شہر کے باہر اس قسم کے "آنگ سمسان" یا "تُھیوتھکا" کے گنبد بننے لگے تھے جن میں کسی مشہور آدمی کی راکھ یا "بھسمی" دفن ہوتی تھی اور گو ایسی کسی عمارت کے کھنڈر بھی اس حالت میں باقی نہیں ہیں کہ ان کا کوئی صحیح خاکہ پیش کیا جا سکے تاہم اتنا پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات یہ گنبد بہت بڑے بنائے جاتے تھے اور ان میں پتھر یا اینٹ بھی لگائی جانے لگی تھی۔ لیکن یہ مسالا اس زمانے میں عام طور پر استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ رہنے کے مکانات لکڑی سے بنائے جاتے تھے اور ان کے اندر باہر چونے کا صندلا کر دیا جاتا تھا اور نقاشی اور مصوری کی جاتی تھی جس کے بعض لاجواب نمونے گواہی دیتے ہیں کہ ان دنوں ہندوستان میں یہ فن بہت کچھ ترقی کر گیا تھا۔

مکانات کا عام طرز

آج کل انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ہم وطن ایسے مکانات بناتے ہیں کہ بیچ میں رہنے کی عمارت، اور ادھر اُدھر صحن ہوتا ہے۔ دراصل یہ مسلمانوں کے باغ اور بارہ دری کی نقل ہے ورنہ سکونت کے مکانوں کا عام نقشہ جو اس ملک میں بہت قدیم سے چلا آتا ہے، یہی ہے کہ چاروں طرف مکان اور بیچ میں صحن رکھتے ہیں یہی طرز چھٹی صدی ق م میں تھی اور عام طور پر دو منزلہ مکانات بنائے جاتے تھے جن کی کھڑکیاں باہر گلی یا بازار میں کھلتی تھیں۔ عوام الناس اور غریبوں کے مکان خس پوش اور یک منزلہ ہوتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں شہر میں کثرت اسی قسم کے مکانات یا چھپروں کی ہوتی تھی۔

معاشی حالت

لیکن اس بات کے تحریری ثبوت موجود ہیں کہ ان "تنگ و بود امکانوں" کے رہنے والے بھی معاش کے اعتبار سے مطمئن اور آسودہ حال تھے۔ ہندوستان زرعی ملک ہے اور اس زمانے میں بھی یہاں کی زیادہ آبادی دیہات میں

رہتی اور زراعت پر گزارہ کرتی تھی۔ کاشت کے لیے زمین کی کچھ کمی نہ تھی اور جہاں تک معلوم ہوا، نہ صرف کسان بلکہ چرواہے اور گلہ بان بھی ان دنوں آزادی اور بکمال فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مزدوری کا پیشہ یعنی اُجرت پر دوسرے کی خدمت کرنا موجب ننگ اور بدنصیبی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لونڈی غلاموں کا پرانی کتابوں میں جا بہ جا ذکر آتا ہے، لیکن قرائن کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر بڑے اُمرا کے پاس شہروں میں ہوتے تھے اور غالباً ہند کی قدیم دراوڑی نسل کے افراد تھے۔

شمالی ہند کے شہروں کا شمار چودہ، پندرہ یا اس کے قریب قریب تھا اور اگرچہ اُن کی آبادی کا تخمینہ محال ہے اور اُس زمانے کے شہر اور قصبے میں امتیاز کرنے کا کوئی عمدہ ذریعہ نہیں، تاہم بعض شہر بہت بارونق اور آباد تھے اور اُن میں متمول سوداگر بستے تھے جن کا تجارتی مال بیل گاڑی میں یا کبھی کبھی کشتیوں پر دُور دُور تک آتا جاتا تھا۔ راہ داری کے محصولات اس زمانے میں ایسے سخت تھے کہ صرف قیمتی اشیا ہی کی درآمد برآمد ممکن تھی۔ دوسرے نہ سڑکیں تھیں نہ اس قدر آبادی کہ مال کا بہ حفاظت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا آسان ہو۔ راستے کی حفاظت کے واسطے خود سوداگروں کو سپاہی ساتھ کرنے پڑتے تھے[۱] اور انھی بالائی مصارف کے باعث تجارت کا مال صرف ریشمی باریک سوتی یا کام دار کپڑے اور زیورات پر مشتمل ہوتا تھا۔

صناعات اور اہل حرفہ

لباس، زیورات اور ظروف کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ق م میں اہلِ ہند خاصے دستکار ہو گئے تھے۔ مثال کے طور پر خود ہمارے زمانے کی دیہاتی معاشرت میں دیہاتیوں کو جس قسم کے لباس اور اسباب تکلفات کی ضرورت پڑتی ہے وہ اُس وقت بھی غالباً کوسمبی یا بنارس کے بازاروں میں فراہم ہو سکتے تھے۔ اِن قدیم صنعتوں (خاص کر زیورات) کے جو نمونے موجود ہیں وہ کچھ بہت بھدے نہیں اور اس زمانے کی دیہاتی صنعتوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم

[۱] سکہ بھی ابھی تک سرکاری طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ البتہ خود سوداگروں کے ڈھالے ہوئے مسی سکے اور ہنڈیاں عام طور پر چلتی تھیں۔

باب ۴

ہوتا ہے کہ ہمارا قدامت پرست ملک آج بھی ضروریاتِ تمدن اور ذوقِ آرائش کے اعتبار سے قریب قریب اسی عالم میں ہے جس میں ڈھائی ہزار برس پہلے مگن تھا۔

پیشہ ور سپاہی اور سرکاری ملازمت کرنے والوں کو چھوڑ کر اہلِ حرفہ کی دس بارہ قسمیں بتائی گئی ہیں، فیلبان، رتھ بان، دھوبی، حجام ان کے علاوہ ہیں، ان پیشہ وروں کی اسی زمانے میں باقاعدہ ذاتیں بن گئی تھیں بلکہ شہر کے اندر، یا بیرونی علاقے میں ان کی ہر برادری گویا ایک چھوٹی سی قوم ہوتی تھی جو اپنے معاملات اور قضیئے خود چکاتی اور گاؤں[1] کی پنچایتوں کی طرح اپنے برادری والوں کو سزا دینے کی مجاز تھی۔ برادری کے چودھری یا مکھیا بہت معزز مانے جاتے تھے اور بعض اوقات خود راجہ کے دربار میں ان کا بڑا رسوخ ہوتا تھا۔

ذات ورنگ کا امتیاز

اوپر کے بیان کو پڑھ کر یہ بات از خود ذہن میں آجاتی ہے کہ ہندوستان میں اس ذات بندی کا بیج اسی وقت پڑ چکا تھا، جسے آج کل اکثر مصلحین قومی اتحاد کا سب سے سخت دشمن جانتے ہیں؛ چھتری، برہمن، ویش اور شودر کی تقسیم اگرچہ عملی طور پر مکمل نہیں ہوئی تھی اور نہ ان چاروں گروہوں کا مرتبہ اتنی پختگی سے معین ہو سکا تھا، جیسا کہ چند صدی بعد نظر آتا ہے، تاہم یہ امتیازی نام قدیم سے قدیم ہندوستانی کتابوں میں موجود ہے، اور سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دورِ قدیم میں اس تقسیم کی بنیاد رنگ اور نسب پر تھی یعنی جو لوگ زیادہ گورے اور صاف رنگ کے تھے، نیز جن کا سات پشت تک نسب معلوم اور بے داغ ہوتا تھا، وہ سب سے شریف اور اعلیٰ ذات کے لوگ مانے جاتے تھے، اور دوسرا درجہ اس برہمن یا پجاری کا تھا جس کے خاندان میں پوجا پاٹ کا پیشہ موروثی ہو۔ دوسرے لفظوں میں، چھٹی صدی تک برہمنوں کو اولیت کا مرتبہ حاصل نہ ہوا تھا اور سب سے اعلیٰ ذات چھتریوں کی تھی جس کے یہی معنی ہیں کہ ابھی تک آریوں میں جنگ و جدال اور انتظامی قابلیت کی قدر و قیمت زیادہ تھی اور مذہبی پیشواؤں کا تسلط پوری طرح قائم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جیسا کہ بعد کی شہادتوں سے

[1] خود گاؤں کی آبادی اس زمانے میں ایک برادری یا ایک خاندان کے افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔

باب ۲

ثابت ہوتا ہے۔ خود ریاضت و خدا طلبی اور ذہانت و فکرِ حکیمانہ میں بھی برہمن اُن سے افضل نہ تھے۔

متوسط اور ادنیٰ ذاتیں

چھتری اور برہمنوں کے بعد تاجر، اور آزاد کسانوں کا گروہ یعنی آبادی کا متوسط طبقہ "ویش" کہلاتا تھا اور اہل حرفہ یا مزدوری کرنے والے "شودروں" کے آخری گروہ میں داخل تھے جو بالعموم کالے رنگ کے غیر آریا لوگ تھے۔ پروفیسر رہس ڈیوڈ لکھتے ہیں[۱] کہ ان چار ذاتوں کے نیچے بھی چند اور ذاتیں تھیں اور ٹوکری بُننے، چڑیمار، نائی، کمہار، جلاہے، چمار وغیرہ ادنیٰ پیشہ وروں کا شمار ان میں ہوتا تھا اور رذیل اور قابل نفرت ہونے کے لحاظ سے سب سے آخری درجہ چنڈال اور پکّس کا تھا جو ہند کے قدیم اور اصلی باشندے تھے۔ مگر اس اعتبار سے کہ یہ "شودر" اور چنڈال بھی آزاد تھے، آبادی کا سب سے پست اور بدنصیب گروہ ان غلاموں کو کہنا چاہیئے جو کسی جنگ یا تاخت میں گرفتار ہوئے یا کسی جرم کی سزا میں اُن کی آزادی چھین لی گئی۔ ان غلاموں کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی اور وہ اپنے آقا کی مِلک بن جاتے تھے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ممالکِ ایشیا میں غلاموں پر وہ جور و ظلم کسی قوم نے جایز نہیں رکھے جو یونان یا روما کی قدیم تاریخ میں ہماری نظر سے گزرتے ہیں، نرمی کی وجہ اہلِ ایشیا کی ثروت و استغنا ہو یا غلاموں کی بہتات۔ اس میں شک نہیں کہ ان مُلکوں میں غلاموں کے ساتھ معمولی نوکروں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ دوسرے جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں غلاموں کی تعداد بھی غالباً بہت کم تھی۔

---

[۱] بدھسٹ انڈیا، صفحہ ۵۴۔ لیکن اس رائے کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ مبادا فاضل پروفیسر کو "ہین جات" کے لفظ نے مغالطے میں ڈالا ہو، جو اب بھی بعض ادنیٰ پیشہ وروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ انھیں "شودروں" سے کم رتبہ سمجھا جائے۔ ۱۲

باب ۵

پہلی فصل - مذہبی معتقدات

بودھ مت کی قدیم کتاب "دیگھ" نامی میں ایک نظم محفوظ ہے جس میں شاعر گوتم بودھ کی مدح وثنا کرتا ہے اور اسی ضمن میں ہندوستان کے اُن دیوی دیوتاؤں کو گنواتا ہے جو اُس کے ممدوح کے سامنے سرِ عقیدت خم کرنے حاضر ہوئے۔ مورخ کی نگاہ میں ارادت مند شاعر کی یہ فہرست بہت کارآمد ہے کیونکہ اس سے یہ سراغ چل سکتا ہے کہ اس وقت (پانچویں صدی ق م) ہندوستان میں کن کن دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔

قدیم معبود — اس فہرست میں سب سے اول دھرتی ماتا اور پہاڑوں کی دیویاں آتی ہیں اور اس کے بعد چار سمتوں کے چار بادشاہ (یا دیوتا) پھر گندھرو یعنی آسمانی مطرب پھر ناگ دیوتا، جن کی بہت سی قسمیں تھیں۔ پھر گرول دیوتا یعنی انسان چہرہ پرند جو ناگوں کے دشمن مانے جاتے تھے۔ پھر عفریتوں کا ایک گروہ، جن کی پوجا ہوتی تھی اور چاند، سورج، آندھی، بادل، روشنی، گرمی کی دیویاں وغیرہا۔ اور آخر میں اُن دیوتاؤں کا نام ہے جو بہت سی صفات سے متصف مانے جاتے تھے جیسے برہما، پرمت وغیرہ۔

اس طویل فہرست میں "رگھ دیوتاؤں" کا نام نہیں آیا لیکن دیگر

باب ۳

ذرائع سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ چھٹی (اور نیز پانچویں) صدی ق م میں بہت سے درختوں کی پوجا ہوتی تھی اور ان کی نشو و نما اور ہریاول کا سبب ہی ان کے اندر کسی روح یا آتما کو مانا جاتا تھا، جس کے چولا بدلتے ہی درخت کی عمر بھی تمام ہو جاتی اور وہ سوکھ کر گر پڑتا تھا۔ اس فرو گزاشت سے قطع نظر، خاص طور پر قابلِ غور یہ امر ہے کہ اس فہرست میں رگ وید کے سب سے قدیم اور بڑے دیوتاؤں (یعنی اِندر، اگنی، وایو اور ورن) کا کچھ ذکر نہیں حالانکہ بہت سے ایسے معبودوں کا نام ملتا ہے جن کا ویدوں میں نام تک نہیں آیا۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ (جس کی اور طرح بھی تصدیق ہوتی ہے) نکالنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ ہندوستان کے باشندوں میں ابھی تک بڑا گروہ آریوں کے خاص خاص دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا بلکہ ایسے معبودوں کی پوجا کرتا تھا جن سے خالص آریا اول اول واقف نہ تھے۔

آریوں کے عقاید

مذہب کی اس دورنگی کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ہندوستان کے آریا فاتح خاص یہاں کے باشندے نہ تھے بلکہ غالباً دوسرے ہزار ق م کے دَور میں باہر سے آئے اور اپنے مذہب کے بنیادی عقائد اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ رگ وید کے سب سے پُرانے بھجن جن دیوتاؤں کی مدح و ثنا کرتے ہیں اُن کا قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتاب اَوِستا میں بھی ذکر موجود ہے۔ لیکن ہندوستان میں آنے کے بعد اُن عقائد میں بہت کچھ تغیر ہو گیا تھا، خاص جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت بہ ظاہر ان کے رِشی یا اہلِ فکر مسئلۂ "وحدت فی الکثرت" کی منزل تک پہنچ چکے تھے جس کا خود رگ وید کے آخری زمانے کے بھجنوں نے کم سے کم راستہ دکھا دیا تھا۔ لیکن رگ وید یا اس کے وہ تفسیری اُپنشد جو بودھ مت کے آغاز سے پہلے کے ہیں، مذکورۂ بالا مسئلے کا حل اس طرح کرتے ہیں کہ اگنی کو جو حرارت و نور و رطوبت کا مبداء ہے، تمام دیوتاؤں کو دیوتا بتاتے ہیں[1] اور سب دیوتاؤں میں اسی کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ کائنات کی ہر شے میں ظاہر یا باطن

[1] چنانچہ ایک بھجن کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ "سب دیوتا اگنی ہے"! مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو "ویدک انڈیا" کا آخری باب۔ ۱۲

وہ موجود ہے اور تمام حرکت و حیات اسی سے ہے۔ بایں ہمہ یہ باتیں کچھ ایسے شاعرانہ پیرائے میں کہی گئی ہیں کہ غالباً رگ وید کے ماننے والوں نے کبھی اگنی کو "خدائے واحد" نہیں سمجھا اور نہ اُس کی اُن صفات کی پوری طرح صراحت ہوئی جن سے اس کی "ربوبیت" کا مفہوم صاف ہو جاتا، اور نہ دوسرے دیوتاؤں کے "اپنی اپنی جگہ پر" اختیارِ مطلق میں کوئی کمی آئی کہ لوگ ان کی پرستش چھوڑ کر ایک خالقِ کل یا فاعلِ حقیقی سے لَو لگاتے۔ ممکن ہے کہ اس نارسائی کا سبب عقولِ انسانی کی خامی ہو۔ ممکن ہے کہ خود وید کی مجموعی تعلیم ہی شرک فی العبادت یا ارباب پرستی (Polytheism) کی تقویت کا باعث ہوئی ہو۔ کیونکہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ رگ وید میں زیرِ بحث قسم کی توحید بھی نہ تو ہر جگہ ہے اور نہ اسے صفائی کے ساتھ زور دے کے بیان کیا گیا ہے۔

قربانی اور ریاضت

بہر حال، یہ دو سبب ہوں یا ان کے سوا اور، ہمارے زیرِ نظر عہد میں اہلِ ہند متعدد خدا مانتے تھے اور ان کی پرستش کے واسطے مندر نہیں تھے۔ نہ غالباً ابھی بُت تراشی کا آغاز ہوا تھا، بلکہ کھیت یا باغ میں وقت کے وقت "قربان گاہ" بنا لی جاتی تھی اور مالکِ زمین یا صاحبِ خانہ کی طرف سے پروہت دیوتا کے نام پر جانوروں کی بھیٹ دیتا اور دعائے خیر مانگتا تھا۔ اس بھیٹ کا فائدہ (یا ثواب) ان کے عقیدے میں صرف مالکِ زمین کو پہنچتا تھا اور دیگر مصارفِ قربانی کے علاوہ اسے پروہتوں کو بہت معقول معاوضہ دینا پڑتا تھا۔ قرینہ کہتا ہے کہ اول اول اسی شرط اور برہمنوں کی زیادہ طلبی نے لوگوں کو، قربانی کی رسم سے بد دل کیا اور عجب نہیں کہ تہی دستی کی وجہ سے وہ برہمنوں کی شرایط نہ پوری کر سکے ہوں تو حصولِ مراد یا کفارۂ گناہ کے لیے اپنے کسی معبود کے پیکرِ خیالی کے روبرو گڑگڑائے ہوں اور تنہائی میں رو رو کر دعائیں کرنے لگے ہوں! قربانی سے محروم، شکستہ دل اہلِ طلب کی یہی خلوت گزینی، بظاہر عبادت کے دو قدیم طریقوں کی تمہید تھی یعنی اسی شے نے ایک طرف جذبۂ بت تراشی کی پرورش کی اور دوسری طرف ریاضتِ شاقہ میں اطمینانِ نفس کا سامان پیدا کر دیا۔ پہلا موضوع خارج از بحث ہے کیونکہ یہاں ہمیں صرف اس دلچسپ واقعے پر توجہ دلانا منظور ہے کہ رفتہ رفتہ بھیٹ اور بھیٹ چڑھانے والے تپسیا (ریاضت) سے مغلوب ہو گئے اور

باب ۵

خود برہما کے مصنف پکار اُٹھے کہ آسمان ہوا پر، ہوا زمین پر، زمین سمندروں پر قائم ہے، اور پانی کا قیام صداقت پر ہے، صداقت کا (قربانی کے) منتروں پر اور خود منتروں کی بنیاد تپس پر ہے۔" (چھٹی برہمنا[1] ۱/۱۳)۔

واضح رہے کہ وید کی وہ شرحیں برہمنا کے نام سے موسوم ہیں خود برہمنوں ہی کی تصنیف سے ہیں اور ان میں قربانی کی رسموں اور منتروں کا ذکر ہے، جو گویا ویدی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے پڑھے جاتے تھے۔ اور جب انھی میں تپس یا تپسیا کی فوقیت مان لی گئی ہو تو پھر خیال ہوتا ہے کہ بھینٹ کا حامی کوئی نہ رہا ہوگا۔ اس میں تو شک نہیں کہ ادنیٰ اور اعلیٰ ہر قسم کے آریوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا تھا جس کی نگاہ میں بھینٹ پوجا کی کوئی وقعت نہ رہی تھی اور اس گروہ کے افراد ذہانت اور اخلاق میں برہمنوں پر ایسی نمایاں برتری رکھتے تھے کہ نہ صرف عوام الناس بلکہ خود برہمنوں کو یہ فوقیت تسلیم کرنی پڑتی تھی حتیٰ کہ بعض برہمن خود بھی انھی تپسویوں کے کلی یا جزوی طور پر ہم خیال ہو جاتے تھے۔ اور اسی قسم کے برہمنوں نے تپس کی وہ بڑائیاں کی ہیں جن کا ایک نمونہ اوپر نقل ہوا۔ بایں ہمہ سارے برہمنوں کی یہ رائے نہ تھی۔ تپس کی وجہ سے اپنی کساد بازاری اور لوگوں میں تپسویوں کی عزت دیکھ دیکھ کر وہ حسد کرتے تھے مگر ان کا کچھ زور نہ چلتا تھا اور انھوں نے اپنی اور قربانی کی رسموں کی عظمت بحال کرنے کے لیے جو کچھ ہاتھ پاؤں مارے، اس میں بھی چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم اسی جد وجہد نے اپنشد کا ایک بڑا "فلسفہ روحانیات" تیار کر دیا۔

آتمان و پرماتمان

یہ روح کا مسئلہ ہے جس پر غور وخوض کرنے کا یہ بھی ایک سبب ہوا کہ برہمن اپنے پُراسرار منتروں کے باطنی اثرات سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے تاکہ اہلِ ریاضت کے مقابلے میں ان کو شکست فاش نصیب نہ ہو۔ انھوں نے اس بارے میں بیان کے نہایت دقیق پیرائے اختیار کیے ہیں اور اس میں جابجا تضاد و تخالف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر سادہ لفظوں میں ان کے اس عقیدے کا خلاصہ

۱۔ بدھسٹ انڈیا صفحہ ۲۵۲ و ۲۵۳۔

یہ ہے کہ ہر جسم کی حرکت وحیات کا باعث روح ہے جسے وہ کبھی اُن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کبھی بجلی کی چمک سے اور کبھی "نورِ بے دود" سے۔ اگرچہ اس کے اجزائے ترکیبی میں غیر مادّی صفات وخواص کے ساتھ ہم مادّی عناصر (خاک و آب) کے نام بھی پاتے ہیں۔ بہر حال وہ جس سے بھی بنی تھی اس کے متعلق دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں: اوّل تو یہ کہ بعض مقامات پر اپن شدوں میں یہ بات نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کی گئی ہے، کہ جذبات وشعور، روح کی خصوصیات میں ہیں اور جب (حالتِ خواب یا موت کے وقت) روح نکل جاتی ہے تو جسم انسانی اِن دونوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرا اور زیادہ اہم عقیدہ، جس سے اپن شدوں میں کہیں بھی اختلاف نہیں کیا گیا، یہ ہے کہ روح کو "آواگون" سے نہ تپسیا نجات دلا سکتی ہے نہ بھیٹ، بلکہ یہ مرتبہ اُسے صرف اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنی روح کو اُس "روحِ اعظم" کا جزو لاینفک محسوس کرنے لگے، جو تمام کائنات کی جان یعنی سب سے اعلیٰ روح **پرماتماں** ہے، ازل سے تھی اور ابد تک قائم رہے گی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اول ہی اول "آتماں" یا انسانی روح کا خیال پیدا ہوا تھا، اور جہاں تک تحقیقاتِ جدید کا دخل ہے یہی ثابت ہوتا ہے کہ "پرماتماں" کے عقیدے نے بعد میں تکمیل پائی جیسا کہ خود اس لفظ سے ثابت ہے (پرم = اعلیٰ + آتماں = روح) لیکن اس دقیق وہمہ گیر عقیدے تک پہنچنے کے بعد یہ قدرتی بات تھی کہ اِس "روحِ کائنات" اور اُن ہستیوں میں قریبی تعلق مانا جائے جو ذی روح (یعنی صاحب ارادہ) تسلیم کی جاتی تھیں، چنانچہ تمام دیوتا اور انسانوں کی روح کا مبداء اسی ہستی کبریٰ کو ماننے لگے خاص کر انسان کی روح کے متعلق یہ اعتقاد جم گیا کہ جسم خاکی میں وہی پرماتماں جلوہ گر ہے جس کی بہ دولت انسان، انسان بنا۔

مگر اس عظیم الشان تخیل کے اپن شدوں میں موجود ہونے سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیے کہ یہ فلسفہ برہمن یا پروہتوں کی سعیٔ فکر کا نتیجہ ہے۔ اِس کے برعکس، ہمارے پاس بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ گو برہمنوں نے "پرماتماں" کے عقیدے کو بودھ مت کے آغاز سے پہلے اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا،

بایں ہمہ وہ یا ان کے مقلد اس کے بانی نہ تھے بلکہ یہ دوسرے اہلِ فکر کا کام تھا شاید یہی وجہ ہے کہ جب خود اس (پرماتماں کے) عقیدے پر گفتگو شروع ہوئی تو برہمن اپنے مذہب کی کچھ اچھی وکالت نہ کرسکے اور دوسرے فلسفیوں نے اس عقیدے میں طرح طرح کے شاخسانے نکالے بلکہ آخر میں ایک گروہ (یعنی بودھ مت والوں) نے "رُوح" کا وجود ہی ماننے سے انکار کردیا۔

دوسری فصل ۔ جین مت

مختلف مذاہب

عالمِ افکار میں جس تلاطم کا ہم نے پہلی فصل میں اشارہ کیا ہے اس کا آغاز اِن جنگلوں میں ہوا جہاں حکیمانہ دماغ کے لوگ، دُنیا اور اہلِ دُنیا سے الگ ہوکر، "رازِ دہر" کی جستجو میں منہمک تھے۔ اس قسم کے راہبوں کا ہندوؤں کی قدیم سے قدیم کتاب میں ذکر موجود ہے۔ کم سے کم، پیشِ نظر زمانے میں رہبانیت ایک معروف طرزِ زندگی بن گئی تھی۔ آبادیوں سے کچھ ہٹ کر جابجا صحرانشیں راہبوں کے مسکن ہوتے جن میں کہیں استغراق و محویت اور کہیں خوف انگیز ریاضتوں کے منظر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن بہت سے راہب، ترکِ دُنیا کے باوجود باقاعدہ تعلیم کا مشغلہ رکھتے تھے اور حکمت و علومِ الٰہیہ کے سیکھنے والوں کا ان کے ہاں مجمع رہتا تھا۔ بے شبہہ اول اول اس درس و تدریس کا منشا وید کو حفظ کرانے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ درس کا میدان وسیع ہوا تو بحث و موشگافی کے ہزاروں پہلو نکل آئے اور اب استادوں کا صرف یہی کام نہ رہا کہ وید کے بھجن سُنادیں اور شاگردوں کو اچھی طرح یاد کرادیں، بلکہ انسان، خدا، اور آفرینش کے اہم مسائل پر بھی وہ بڑی بڑی تقریریں کرنے لگے اور اسی منزل میں پہنچ کر اُن میں لازمی طور پر بہت سے اختلافات پیدا ہوگئے۔ چنانچہ جس زمانے کا ہم ذکر کررہے ہیں، اس میں ایسے کئی گروہ یا مذاہب کا پتا چلتا ہے جس کے پیرو

معاش و معاد کے متعلق بالکل جداگانہ رائے رکھتے تھے۔ اِن کے باہمی مناظروں کی بھی بعض روایتیں محفوظ ہیں اور معلوم ہوتا ہے انھی نئے نئے خیالات کو پھیلانے کے جوش میں بہت سے راہبوں نے اپنی زاویہ نشینی چھوڑ کر سیاحت و جہاں گردی اختیار کرلی تھی اور انھیں "پرباجکا" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ عام طور پر آزاد خیال اور برہمنوں کی نظر میں مُلحد ہوتے تھے اس لیے "پرباجکا" میں تارک الدنیا جہاں گرد ہونے کے ساتھ ملحد ہونے کا مفہوم بھی شامل ہوگیا تھا۔[1]

اِس کتاب میں اِن سب گروہوں کے حالات و عقائد کا پتا لگانا بے محل طوالت کا موجب ہوگا کیونکہ اِن میں سے اکثر کا صرف نام ہی نام بعض پُرانی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے۔ البتہ اِس جگہ اِن دو مذہبوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے قدیم ہندوؤں کے تمدن و افکار پر اثر ڈالا اور جن کے نام لیوا اب تک ہند یا بیرونِ ہند میں موجود ہیں۔

ودھ مان، مہابیر کا مذہب

اِن دونوں میں تقدم جین مت کو حاصل ہے جس کا بانی **وردھ مان مہابیر جناتری پتر** (Vardhamana mahvira Jnatriputra) ہوا ہے۔ اِس نامور ہندی کے ذاتی حالات کو قدامت نے اِس قدر دُھندلا کردیا ہے کہ افسانہ و قصص کے انبار میں کوئی بات قابلِ اعتبار ملتی ہے تو وہ یہ کہ مہابیر **ویسالی** کا چھتری امیر زادہ تھا اور چھٹی صدی (ق م) کے آخر یا پانچویں صدی کے

اصول و عقائد

شروع میں انھوں نے مگدھ دیس ہی میں وفات پائی۔ بالفاظ دیگر وہ راجہ بمبسار اپنے نامی تر حریف گوتم بودھ کا نہ صرف ہمعصر گزرا ہے بلکہ اس کی زندگی بھی

[1] ۔ چونکہ یہ نئے گروہ زیادہ تر مگدھ یا اس کے شمال مغرب ہمسایہ علاقوں میں پیدا ہوئے تھے، جہاں کی آبادی خالص آریہ نسل کی نہ تھی لہٰذا وِنسنٹ اسمتھ کی یہ رائے بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ طبقے میں غیر قوم کے برہمن وہ مذہبی اقتدار نہ پاسکے جو انھیں اپنے ہم قوم آریوں میں حاصل تھا پس اُن کی دینی تعلیم اور عقائد سے یہاں کے آزاد خیال اُمراء (یا چھتریوں) نے انحراف کیا اور یہ دعویٰ نہ مانا کہ اِن اجنبی برہمنوں کے سوا کوئی علم و حکمت سے آشنا نہیں ہوسکتا نہ نجات حاصل کرسکتا ہے۔ (اوکسفورڈ ہسٹری مطبوعہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۴۹)۔

زیادہ تر اسی علاقے میں بسر ہوئی جو گوتم کا مولد و منشا تھا۔

لیکن مہابیر نے جو تعلیم دی وہ نہ صرف مختلف بلکہ ایک حد تک بودھ مت کی ضد ہے، اور اس کے مذہب کا بنیادی اصول ہی یہ تھا کہ ہر ذی حیات وغیر ذی حیات حتیٰ کہ باد و آتش میں بھی روح ہے (حالانکہ بودھ مت والے روح سے مطلق سروکار نہیں رکھتے) البتہ تپسیا کا وہ بھی ایسا ہی معتقد تھا جیساکہ اس کے دوسرے معاصرین چنانچہ اس کا یہ قول مشہور ہے کہ جسم کو مغلوب کر، اپنے نفس کو مار اور اپنے آپ کو اس طرح بے دم کر دے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلا کے بھسم کر دیتی ہے۔

اسی ضمن میں کسی "جیو" کو تکلیف پہنچانے کی سخت ممانعت کی گئی ہے اور چونکہ "جیو" (یعنی روح) سے جینیوں کے عقیدے میں کوئی چیز خالی نہیں لہٰذا اچھا جینی وہی شخص بن سکتا تھا جو نہ صرف فاقہ کشی اختیار کرے بلکہ "جان آزاری" کے خوف سے دانت تک نہ مانجھے اور کپڑا بھی نہ دھوئے بلکہ ممکن ہو تو بالکل استعمال ہی نہ کرے، چنانچہ اس مذہب کے معتقد اسی بنا پر "دگمبر" کہلاتے تھے کہ ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا اور مگاس تھنیز یونانی نے بھی انھیں "جمنوسوفسٹ" (یعنے حکمائے عریاں) کا خطاب دیا ہے جو بعد کے یونانی مصنفین کے ہاں محفوظ رہا۔

لیکن عقائد کے اعتبار سے جینیوں کا سب سے عجیب مسئلہ "سیادواد" کا اصول ہے جس کی رو سے ہم ایک ہی وقت میں جس بات کا چاہیں اقرار و انکار دونوں کر سکتے ہیں اور اس سے ہمارے مذہبی معتقدات میں کوئی خلل نہیں آتا اور نہ عقل کا قصور ثابت ہوتا ہے! مثلاً ہم عالم کے حدوث اور قدم دونوں کے قائل ہو سکتے ہیں اور اس کی تاویل یوں ہو جائے گی کہ "عالم ایک طرح سے قدیم ہے اور ایک طرح سے دیکھئے تو حادث ہے"!

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مبہم عقائد اور سخت قیود عام طور پر قبولیت نہیں پا سکتے اور یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں جین مت کو زیادہ فروغ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اور کچھ عرصے بعد اس کے عملی اصول میں بھی ترمیم کرنی پڑی چنانچہ گو جینیوں کے مندروں میں آج تک بتوں کو بالکل برہنہ بناتے ہیں لیکن

باب ۵

ایسے عقیدت مندوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو خود اسی شعار پر قائم ہوں اور جنھوں نے دنیوی لذات کے ساتھ لباس بھی ترک کر دیا ہو۔

تیسری فصل[1] ساکی منی گوتم اور بودھ مت

ذاتی حالات

جیساکہ نام کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہے گوتم بودھ قبیلۂ ساکی یا ساکیا کے فرد تھے اور یہ دھتیں قوم کا وہ قبیلہ ہے جس کے دائرہ حکومت میں موجودہ ریاست نیپال اور کسی قدر جنوب کا علاقہ شامل ہوگا۔ ان دنوں اس قبیلے کا صدر مقام کپل وست (Kapilavastu) موجودہ ضلع بستی کے شمال میں (عرض بلد شمالی ۲۷° ۳۲' کے قریب) واقع تھا اور اس میں جمہوری طرز کی حکومت "شرفا" قائم تھی۔ سُدھودن کو شرفا کے اسی حکمراں طبقے کا ایک رئیس بتایا گیا ہے جس کے دو بیویاں تھیں اور اولاد نہ ہوتی تھی۔ آخر عمر کے پینتالیسویں برس اس کی بڑی بیوی مہامایا کو حمل رہا اور وہ اپنے میکے روانہ ہوگئی کہ وضع حمل تک وہیں رہے۔ لیکن میکے پہنچنے سے پہلے راستے میں وضع حمل ہوا اور آئندہ بودھ نے سب سے پہلے سورج کی روشنی لم بنی کے باغ میں دیکھی جو ریاست نیپال کی موجودہ حدود کے اندر شاید تلار ندی کے کنارے واقع تھا۔ یہ باغ جس شہر سے تعلق رکھتا تھا اس کے کھنڈر بھی حال میں دریافت ہوئے ہیں اور یہیں سے اشوک راجہ کا وہ مشہور کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے گوتم بودھ کی ولادت کا ٹھیک ٹھیک مقام معلوم ہوا لیکن افسوس ہے کہ اس کتبے سے بھی سنِ ولادت کا تعین نہیں ہوتا۔ لنکا کی مذہبی کتابوں سے اس قدر تو

---

[1] اس فصل کے لکھنے میں خاص طور پر ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے:۔
(۱) "بدھسٹ انڈیا" (۲) "مینوئل آف بدھزم" (از کرن)، (۳) "ارلی ہسٹری آف انڈیا"
(۴) "بدھا" اور "بدھزم" جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا طبع نو۔

سراغ ملتا ہے کہ گوتم، اشوک راجہ کی تخت نشینی سے دو سو اٹھارہ برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن خود اس تخت نشینی کا سنہ یقینی طور پر معلوم نہیں۔ کیونکہ مذکورۂ بالا ماخذ کی رُو سے اشوک ۳۰۵ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ حالانکہ یورپ کے جدید محقق اس کو ۳۵۰ یا ۳۵۵ کا واقعہ سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر اِن کے نزدیک گوتم کی پیدائش ۵۶۸ ق م میں ہوئی چونکہ اس کی عمر کے متعلق یہ امر عام طور پر مسلّم ہے کہ وہ اسّی سال تک زندہ رہا۔ لہٰذا مذکورۂ بالا سنِ ولادت کو درست مان لیا جائے تو اس کی وفات ۴۸۸ ق م کا واقعہ ہو گی اور متعددِ قرائن سے یہی دونوں سنہ قریب قریب صحیح ثابت ہوئے ہیں۔

ترکِ دُنیا

بہر حال، اس قدر یقینی ہے کہ اپنی نوجوانی امیرانہ عیش و نشاط میں صرف کرنے کے بعد انتیس برس کی عمر میں انھوں نے ترکِ دُنیا کا ارادہ کیا اور عین اُس روز جب کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں رقص و سرود کے جلسے ہو رہے تھے رات کے وقت گھر سے نکل گئے۔ دُنیا کی ثروت و جاہ کو لات ماری اور جنگل میں ایک فاقہ کش فقیر کی طرح رہنے لگے۔ اس حال میں انھوں نے شدید مصائب برداشت کیے اور عرصے تک سخت ریاضتیں کرتے رہے لیکن وہ اطمینانِ نفس جس کی خاطر یہ سب دُکھ جھیلے تھے، میسر نہ آیا۔ آخر ایک روز جب کہ وہ نرنجرا ندی کے کنارے ایک بڑ کے سائے میں بیٹھے ہوئے یہی سوچ بچار کر رہے تھے اور مختلف خیالات کی کشمکش سے ان کی رُوح ہوئی جاتی تھی، ناگہاں انکو اپنے خیال میں عرفانِ حقیقی کی تجلّی نظر آ گئی اور کئی دن کے بعد جب وہ اس درخت سے اُٹھے تو عارفِ کامل (بُدھا یا بودھ) بن کے اُٹھے اور دنیا کو وہ تعلیم دینی شروع کی جو "بودھ مت" کے نام سے مشہور ہے۔

غایت اور اصول مذہب

بودھ نے اپنے مذہب کی غایت یہ رکھی ہے کہ انسان اسی دُنیا کی زندگی میں "نروان"[1] کو حاصل کرلے اور نروان نفس کی اس حالتِ مطمئنہ کا نام ہے جس میں

[1] ہندوؤں کے ہاں "جیون مکتی" (یعنی نجاتِ رُوح) اس لفظ کا مرادف ہے۔ دیکھو کرن کی کتاب صفحہ ۵۰ وغیرہ ۱۲

دنیوی افکار و آلام کا دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہی وہ شے ہے جسے حاصل کرنے کے بعد آدمی بودھ مت کی اصطلاح میں "ارہٹ" کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی اب وہ اخلاقی برائیوں کے جراثیم سے پاک ہے، اس کی ناپاکیاں دھل گئیں، اس نے اپنا کام پورا کر لیا، اپنا بوجھ اتار دیا، بند جدا کر دیے اور آواگون کے چکر سے نجات حاصل کر لی!

اس "غایت" کو پڑھ کر یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ بودھ نے جس "حقیقت" کی بنیاد پر اپنی عظیم الشان عمارت چنی، وہ یہ عقیدہ تھا کہ "طبعاً انسان رنج و مصائب کا ہدف ہے" جس وقت وہ ایک علٰحدہ فرد بنا، اسی وقت سے وہ ایک "محدود ہستی" ہو گیا اور اس کے محدود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا علم محدود اور "جہل" کا سبب ہو۔ جہل رنج و الم کا اصلی مبدء ہے لہٰذا (محدود ہستی کی شکل میں) انسان کی "تکوین" ہی اس کے مصائب کی بنا ہے اور ان سے نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب کہ انسان "طریق وسطیٰ" یعنی بیچ کے راستے پر چل کر حقیقی عرفان حاصل کر لے۔

بیچ کا راستہ

گوتم کی تعلیم کے بہ موجب "بیچ کا راستہ" اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خیالات و خواہش، گفتار و کردار، کوشش و بسر اوقات اور ہوش و محویت، گویا آٹھ حالتوں میں، راستی کا پابند ہو۔ ان میں سے ہر حالت کے متعلق بودھ مت کی کتابوں میں صراحت و بحث کی گئی ہے اور بالکل شروع ہی میں (یعنی خیالاتِ راست کی تصریح کے ضمن میں) روح کے علٰحدہ وجود سے انکار کیا ہے۔ اور آواگون کی بھی بالکل دوسری صورت بیان کی ہے۔ یعنی ایک جسم سے دوسرے جسم میں کوئی روح منتقل نہیں ہوتی بلکہ ایک جنم کی بری یا بھلی صفات اور افعال کا اثر منتقل ہو جاتا ہے اور دوسرے جنم میں انسان اپنے پہلے جنم کے کرم کا پھل پاتا ہے۔ گویا سچ پوچھیے تو ہندوؤں کے کرم کا مسئلہ گوتم نے "تناسخ صفات" کی صورت میں تسلیم کر لیا تھا۔ اور اس نے روح کو جسم سے علٰحدہ کوئی وجود یا ہستی نہیں مانا تو اس کی بڑی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ روح کے متعلق قدیم ہندوؤں میں بہت انوکھے اور عجیب عقائد پیدا ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ خود بودھ مت کا

باب ۵

خدا سے بے تعلقی؛

"تناسخ" بھی کسی ایسی عقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے جسے بلا دقت تسلیم کر لیا جائے۔[1]
اسی سلسلے میں جب رُوح کے علیحدہ وجود سے گوتم نے انکار کیا تو اس رُوحِ اعلیٰ کو بھی اس کے مذہب میں کوئی ممتاز جگہ نہ ملی جس تک ہندو رشیوں کی فکرِ حکیمانہ (غالباً گوتم کے عہد سے بہت پہلے) پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ اس مذہب میں بہت سے دیوتاؤں کو مانا گیا ہے جن کے مختلف عالم اور طبقے قرار دیے ہیں۔ اور خود بانیٔ مذہب کو جن قواء سے متصّف مانا ہے۔ وہ بھی اگر خدائی نہیں تو مافوق الانسان ضرور ہیں۔ بہر حال بودھ مت کی یہی وہ عجیب خصوصیت ہے جس کی بنا پر بعض مغربی مصنّف گوتم کو دُنیا کا سب سے "بلند خیال" فلسفی ماننے کے لیے تیار ہیں۔ گو اس کی تعلیم بجنسہ اب موجود نہ ہو اور اس لیے حقیقی معنی میں بودھ مت کے پیرو مفقود ہوں[2] اور گو عقل اُس کے بتائے ہوئے عقائد کو نہ مانے اور تجربہ، اس کی "شریعت" کو ناقابلِ عمل ٹھیرائے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ گوتم کے تخیل نے مذہب داخلاق کی جو حیرت انگیز عمارت تیار کی تھی وہ دُنیا کے کسی دوسرے فلسفی سے کبھی نہ بن سکی اور یہی سبب ہے کہ آج اگر افلاطون وہراکلیتس کے صرف تحریری مسائل مدرسوں میں پڑھے جاتے ہیں تو گوتم کی مورت صدہا مندروں میں عبادت کا خراج وصول کرتی ہے۔ ان بھولے پرستاروں کو عقل و ذہانت میں ہم اُن طلبا کا ہم پلّہ نہ تسلیم کریں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دُنیا کے دیگر حکما، بنی نوع کو محض اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے رہے اور ہندوستان کے اس مُنی نے ہزاروں کو عملاً اپنا پیرو بنا دیا۔

---

[1] ۔ اس بارے میں کہ بودھ مت نے خود کبھی معقولی مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، دیکھو کرن کی "مینوئل آف انڈین بدھزم" صفحہ ۴۹ و ۵۰-۱۲۔

[2] ۔ بودھ مت ماننے والے سب سے بڑی تعداد میں چین کے باشندے سمجھے جاتے ہیں ۔ لیکن اعمال وعقائد میں ان کا یہ مذہب دوسرے ادیان خاص کر تاؤ کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو گیا ہے کہ انھیں گوتم کا پیرو کہنا درست نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو انسائی کلو پیڈیا جلد ۶ صفحہ ۱۷۵۔

باب

عملی تعلیم

اہل مشرق کی اوہام پرستی کو بھی اس کامیابی کی ایک وجہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن محض اس توجیہ پر اکتفا کرنا گوتم کے فلسفے کی جس نے ہندوستان کے قدیم تر مذاہب کا رنگ پھیکا کر دیا، سخت ناقدری ہوگی۔ دوسرے اس عہد کے حالات کو سامنے رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ گوتم کی کامیابی کے اصلی اسباب کیا تھے؟ درحقیقت وہ قدیم عقائد میں اصلاح کرنے کا اس قدر خواہاں نہ تھا جس قدر کہ عملی طور پر اپنے بنی نوع کی زندگی سنوارنی چاہتا تھا اور اس میں اور دیگر فلاسفہ میں یہی فرق ہے۔ اگر اس نے "آتماں" سے انکار کیا یا "پرماتماں" سے کوئی سروکار نہ رکھا تو اس کا باعث بھی یہ تھا کہ وہ اسی دنیاوی زندگی اور جسمانی افعال کی اہمیت پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان فطرۃ بدی کی طرف مائل پیدا ہوا ہے اور بدی اس کے تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے پس محض اپنی دنیاوی زندگی آرام و راحت سے گزارنے کے لیے انسان کا فرض ہے کہ بدی سے بچے۔ اس بدی کی اس نے انیس شکلیں گنائی ہیں جن میں سے دس کو وہ "سمبوجن" (یعنی بندشیں) کہتا ہے، چار کو "اشوا" (یعنی نشے)، اور پانچ کا اصطلاحی نام "نیورن" (یعنی موانع) بتاتا ہے۔ ان سے بچنے اور آٹھ سچائیوں پر چلنے کے لیے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، سالک کو کم سے کم چالیس "کم تھان" (یعنی اعمال)، کی پابندی کرنی چاہیے جن میں چند قسم کے مراقبے اور درویشانہ قسم کی زندگی گزارنے کی تعلیم ہے۔ ریاضت ہائے شاقہ اور ترکِ دنیا سے بودھ نے اپنے پیرووں کو بہ تاکید روکا ہے لیکن تزکیۂ نفس کے لیے جوگیوں کے بعض طریقے اور مراقبے اختیار کر لیے ہیں، جو پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے۔ ان مراقبوں میں خدا سے لو نہیں لگائی جاتی بلکہ سفیدی، زردی، روشنی یا آب و خاک وغیرہ عناصر پر دھیان جماتے ہیں ان اعمال سے آدمی کو مافوق الانسان قوت حاصل

ہو جاتی ہے اور اگر سب مقامات طے کر جائے تو بودھ کا دعویٰ ہے کہ پھر سالک تمام برائیوں سے پاک ہو کر "نفسِ مطمئنہ" حاصل کرے گا جس کے بعد صرف ایک درجہ "فنا" کا اور ہے اور اس کی تکمیل موت کے بعد ہوتی ہے۔[1]

---

[1] - کرن صفحات ۵۳ و آئندہ - ۱۲

ان عبادات کو دیکھ کر قدرتی طور پر تعجب ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے متعلق بودھ کا وسیع نظام مذہبی کیوں ساکت ہے؟ گمان ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے اس تعلیم کو محض انکشافی اور وجدانی قرار دیا ہو اور واجب الوجود کو منطقی اور علمی دلائل سے ثابت کرنے کی بجائے مراقبات کی غایت ہی یہ رکھی ہو کہ سالک اپنی ذات کو فنا کر کے اس ذاتِ واحد کا ادراک کرے جو نہ حواسِ ظاہری سے محسوس ہو سکتی ہے نہ ظاہری علم اور عقل و قیاس کی اس تک رسائی ہے۔ مگر مذکورۂ بالا رائے کا کوئی ثبوت زمانۂ جدید کے محققین کی تحریروں میں نہیں ملتا اور بعض مغربی مصنف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ گوتم بودھ کی شریعت اور طریقت میں وجودِ باری تعالیٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ انھیں اس بات کا اقرار ہے کہ بودھ کی تعلیم میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے اور اب اس کی اصلیت کا ٹھیک پتا نہیں چل سکتا۔ اسی ضمن میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ ہمارے لائق ہموطن بابو منماتھ دت نے اپنی مشہور کتاب "پرافٹس اوف انڈیا" (حصۂ اول) میں بودھ کے ملحد ہونے کی شد و مد سے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ کرشن جی کی طرح پکے موحد تھے۔

باب ۶

پہلی فصل سکندر کی فوج کشی ہندوستان پر

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے جو ورق سادہ پڑے ہیں اور انھیں مذہبی مباحث سے پُر کرنے کا خیال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ اس بارے میں ہمارے پاس کچھ نہ کچھ وسائل معلومات موجود ہیں خاص کر بودھ مت نے پجاریوں کے علی الرغم جو فروغ چھٹی اور پانچویں صدی (ق م) میں حاصل کیا، اس کے بہت سے حالات روایات و قصص کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ واقعاتِ تاریخی کے جویا کی مذہب و فلسفے کے پیچیدہ مسائل پڑھ کر تشفی نہیں ہو سکتی۔ پس مورخوں کی نظر میں سکندر یونانی کی آمد، گویا رات کی تاریکی میں کسی شمع کا روشن ہو جانا ہے جس کے اُجالے میں ہمیں نہ صرف مردانِ مقدونیہ اور شہسوارانِ تھسالیہ کی سپاہ گری، بلکہ ہندوستان کے بہت سے باشندوں کی صورتیں نظر آئیں گی۔

حملے کا سبب

اس مغربی کشور کشا کی حملہ آوری کا سبب بیان کرنے میں مغرب کے موجودہ اہلِ تصنیف نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ کوئی تو لکھتا ہے کہ وہ یونان (اور اس لیے یورپ) کی تہذیب کا شمع بردار بن کر چلا تھا اور تمام ایشیا میں اس تمدن کی

روشنی پھیلا دینی چاہتا تھا۔ کسی نے ثابت کیا ہے کہ سکندر کی ہند پر فوج کشی تجارتی اغراض پر مبنی تھی اور وہ اس ملک کا جسے اہلِ یونان عجائبات کی سرزمین اور دولت کی کان سمجھتے تھے راستہ صاف کر دینے کا خواہاں تھا لیکن وہ لوگ جو قلبِ انسانی کے چور پکڑ لیتے ہیں اور جنھوں نے بادشاہوں کے خوفناک جذباتِ باطنی کا مطالعہ کیا ہے، اِن باتوں کو محض مورخانہ وکالت سمجھیں گے۔ یہ عذر تو کسی حد تک قابلِ سماعت ہو سکتا ہے کہ دولتِ ایران کا نیا وارث دارَیوش کے قدیم صوبے کو پھر سلطنت میں شامل کرنے کا خواہاں تھا۔ ورنہ سچ پوچھیے تو اُس گرفتار ڈاکو کے الزامی سوال کا سکندر کے پاس کوئی شافی جواب نہ نکلے گا جس نے پہلے اپنا جرم دریافت کیا تھا اور پھر جواب میں کہا تھا کہ اگر دوسروں کا مال چھین لینا جرم ہے تو اے بادشاہ (سکندر) تو دوسروں کے ملک کیوں چھینتا پھرتا ہے؟ یہ روایت سچ ہو یا جھوٹ، شاید اس بات کا پتا دیتی ہے کہ سکندر کی فتوحات کے متعلق راوی کی رائے کیا تھی!

درحقیقت دولت وجاہ کی طرح ملک گیری کی ہوس بھی کسی دلیلِ عقلی کی پابند نہیں۔ بلکہ جس طرح روپیے کی زیادتی کے ساتھ طامع بخیل کی حُبِّ مال بڑھتی ہے اسی طرح نئے مقبوضات سے فاتح بادشاہ (یا قوم) کی ہوسِ ملک ستانی بھی افزوں ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک زمین پر قبضہ کرتے ہی وہ دوسرا علاقہ لینے کی اُدھیڑبن میں لگ جاتا ہے۔ نفسِ انسانی کے اس مرض کا انجام عام طور پر ہلاکت ہوا ہے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جیتے جی اس عارضے سے شفا حاصل ہونی دشوار ہے۔ اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جنھوں نے کشورکشائی کے میدان میں قدم رکھا، خواہ ان کی غرض محض حصولِ شہرت و نام آوری ہو یا اپنے ہم قوموں کی نفع رسانی، وہ پھر اس وقت تک کہ حریفانِ قوی یا مرگِ مبرم نے اُنھیں مغلوب نہ کیا، آگے بڑھنے سے نہیں رُکے۔ سکندر یونانی کو بھی اس عہد کی سب سے وسیع سلطنت مسخر کرنے کے بعد اگر تمام عالم کی بادشاہی کی اور چشمۂ حیواں، یا سورج کے دروازے" دیکھنے کی ہوس پیدا ہو گئی ہو تو یہ کچھ حیرت کی بات

نہیں ہے۔[1]

آمد کارامنہ بہر حال، یونانی فاتح کا لشکر سغد و باختر کی تسخیر سے فراغت پاکر موجودہ افغانستان کے علاقے میں داخل ہوا (۳۲۷ قم) اور وہاں سے دو حصوں میں منقسم ہوکر کوہستانِ سلیمان کو عبور کر آیا۔ ان قوموں نے جو راستے اختیار کیے تھے، ان کا پتا چلانا دشوار ہے کیونکہ اول تو اس زمانے کی بستیاں ہی ویران وغیر آباد ہو گئیں دوسرے یونانی مصنفوں نے اِن کے صحیح نام یا محل وقوع نہیں لکھے۔ اِس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج خود سکندر کے ماتحت تھی وہ چترال ندی کی وادی سے گزر کر سب سے اول سرحد ہندوستان کے اس علاقے میں داخل ہوئی تھی جسے آج کل باجور کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں سے دو سخت لڑائیاں ہوئیں، یونانیوں کو غلبہ حاصل ہوا، اور وہ موجودہ سوات کی ایک پہاڑی ریاست نیسا میں پہنچے جس کی تسخیر کے حالات مشتبہ ہیں۔ یونانی راویوں کا بیان ہے کہ یہاں کے پائے تخت پر فوج کا حملہ کارگر نہیں ہوا تو سکندر نے شہر کی ناکہ بندی کا سامان کیا لیکن خود شہر والوں نے اطاعت قبول کر لی اور یہ عجیب دعویٰ پیش کیا کہ ہم اہل مقدونیہ کے ہم نسل ہیں۔ سکندر نے یہ دعویٰ (جس کے ثبوت ذرا بھی قابلِ یقین نہ تھے) بلا حجت مان لیا اور ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی مہمانی قبول کی۔ اس زمانے کے نقادوں کا خیال ہے کہ سکندر کا یہ فعل اس مصلحت پر مبنی تھا کہ مقدونی سپاہیوں کی جنھیں وطن چھوڑے برسوں گزر گئے تھے، اشک شوی ہو جائے اور وہ اپنے ان فرضی رشتہ داروں میں چند روز آرام لے لیں۔ مگر اس کے علاوہ ایک یہ قیاس بھی ہو سکتا ہے کہ ان روایتوں میں یونانی مورخوں نے اپنے ممدوح کی ناکامی چھپائی ہے اور یہ وہ فن ہے جس میں قدیم اہل یونان ہی گویا یورپ والوں کے استاد ہیں۔

جنگ مساگا اس قیاس کی بالواسطہ تصدیق شاید اُن روایات سے بخوبی ہو سکتی ہے

---

[1] سکندر کی ان اولوالعزمیوں کے متعلق جو روایتیں مشہور تھیں اور اب تک مشہور ہیں وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔ ملاحظہ ہو "الگزنڈرز ایمپائر" صفحہ ۳۵۔

جو کہ فتح مساگا کے متعلق یونانیوں نے بیان کی ہیں۔ اس بات کا ٹھیک پتا نہیں چلتا کہ یہ مستحکم اور مرکزی شہر کہاں واقع تھا لیکن سکندر کا اسے ہلّہ کر کے چھین لینا وہاں کے مقتول رئیس کی بیوہ سے شادی کرنا اور پھر اُن سات ہزار اجیر سپاہیوں کو یک بہ یک حملہ کر کے قتل کرا دینا جو یونانیوں کے ساتھ ہو کر لڑنے کا وعدہ کر چکے تھے اور پھر قلعے سے باہر آنے کے بعد بغیر وعدہ پورا کیے نکل جانا چاہتے تھے، ایسی روایتیں ہیں جن پر کسی طرح اعتبار نہیں آتا، اور بعض ہم عصر اہلِ مغرب کی تصانیف پڑھ کر خیال گزرتا ہے کہ انھوں نے بھی اہلِ ہند کے مقابلے میں ایک فرنگی بادشاہ کی بے جا پاسداری کی ہے[1]۔ سکندر کی بدعہدی کا خود یونانی راویوں نے دبی زبان سے ذکر کیا ہے لیکن تاریخی تنقید کے جدید اصول کی رُو سے اِن یک طرفہ روایتوں کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہ ہوگا کہ فتح مساگا میں یونانیوں کی بہادری سے زیادہ اُن کے مکر و فریب اور ہندی وطن فروشوں کی غدّاری کو دخل تھا۔ پہلے ہی سکندر کے لشکر میں ہندوستان کے کئی رئیس و راجہ موجود تھے جنھوں نے محض باہمی نفاق اور ہمسایوں کی رقابت میں حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا اور کابل کے علاقے سے ان کے ہمراہ تھے۔ بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ انھی کی مدد کے بھروسے پر اس مقدونی کشور کشا نے ہندوستان میں بڑھنے اور اپنا شوقِ کشورستانی پورا کرنے کی جرأت کی ہو۔

دوسری فصل: جنگِ پورس (۳۲۶ ق م)

بہرحال اب سکندر ہندوستان کے قدرتی کوہی مورچوں کو طے کرنے کے بعد

سندھ سے عبور

[1] ۔ اس کی سب سے اچھی مثال غالباً وہ "رائے زنی" ہے جو اس واقعے پر ونسنٹ اسمتھ نے کی ہے۔ دیکھو ارلی ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۵۶۔

باب ۲

میدانی علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی فوج کا ایک دستہ پہلے سے دریائے سندھ پر پہنچ گیا تھا اور ٹکسیلا کے راجہ کی مدد سے اُس مقام پر کشتیوں کا پُل تیار کر رہا تھا جو آج کل اوہند کہلاتا ہے۔ اسی جگہ راجہ (آمبھی) نے سکندر کا خیر مقدم کیا اور فروری یا مارچ ۳۲۶ق م میں یورپ کا پہلا بادشاہ سندھ اُتر کے پنجاب کے علاقے میں داخل ہو گیا۔

ٹکسیلا

سکندر کے ہندی حلیف یعنی آمبھی کا پایۂ تخت ٹکسیلا دریا سے بیس پچیس میل آگے موجودہ راولپنڈی کے شمال مشرق میں واقع اور اس زمانے میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے قدیم علوم خاص کر ہندی طِب کی تعلیم کا جو اہتمام اس شہر میں کیا گیا تھا، وہ شمالی ہند میں کہیں نہ ہوگا۔ چنانچہ وہاں کے مشہور مدرسے میں تعلیم پانے کے لیے دُور دُور کے طلبہ آتے تھے اور صاحبانِ علم کی بڑی قدر تھی۔ دولت وحشم کے اعتبار سے بھی یہاں کا راجہ اپنے مشرقی حریف (پورس) سے کچھ بہت کم نہ تھا اور اس نے کئی ہفتے تک شاہانہ کرّو فر کے ساتھ یونانی سپاہ کی مہمانی کی؎۔ یونانی راوی لکھتے ہیں کہ اس نے کمال عجز کے ساتھ اپنا ملک و مال سکندر کے حوالے کر دیا تھا اور سکندر نے اُسے اس کی ریاست بخش دی اور اپنا باج گزار والی تسلیم کر لیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں خود اہلِ ہند کی کوئی تحریر ہمارے پاس نہیں ہے جس کی بنا پر یونانی روایات کی تصدیق یا تردید کی جا سکے۔ لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ

؎ - اسی غرض سے تین ہزار گائیں یا بچھڑے بھی پال کر تیار کیے گئے تھے کہ یونانیوں کی ضیافت میں کام آئیں۔ اور اس واقعے سے ظاہر ہے کہ سکندر کی آمد تک ہندوستان کے اکثر حصوں میں گاؤکشی اسی طرح جائز تھی جس طرح "زمانہ وید" میں (اوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۵۹ و ۶۱) اسی ضمن میں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ معتبر یونانی مصنفین کی روایت سے ٹکسیلا میں تعددِ ازدواج اور ستی کی رسم کا ہونا بھی ثابت ہے۔ مُردوں کو کھلی جگہ میں ڈال دینا کہ گدھ کھا جائیں، آگ کی پوجا اور بعض رسموں سے پتا چلتا ہے کہ اُن دنوں ایرانی مذہب کے بعض عقائد بھی ہند کے مذہب و تمدن میں دخیل تھے۔

باب ۶

یونانی مصنفوں نے اپنی شوکت نمائی کا پہلو ہمیشہ مدنظر رکھا اور تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں رنگ آمیزی کی ہے۔ اسی لیے اگر ہم یہ کہیں کہ ٹکسیلا کے راجہ نے اپنے ہمسایوں کے خلاف سکندر سے مدد چاہی اور جب وہ آیا تو اپنی سیاسی مصلحتوں سے یونانی فوج کی بہت کچھ خاطر مدارات کی اور حلیف بن کر اپنے حریف راجہ پورس کو تباہ کرا دیا تو گو اس قول کی کوئی منقولی شہادت میسر نہ آئے تاہم بعض قرائن اور آئندہ واقعات سے اس کو تقویت ہوتی ہے مگر ان قیاسات پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یونانی روایات کے مطابق ان تمام واقعات پر ایک نظر ڈال جائیں جو سکندر کی ہند سے واپسی تک اسے پیش آئے۔

جہلم عبور کرنے کی کوشش

ٹکسیلا کے مقام سے ریاستِ چج کے راجہ کو پیام بھیج دیا گیا تھا کہ سکندر کی اطاعت قبول کرے اور پیشوائی کے لیے اپنی سرحد پر حاضر ہو۔ ریاستِ چج کا نام اپنی آسانی کے لیے ہم نے اختیار کر لیا ہے۔ معلوم نہیں قدیم زمانے میں اس ریاست کا علیحدہ نام کیا تھا جس کے متعلق صرف یہ پتا چلتا ہے کہ اس میں دریائے جہلم اور چناب کے دوآبے کا علاقہ اور تین سو بستیاں شامل تھیں۔ اس دوآبے کو آج کل جہلم اور چناب کا نام ایک لفظ میں مخفف کر کے چج یا چنبا کہنے لگے ہیں اور وہ شاہپور، گجرات، اور جہلم کے اضلاع پر مشتمل ہے قدیم اور تاریخی ناموں کے متعلق ہماری کوتاہی معلومات کا یہ حال ہے کہ خود "پورس" کا ہندی اور اصلی نام آج تک معلوم نہ ہوا۔ سکندر کے اس نامی حریف کو یونانیوں نے یہ نام دیا ہے اور مسلمانوں کی تصانیف میں اسے "فور ہندی" کہا گیا ہے جو پورس ہی کا معرب ہے[۱]۔ ہندوستان کی کسی پرانی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا اور اس لیے یہ محض قیاس ہی قیاس ہے کہ اس کا اصلی نام پورو ہوگا۔

بہرحال، راجہ نے سکندر کو جواب میں کہلا بھیجا کہ "اس کا خوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ مگر ایسا جیسا کہ مردانِ جنگ کیا کرتے ہیں"۔ پھر اپنی فوج آراستہ کی

---

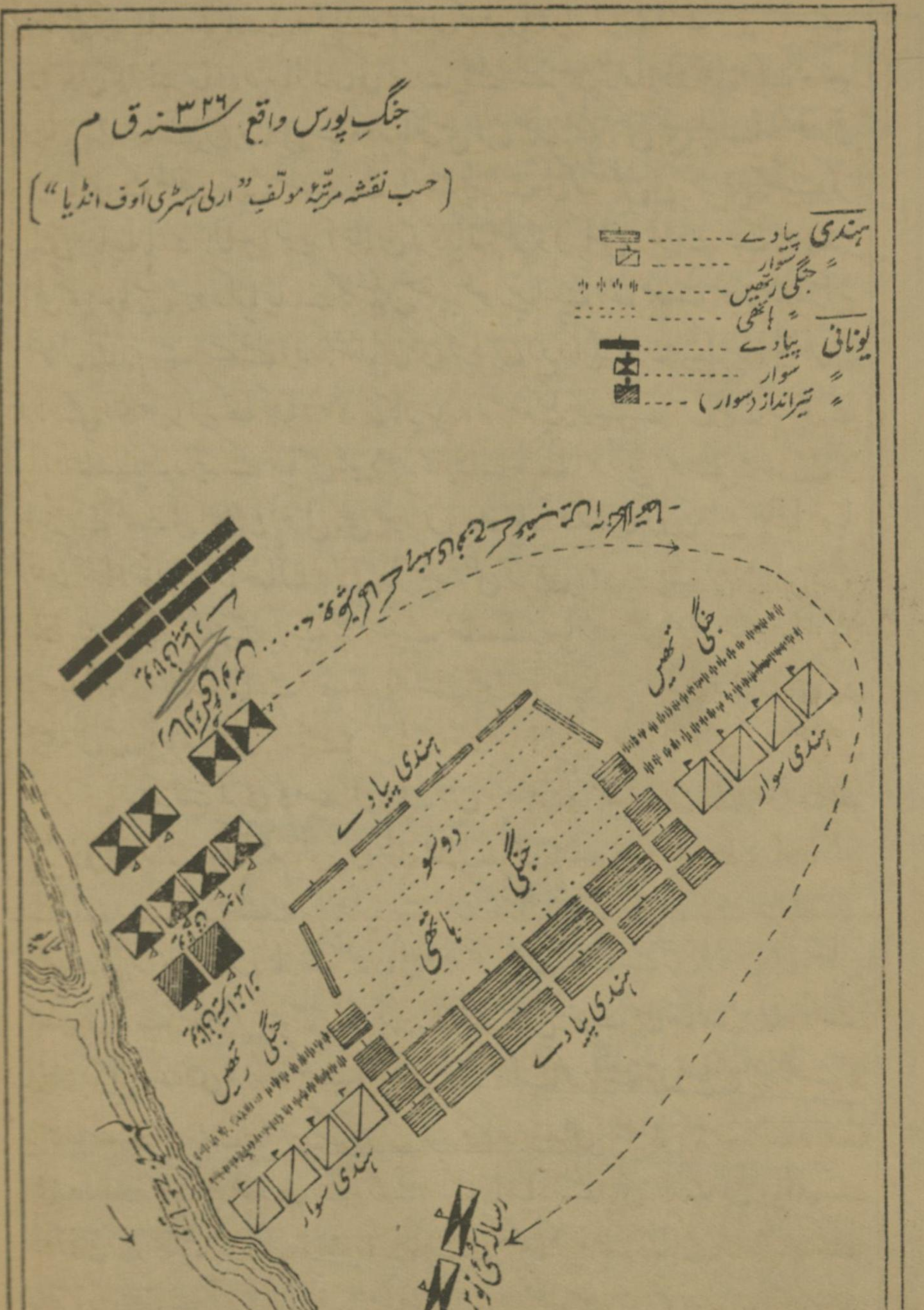
[۱] - یعنی غالباً خود اسلامی مصنّفین کی تحقیقات کو اس میں دخل نہیں اور معلوم ہوتا ہے اُن میں یہ نام یونانیوں کے ہاں سے آیا۔ ۱۲

باب ۶

اور جہلم کے کنارے تک بڑھ آیا کہ یونانیوں کو دریا نہ پار کرنے دے۔ یہ سخت گرمیوں کا زمانہ تھا اور پہاڑوں کی برف پگھلنے سے جہلم چڑھا ہوا تھا۔ ایک قوی دشمن کے مقابلے میں یونانی سپاہ دریا کو کسی طرح عبور نہ کر سکتی تھی لہٰذا مورخ ایریان کے لفظوں میں سکندر نے "راستہ چرانے" کی کوشش کی، یعنی چھپ کر پار ہونا چاہا اور ظاہر اتو یہ اعلان کر دیا کہ جہلم کو (پانی اترنے کے بعد) موسم سرما میں عبور کیا جائے گا لیکن خفیہ طور پر اپنے مقام سے سولہ سترہ میل شمال میں بہت سے تختے اور کشتیاں جمع کر دیں اور ایک رات جب کہ سیاہ بادلوں نے اور بھی اندھیرا کر رکھا تھا وہ فوج کا چیدہ دستہ چکر دے کے اس طرح دریا کے پار اُتار لایا کہ راجہ کے سپاہی خبردار نہ ہونے پائے اور صبح ہوتے پورس کو غنیم کے آنے کی اطلاع ہوئی بھی تو اُس نے حملہ آوروں کی تعداد کا غالباً اتنا غلط اندازہ کیا تھا کہ اول اول کچھ جنگی رتھیں اور صرف دو ہزار سوار مقابلے کے واسطے بھیجے۔ جب یہ شکست کھا کے پسپا ہوئے اور شاید یہ معلوم ہوا کہ خود سکندر آ گیا ہے، تو اس وقت پورس اپنی پوری فوج لے کے میدان میں آیا۔

میدان اور تدابیر جنگ

یہ جگہ جسے کری کا میدان کہتے ہیں، موجودہ کشمیر کی سرحدی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ جہلم انگریزی علاقے میں داخل ہوتے ہی جہاں ختم کھا کے تھوڑی دور تک بہت چوڑا ہو گیا ہے اس کے شمال مشرق میں ایک ہموار ریپٹر (یعنی جمی ہوئی ریتی) قوس نما پہاڑیوں کی آغوش میں آ جاتا ہے جس کا طول دس بارہ میل اور بڑے سے بڑا عرض ۵ میل کے قریب ہوگا لیکن جنوب میں تنگ ہوتے ہوتے وہ دو میل سے بھی کم رہ گیا اور نقشۂ جنگ کو دیکھتے ہی خیال گزرتا ہے کہ سکندر نے حریف کو اس جگہ کیوں نہ روکا کہ ہندی لشکر اپنی کثرت تعداد سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ کیونکہ پورس کے آتے آتے غالباً اسے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ طوفان میں بھیگے ہوئے سپاہی اپنے کپڑے سکھا کر وہاں تک بڑھ سکتے تھے جس راستے سے پورس کی فوج میدان میں داخل ہو رہی تھی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ گو ہندی پیادوں کی تعداد یونانیوں سے ڈھائی گنی (یعنی تیس ہزار)


جنگِ پورس واقع ۳۲۶ سنہ ق م
(حسب نقشہ مرتبہ مولّفِ "ارلی ہسٹری آوف انڈیا")
ہندی پیادے
سوار
جنگی رتھیں
ہاتھی
یونانی پیادے
سوار
تیرانداز (سوار)
جنگی رتھیں
ہندی پیادے
دو سو جنگی ہاتھی
ہندی سوار
ہندی پیادے
جنگی رتھیں
ہندی سوار

بتائی گئی ہے اور جنگی رتھوں، مہیب ہاتھیوں اور کثرت ساز و اسلحہ کے بیان میں یونانی مصنفوں نے اپنی انشا پردازی کا زور صرف کر دیا ہے، بایں ہمہ چار ہزار ہندی سواروں کے مقابلے میں یونانی سواروں کی تعداد پانچ ہزار تھی[1] اور یہی وہ فرق ہے جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا کیونکہ گو پورس میدان کے وسط یعنی سب سے عریض حصے تک بڑھ آیا تھا اور اُسے صف بندی کی بھی مہلت مل گئی تھی لیکن دونوں بازو جن پر جنگی رتھیں اور سواروں کا رسالہ تھا، کمزور تھے اور یونانیوں سے پہلا تصادم انھی کا ہوا یعنی اول سکندر کے سوار تیر برساتے ہوئے ہندیوں کے بائیں پہلو پر آگرے اور جب ان کی مدد کے لیے ہندی میمنہ کے سوار بڑھے اور صفوں میں انتشار پیدا ہوا تو، یونانی رسالے نے دائیں پہلو پر حملہ کیا اور اس طرح ہندی سوار دونوں طرف سے پسپا ہو کر قلب لشکر کی طرف بھاگے جہاں ہاتھیوں کے پیچھے پیادوں کی فوج کثیر صف بستہ تھی۔ کہتے ہیں ان جنگی ہاتھیوں پر پورس کو بہت ناز تھا اور اس میں شک نہیں کہ جب یونانی قلب کے پیادے سامنے پہنچے تو ہاتھیوں کے پہلے ریلے نے ان میں تہلکہ ڈال دیا۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہ عارضی کامیابی بھی آیندہ ناکامی کی دلیل تھی اور اس کے معنی یہ تھے کہ ہندی پیادوں کو میدانِ جنگ میں خاطر خواہ حصہ لینے کی نوبت ہی نہ آئی۔[2] اس کے علاوہ بازووں پر جو غلبہ سکندر کو حاصل

---

[1] ارلی ہسٹری آف انڈیا۔ صفحہ ۶۵ و ۶۶۔

[2] "پورس کو اپنے ہاتھیوں پر بھروسا تھا۔ مگر جنگ کے وقت وہ پوری طرح کام نہ دے سکے اور بعد میں بے قابو ہو کر انھوں نے دشمنوں کی نسبت دوستوں کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ رتھوں کے تیر انداز سکندر کے سوار کماں برداروں کی ٹکر کے نہ تھے۔ ادھر میدان کی پھسلواں زمین نے ہندی پیادوں کو اپنی زبردست کمان سے کام نہ لینے دیا کیونکہ انھیں کمان کا ایک سرا زمین پر ٹیک کر بائیں پاؤں سے روکنے اور ہاتھ سے کھینچ کے تیر چلانے کی عادت تھی۔ ہندی پیادوں کے بائیں شانے پر بہت بھاری دودستی تلوار اور چرم گاؤ کی بے منڈھی ڈھال تھی (اور اسے سنبھالنا دشواری سے خالی نہ تھا) اور بعض سپاہی کمانوں کی بجائے سانگ سے مسلح تھے۔" (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۴)۔

ہو چکا تھا، اس میں ہاتھیوں کے وسطی حملے سے چنداں فرق نہ آیا اور ہندی سواروں کے منتشر ہوتے ہی دشمن کی پیادہ فوج کے دونوں پہلو سواران یونان کی زد میں آگئے۔ اور یہ وہ خطرہ تھا جس کی پورس کوئی روک تھام نہ کر سکا۔ اُس کے جنگی ہاتھی زخم کھا کے بے قرار اور مہاوتوں کے قابو سے باہر ہو گئے تھے اور جدھر منہ اٹھتا، بھاگتے اور بلا امتیاز دوست دشمن کو روندتے چلے جاتے تھے۔ ان کا اگر زور تھا بھی تو میدان کے وسط میں تھا جہاں یونانی پیادے انھیں بڑھتے دیکھ کر ادھر اُدھر بھاگ جاتے اور ہر طرف سے نیزہ و تیر کی بوچھار کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہاتھی سخت زخمی ہو کر گرنے لگے اور بھاگتے بھاگتے شل ہو گئے۔ ان میں کوئی ترتیب نہ رہ سکی اور اہل مقدونیہ کی پیوستہ صفوں نے ہندی قلب پر پوری قوت سے حملہ کیا۔ اس قلب کے دونوں بازوؤں کو یونانی سواروں کے پیہم حملوں نے پہلے ہی پریشان کر رکھا تھا جس وقت یونانی پیادے اپنی برچھیاں تول تول کے بڑھے، تو پھر ہندی لشکر دیر تک میدان میں نہ ٹھیر سکا اور ایسا بے حواس ہو کر بھاگا کہ ہزاروں آدمی مارے گئے اور جو میدان سے نکل گئے تھے ان پر کراتروس کے تازہ دم سپاہیوں نے حملہ کیا۔ یہ سردار پڑاؤ پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ راجہ کو سکندر کے لشکر سے نکل جانے کی خبر نہ ہو اور اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب ہندی فوج دریا کے پار لڑائی میں اُلجھ جائے تو موقع دیکھ کر وہ بھی جہلم کو عبور کر آئے۔

فتح کی یادگاریں

جنگ[1] میں راجہ پورس بھی گرفتار ہو گیا تھا لیکن سکندر نے نہ صرف اس کی ریاست اور جان اسے بخشی بلکہ کچھ اور علاقہ اپنی طرف سے دے کے اُسے اپنا وفادار حلیف بنا لیا۔ پھر اس فتح کی یادگاریں دو شہروں کی بنیاد رکھی جن میں پہلا سکندر کے محبوب گھوڑے بوکفالوس کے نام پر بوکفالیہ کہلاتا تھا اور اس کے کھنڈر موجودہ قصبۂ جہلم کے متصل دریافت ہوئے ہیں۔ دوسرا

---

[1] اس لڑائی کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن وہ جون کے آخر یا شروع جولائی (۳۲۶ ق م) میں واقع ہوئی تھی۔ ۱۲

باب ۲

دنکایا) غالباً خاص میدان جنگ پر بسایا گیا تھا جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ فتح کی تیسری اور دلچسپ یادگار اس سکے کو سمجھا جاتا ہے جس کے ایک طرف سکندر کی برق بدست تصویر بنائی ہے اور دوسری طرف ایک مقدونی سوار بھاگتے ہاتھی کا پیچھا کر رہا ہے۔ بعض اہل تحقیق خیال کرتے ہیں کہ یہ سکندری فتح کی یادگاریں تمغے کے طریق پر یونانی سپاہیوں کو تقسیم کیا گیا تھا۔

بیاس تک پیش قدمی

پورس کی شکست کے بعد دور تک کسی بڑے راجہ سے مقابلے کا خدشہ نہ تھا لہٰذا سکندر نے اپنے نئے باجگزار کے علاقے سے بہت جلد آگے کوچ کیا کیونکہ کہتے ہیں اُسے دریائے گنگا تک پہنچنے کا شوق تھا جسے قدیم یونانی دنیا کی مشرقی سرحد سمجھتے تھے۔ چناب و راوی کے عبور میں کوئی مزاحمت نہ پیش آئی۔ لیکن راوی کے مشرقی کنارے کے دیہات و قبائل نے اس کی اطاعت قبول نہ کی اور ایک مرکزی قلعے میں محصور ہو کر بہت دن تک مقابلہ کرتے رہے۔ یونانیوں کی مدد کے لیے راجہ پورس بھی پانچ ہزار سپاہی لے کے آیا اور آخر سخت کشت وخون کے بعد غالباً ماہ اگست میں یہ قلعہ سر ہو گیا اور سکندر نے آگے مشرق کی راہ لی۔ مگر اس کے سپاہی اس قدر بد دلی سے کوچ کر رہے تھے کہ سکندر بھی اس بات کو سمجھ گیا اور اُس نے ان کے دل میں گرمی پیدا کرنے کی غرض سے دریائے بیاس کے کنارے پہنچ کر ایک پُرجوش تقریر کی۔ ان کے پچھلے کارنامے دہرائے، اور آیندہ فتوحات میں ناموری اور مال غنیمت کا لالچ دلایا۔ لیکن دیس کی یاد اور جسم کی تکان زبانی باتوں سے دفع نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے مضمحل رفیق آگے بڑھنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے فتح ایشیا کے اس ناکام آرزومند کو طوعاً وکرہاً فوج کی واپسی کا حکم دینا پڑا۔

تیسری فصل سکندر کی مراجعت ہندوستان سے

دریائی سفر

واپسی میں سکندر نے کچھ روز جہلم کے کنارے کری کے میدان کے قریب

قیام کیا۔ دریا کے دونوں طرف جو نئے شہر تعمیر کرائے تھے ان کے آباد اور محفوظ کرنے کے متعلق بعض ہدایتیں کیں۔ راجہ پورس اور آمبھی کے علاوہ اور بھی کئی رئیسوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی، غالباً ان کے علاقوں کی حدبندی بھی اسی قیام کے زمانے میں کی گئی۔ دریائے سندھ کے مغرب میں سکندر نے اپنی ایک ولایت یا ریاست پہلے بنا دی تھی اور اس پر ایک یونانی سردار کو مقرر کر چکا تھا۔ لیکن سندھ اٹر کے خاص ہندوستان کا کوئی حصہ اس نے براہ راست اپنے قبضے میں نہیں لیا بلکہ یونانی روایات کے بہ موجب سندھ سے جہلم تک آمبھی کی اور جہلم سے بیاس تک پورس کی عملداری رہی اور ان دونوں نے سکندر کی باجگزاری یا دوستی کا عہد کر لیا۔

اس اثنا میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں فراہم کی جا رہی تھیں کہ ان میں فوج کا کچھ حصہ، ساز و سامان اور گھوڑے، دریا کے راستے روانہ کیے جائیں۔ کشتیوں کی کل تعداد کم سے کم آٹھ سو اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار بیان کی گئی ہے اور ان میں سب سے بڑے تیس چپو کے آٹھ جنگی جہاز تھے اور گو یہ جہاز عرض و طول یا رفتار میں آج کل کے معمولی تجارتی جہازوں سے بھی کوئی مناسبت نہ رکھتے تھے، بایں ہمہ پنجاب کے دریاؤں میں اتنا بڑا بیڑا کبھی نظر نہ آیا ہوگا جسے خود سکندر ماہ اکتوبر ۳۲۶ق م میں جنوب کی طرف لے جا رہا تھا۔ بیڑے کی حفاظت کے لیے باقی ماندہ یونانی فوج دریا کے دونوں کنارے پر منزل بہ منزل آگے جا رہی تھی اور اس کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے بھی اوپر بتائی گئی ہے۔

راستے کی لڑائیاں

جہلم اور چناب کے سنگم[۱] یعنی پورس کی جنوب مغربی سرحد تک کوئی خاص بات پیش نہیں آئی لیکن آگے چل کر سکندر نے راستے کے قریب بستیوں اور

[۱] ۔ یونانیوں نے اپنے تلفظ میں ان سب مقامات کے نام اور پتے بہ تفصیل تحریر کیے ہیں۔ لیکن پنجاب کے دریاؤں کی گزرگاہ اس دو ہزار برس میں کہیں سے کہیں ہو گئی ہے اور اس لیے ان کے پرانے سنگم یا کنارے کے شہروں کا اب سراغ نکالنا محال ہے۔ ۱۲

قبائل کو اپنا مطیع بنانا چاہا اور سب سے پہلی بڑی لڑائی آگ لسوی نامی قوم سے پیش آئی۔ یونانی مورخوں نے ان کے پیادہ سپاہیوں کی تعداد تخمیناً چالیس ہزار بتائی ہے جن میں سے ہزارہا قتل ہوئے اور ہزارہا غلام بنا کے بیچ دیے گئے۔ اسی طرح قریوں اور قلعوں پر خون و آتش کا مینہ برساتا ہوا، یونانی لشکر ملی یا مالوی اور اُکسی دراکی وغیرہ آزاد قبائل کی سرحد میں داخل ہوا جو راوی اور جہلم کے سنگم سے لے کر مشرق کی جانب راوی کے دونوں طرف آباد تھے اور ملی غالباً موجودہ ضلع منٹگمری تک پھیلے ہوئے تھے۔ سنسکرت کی صرف و نحو کی ایک مثال میں اتفاق سے ان قوموں کا اصلی نام محفوظ رہ گیا، اور مہابھارت میں بھی کئی جگہ ان کا ذکر آیا ہے جس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ پہلی قوم مالو اور دوسری کشدرا کہلاتی تھی۔ یونانی راوی لکھتے ہیں کہ ان ہمسایہ قوموں نے اپنے جھگڑے بھلا کر سکندر کے مقابلے میں ایکا کرنا چاہا تھا مگر ابھی وہ یہی بحث کر رہے تھے کہ سپہ سالاری کس قوم کے آدمی کو دی جائے کہ سکندر نے یک بہ یک قوم مالو پر تاخت کی اور اس حال میں کہ وہ بے ہتھیار اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے، ان کے ہزاروں آدمی مار ڈالے[1]۔ پھر شمال مشرق میں بہت دور تک ان کا پیچھا کیا اور کہیں انھیں دم لینے کی مہلت نہ دی۔ آخر وہ راوی کے دوسرے کنارے پر ایک قلعے میں پناہ گزیں ہوئے اور وہیں سکندر کے خطرناک تہور کا وہ واقعہ پیش آیا جس میں وہ خود قلعے کی فصیل پر چڑھ گیا اور دوسری طرف محصورین کے مجمع میں کود پڑا تھا۔ صرف دو آدمی اس کے ساتھ فصیل پر چڑھ سکے تھے اور پھر جوش میں یکبارگی بہت سے سپاہیوں کے چڑھنے سے وہ سیڑھیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ غرض بہت دیر تک وہ دشمنوں میں گھر کر تنہا لڑتا رہا اور آخر مقدونی فوج بہ مشکل کسی نہ کسی طرح قلعے میں گھس آئی تو زخمی بادشاہ کو غش آ رہے تھے اور بعد میں کئی مہینے تک وہ صاحبِ فراش رہا۔

---

[1] "اُرلی ہسٹری" صفحہ ۹۵-۱۲

باب ۶

۳۲۵ء (ق م) کے آغاز میں یونانی لشکر پنجاب کی سرحد اور دریاؤں کے آخری سنگم سے بڑھ کر ملکِ سندھ میں داخل ہوا جہاں تین چار بڑی بڑی ریاستیں تھیں اور ان کے معاملات میں برہمنوں کا بہت کچھ دخل تھا۔ چھ سات مہینے تک سکندر ان علاقوں میں تیغ زنی کرتا رہا اور جن رئیسوں نے اس کی اطاعت قبول نہیں کی وہ مارے گئے یا قید کر لیے گئے۔ سکندر کے ناگہانی حملوں نے ملک بھر میں تہلکہ ڈال دیا تھا اور یونانی روایات کے بموجب صرف جنوبی سندھ کے معرکوں میں اسّی ہزار ہندوستانی قتل ہوئے اور بے شمار مرد و عورت غلام بنا کے بیچ ڈالے گئے[۱]۔

ایران کی روانگی

آخر خدا خدا کر کے یہ سیلاب جس کا اُتار، چڑھاؤ سے بھی زیادہ خوفناک تھا، ممالک ہند سے دفع ہوا۔ شہر پٹالا سے جو ان دنوں دریائے سندھ کے مثلث نما دہانے کے نقطۂ راس پر واقع تھا سکندر نے براہ کرمان ایران کی راہ لی اور بیڑا اپنے ایک سردار کو دیا کہ ساحل کے قریب قریب چل کر خلیج فارس میں دریائے فرات کے کنارے تک پہنچ جائے اور اپنے بحری سفر کی مفصل سرگذشت پیش کرے۔ خود سکندر اور یونانی لشکر اکتوبر ۳۲۵ء ق م کے اخیر میں چار مہینے کا آذوقہ ساتھ لے کر موجودہ بلوچستان کے راستے ایران روانہ ہوئے کہ ساحل پر جا بجا بیڑے والوں کی آسانی کے لیے ٹھیرنے کے مقام اور سامان خور و نوش مہیا کر دیں لیکن تھوڑی دُور چل کر اپنی ناواقفیت کے باعث وہ کوہ تلاری بند کے شمال میں بڑھ گئے اور ساحل بحر کی بجائے اس ریگستان کے سمندر میں جا گھسے جہاں پانی نایاب تھا اور اس جاڑے کے موسم میں بھی دن کو بلا کی گرمی پڑتی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ریت میں سفر کرنا عذاب ہو گیا تھا اور انسان و حیوان کے پاؤں اندر دھنسے جاتے تھے۔ اس چند روز کی صحرا نوردی میں جس قدر آدمی ضایع ہوئے اُن کی تعداد ہندوستان کی تمام لڑائیوں کے نقصانات سے زیادہ تھی[۲]۔ دوسرے

---

[۱] ۔"ارلی ہسٹری" صفحۂ ۱۰۱ - ۱۲

[۲] ۔ بیوری تاریخ یونان آخری باب۔

باب ۶

جس قدر لوٹ کا مال ہندوستان سے باندھ باندھ کر لائے تھے وہ سب اسی ریگستان میں جہاں اپنا چلنا دشوار تھا، تلف کردینا پڑا، اور جان سلامت لے کے گدروسیہ (کرمان) کے قدیم صدر مقام پورا (موجودہ بامپور) میں پہنچ جانا ہی بہت غنیمت سمجھے (جنوری ۳۲۴ء ق م) بھوک پیاس کے مارے سپاہیوں نے کئی ہفتے یہاں آرام لیا پھر آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے شاید ماہ مئی کے آغاز میں شوس پہنچ گئے۔

ہندوستانی صوبوں کا آزاد ہوجانا

سکندر کو ہندوستان سے پیٹھ پھیرتے دیر نہ ہوئی تھی کہ اس کے نئے مقبوضات میں بغاوتیں ہونے لگیں دریائے سندھ کے مشرق میں اس نے براہ راست اپنا قبضہ نہیں رکھا تھا لیکن جیساکہ اوپر بیان ہوچکا ہے، مغرب میں اس نے اپنی سلطنت کے دو صوبے بنائے تھے اور ان کی حدود قریب قریب وہی تھیں جو آج کل صوبۂ سرحدی اور ملک سندھ کی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ وہ ہندوستان پر مئی ۳۲۷ء ق م میں بڑھا اور ۳۲۴ء ق م کے اسی مہینے میں واپس پائے تخت ایران میں پہنچ گیا، سکندر کی ہندی مہم میں تین سال صرف ہوئے۔ مگر سرحد ہندوستان سے رخصت ہوئے شاید تین مہینے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ شمالی صوبے کے اجیر (ہندی؟) سپاہیوں نے سازش کی اور وہاں کا یونانی عامل انھی اہل سازش کے ہاتھ سے مارا گیا۔ پھر ان بعید علاقوں پر قبضہ رکھنے کی سکندر نے جو تدابیر سوچی تھیں وہ عمل میں آنے نہ پائی تھیں کہ اگلے سال موت نے خود اس کا کام تمام کردیا (جون ۳۲۳ء ق م) اور تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف یہ ہندی مقبوضات آزاد ہوگئے بلکہ ان یونانیوں تک کا کچھ پتہ نہ چلا جنھیں سکندر نے اپنے بنا کردہ ہندوستانی شہروں میں بسادیا تھا۔

بایں ہمہ، یورپ کے بعض مصنف سکندر کے اس حملے کو یونانیوں کا عجیب و غریب کارنامہ بتاتے ہیں اور سکندر کے غیر معمولی اوصاف کی مدح میں انھوں نے صفحے کے صفحے بھر دیے ہیں۔ حالانکہ اگر یونانی روایات کی بلارو رعایت تنقید کی جائے تو غالباً نتیجہ برعکس نکلے گا اور اس حملے میں

323 — B.C.

باب ۶

نہ یونانیوں کی بہادری نظر آئے گی نہ دانائی نہ کامیابی! بلکہ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کی لڑائیوں کو یونانیوں کا اس طرح بڑھا چڑھا کے بیان کرنا، پھر اِن کے بقول سکندر کا قریب قریب ہر موقع پر بے خبری میں چھاپہ مارنا، نہتے دشمن پر ناگہاں ٹوٹ پڑنا (صفحہ ۷۲) یا دوستی کا عہد وپیمان کر کے یکایک حملہ کر دینا (صفحہ ۶۰) اس یونانی سورما کی جنگی قابلیت تک کو مشکوک کیے دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی سپہ سالاری پر بھی جسے اب تک قریب قریب سب مانتے آئے تھے، تاریخ یونان کے نامور عالم بیلوخ نے حرف گیری کی ہے[۱] اور اس کی ذات کے متعلق تو گروٹ اور ٹی. بہر جیسے اہل الرائے متفق ہیں کہ سکندر نہایت شہرت پسند اور خود پرست جابر تھا جس میں شاہانِ جابر کے تمام بُرے اوصاف موجود تھے[۲]۔ اور ہمارے خیال میں اُس کے شوقِ خود نمائی کا سب سے بڑا ثبوت وہ احکام ہیں جو ہندوستان سے چلتے وقت اس نے ایک بہت بڑی "چھاؤنی" بنانے کے متعلق دیے تھے۔ اس چھاؤنی میں سپاہیوں کے کمرے اور اُن کے پلنگ اور اسلحہ وغیرہ سب اتنے بڑے بڑے بنوائے تھے جن سے یہ گمان ہو کہ یہ کسی چوگزی مخلوق کے برتنے کا ساز و سامان ہے۔ اور ان فرضی یادگاروں کو بیاس کے کنارے چھوڑ جانے کا منشا یہ تھا کہ اہلِ ہند کے دل میں مدت دراز تک یونانیوں کی عظمت وہیبت کا نقش رہے۔ یونانی راویوں کے متفق اللفظ ہونے کے باوجود ونسنٹ اسمتھ اس روایت کو "سکندر اعظم" کی شانِ متانت و وقار کے خلاف بتا کر، اس کی صحت سے انکار کرتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ جو بندۂ لایعقل، سکندر کی مثل، بنی نوع سے اپنی پرستش کرائے، وہ اس قسم کی ہر "لایعنی حرکت" کا ارتکاب کر سکتا ہے!

اوصافِ ذاتی سے قطع نظر، خود یہ بات بحث طلب ہے کہ سکندر نے شاہِ فاتح کی حیثیت سے ہندوستان پر فوج کشی کی تھی یا راجہ ٹکسیلا کی مدد کے

---

[۱]۔ انسائیکلو۔ جلد اول صفحہ ۵۴۹۔ کالم ۲۔
[۲]۔ " " " " " "

باب ۶

بھروسے پر محض شوقِ غارت گری اسے ادھر کھینچ لایا تھا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو، اس میں کچھ شک نہیں کہ یونانیوں نے سکندر اور اس کی فوج کی شجاعت و فتوحات کے متعلق جو عجیب عجیب افسانے مشہور کر رکھے ہیں، ہندوستان کی مہم میں ایک حد تک ان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دارائے ایران پر (جس کے ادنیٰ جاگیر دار پورس اور مکانوس (سندھی) وغیرہ سے قوت و ثروت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے) سکندر کے اس قدر آسانی سے غالب آنے کی وجہ کیا تھی؟ مشرقی اور مغربی مصنفوں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہمیں ہند و ایران کا صرف یہ فرق دکھانا مقصود ہے کہ ایرانیوں نے سکندر کو اپنا قومی بادشاہ بنا کے سجدہ کیا، مگر ہندوستان میں صرف سرحدی اضلاع پر اس کی جو کچھ آؤ بھگت ہوئی، وہ بالکل معمولی تھی اور اس کے جانے کے بعد تو بہت جلد اہلِ پنجاب و سندھ اس بات کو بھی بھول گئے کہ اس نام کا کوئی بادشاہ ان کے ملک پر حملہ آور ہوا تھا۔

حملے کے بالواسطہ فوائد

اگرچہ سکندر کے اس حملے سے براہِ راست ہندوستان پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا نہ اس کی فتوحات دیرپا ثابت ہوئیں۔ بایں ہمہ اہلِ مغرب کو شاید پہلی دفعہ تین برّی اور ایک بحری راستے کا علم ہو گیا جن سے وہ تجارت یا سیاحت کرنے ہندوستان آ سکتے تھے۔ کچھ عرصے بعد باختر میں نیم یونانی سلطنت قایم ہوئی تو وہاں کے بادشاہ بھی انھی سکندری فتوحات کی بنا پر شمال مغربی ہند کی وراثت کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان وجوہ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہنا کچھ بے بنیاد نہیں کہ حملۂ سکندر کی بہ دولت مغرب و مشرق میں رابطۂ باہمی کی نئی راہیں نکل آئیں اور ایک دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع پیدا ہو گیا چنانچہ بعض مصنفوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بودھ مت کے آیندہ تغیرات میں اُن فلسفیانہ خیالات کو بھی دخل تھا جو یونان سے آئے تھے اور اسی طرح دینِ مسیحی کے بعض فرقوں نے بودھ مت کے عقائد اپنے مذہب میں شامل کر لیے تھے۔ یہ قیاسات غلط ہوں یا صحیح، اس بات کو بھولنا نہ چاہیے کہ ہندوستان کی قومی معاشرت یا نظامِ سلطنت پر تو یونان کا کوئی اثر نہیں پڑا اور فنِ جنگ تک میں اہلِ ہند نے وہ سبق بہت جلد بھلا دیے جو سکندر کی تیز تلوار نے انھیں دیے تھے چنانچہ ہند کے بادشاہ انھی رتھوں اور جنگی ہاتھیوں کے بل پر میدان میں نکلتے رہے جیسا کہ

قدیم سے دستور تھا ××× اور انھیں کبھی اس قسم کی جنگی قواعد اور یکبارگی حملے پر قدرت حاصل نہ ہوئی جو سکندری رسالے کی خصوصیات تھیں، اور جن سے سولھویں صدی عیسوی تک میں بابر نے کام لیا۔ اور کامیابی پائی"۔

(اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۷)۔

باب

پہلی فصل چندر گُپت کا زمانہ

"ارتھ شاستر"

چندسال ہوئے ریاست میسور کے سرکاری کتب خانے سے کتاب "ارتھ شاستر" (یعنی اصول حکمرانی) کا ایک نسخہ برآمد ہوا جس کی تصنیف کو راجہ چندر گُپت کے برہمن وزیر چانک یا کوتلیا نامی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس شخص کے متعلق بعض کہانیوں میں لکھا ہے کہ وہ جتنا بدسرشت تھا[۱] اسی قدر خدا نے اسے بدصورت بنایا تھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ چندر گُپت کی تخت نشینی میں (۳۲۳ سنہ ق م) سازش و فریب کو بھی دخل تھا اور چونکہ مگدھ کے پہلے فرماں روا (مہاپدنند راجہ) کو معزول اور قتل کرنے کے بعد رعایا کی وہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں جو غالباً چندر گُپت نے انھیں دلائی تھیں، پس عام طور پر اس کی طرف سے بددلی پھیل گئی اور نئے بادشاہ کے تشدد[۲] کا الزام اس کے چالاک وزیر کے سر پڑا۔ بہرحال "ارتھ شاستر" اس بدنام وزیر کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اتنا تو مسلم ہے کہ وہ اسی چوتھی صدی ق م کے اواخر کی کتاب ہے اور اس میں خاص اپنے یا کچھ پہلے زمانے کے آئین مصنف کی پیش نظر تھے۔

۱۔ ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے "ارتھ شاستر" کے بعض فقروں سے مصنف "اتھروید" کا پیرو ثابت ہوتا ہے اور یہ خاص جادو اور شعبدوں کا وید سمجھا جاتا ہے۔ (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۸۵)۔

۲۔ چندر گُپت کی جابرانہ سختی اور مطلق العنانی کے متعلق ملاحظہ ہو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۷۵۔

"ارتھ شاستر" میں واقعاتِ تاریخی مذکور نہیں ہیں بلکہ اسے پڑھ کر ان کی طلب، اور نہ ہونے کا تاسف، سوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغیر ان کے ہم ان مدارج ارتقائی کا کچھ پتا نہیں چلا سکتے جنھیں طے کر کے ہندوستان شخصی حکومت کی اُس آخری منزل تک پہنچ گیا تھا جس کا ارتھ شاستر میں حال بیان کیا گیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اپنی ابتدائی اور سادہ صورت میں شخصی حکومت محض بزرگِ دیہ یا شیخ قبیلہ کی حکومت ہوتی ہے اور اس میں حقِ وراثت کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ریاست کا ملکِ موروثی بن جانا شخصی حکومت کی دوسری منزل ارتقائی ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے کہ بادشاہ موروثی اور بالکل مطلق العنان ہو اور کسی کو اس کے حکم کے خلاف لب کشائی کا حق نہ ہو۔ وہ ذرا سی بات پر جس دشمن سے چاہے لڑائی چھیڑ دے اور جن شرائط پر مناسب جانے صلح کر لے۔ ملک اس کی ذاتی جاگیر بن جائے اور اہلِ ملک آلات بے جان کی مثل اُس کے اشارے پر حرکت کریں!

شخصی حکومت کے اس درجۂ تکمیل کے لیے سلطنت کا وسیع ہونا ضروری ہے کیونکہ کسی چھوٹی ریاست کے موروثی مالک کو خدائی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا نہ زیب دیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں بڑے بڑے بادشاہوں کی چھوٹے رئیس بھی نقل اُتارنی سیکھ جائیں اور اپنی اپنی جگہ وہی حرکتیں کرنے لگیں جن کی رسم بڑے درباروں میں پڑی تھی۔ غرض تاریخ میں ہندوستان کی پہلی شخصی حکومت سلطنت مگدھ میں قایم ہوئی اور اسی کے واقعاتِ تاریخی کی نایابی کا افسوس ہے کہ اب ہم کسی طرح ان اسباب و حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جن کی بہ دولت اس مشرقی ریاست کو یہ فروغ حاصل ہوا کہ اس کی سرحدیں بنگالے سے پنجاب تک پھیل گئیں۔

توسیع سلطنت

اتنی بات یقینی ہے کہ چندرگپت نے بنی بنائی سلطنت پر قبضہ کیا تھا[1] اور اس کی قوت ہندوستان کی تمام ریاستوں سے زیادہ تھی۔ رومی مصنف پلینی کی کتاب میں

---

[1] نند راجہ کی فوج ۲ لاکھ پیادہ ۲۰ ہزار سوار ۶ ہزار فیل جنگی پر مشتمل بتائی گئی ہے۔ (دامتھ صفحہ ۱۲۵) لیکن پروفیسر رہس ڈیوڈ کے نزدیک خود چندرگپت کے زمانے میں پیادہ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار ہونی چاہیے جو کاتب کی غلطی سے ۶ لاکھ بن گئی ہے۔ صفحہ ۲۶۶۔

باب

ان ریاستوں کی فوجی قوت کا باہم موازنہ کیا ہے:-

(۱) مگدھ	۶ لاکھ پیادہ	۳۰ ہزار سوار	۹ ہزار جنگی ہاتھی	
(۲) کلنگ	۶۰ ہزار "	۱۰ ہزار "	۷ سو " "	
(۳) تلکٹا	۵۰ " "	۴ " "	" "	
(۴) آندھر	ایک لاکھ "	۲ " "	ایک ہزار "	"

یہ عہد چندر گپت کے اعداد ہیں جو بلاشبہ مگاس تھنیز کی کتاب "انڈکا" سے ماخوذ ہوں گے اور اگر بالکل صحیح نہ مانے جائیں تو بھی یہ ظاہر ہے کہ مگدھ کی سلطنت سب پر فائق تھی اور نہ صرف کوسل کا قدیم راج اس میں جذب ہو چکا تھا، بلکہ سکندر کے جاتے ہی پنجاب بھی اس کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اور یہ دونوں اتنے قریب کے واقعات ہیں کہ ممکن ہے ان میں اور سکندر کی ہندوستان سے پسپائی میں کوئی تعلق ہو یعنی مگدھ کا نند راجہ یا اس کا عزیز چندر گپت سکندر ہی کو روکنے کے لیے بڑھا ہو اور سکندر یا اس کی فوج کو ہندی ٹڈی دل کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پڑی ہو اور وہ سرحد ہی[1] سے لوٹ مار کرتے واپس چلے گئے ہوں! کسی یونانی یا مغربی مصنف کی تحریر سے اس قیاس کی تائید چاہنا فضول ہے۔ ان سب نے سکندر کو بالاتفاق اتنا بڑا کشور کشا اور غیر معمولی سپہ سالار بنایا ہے کہ جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت نہ ٹھیر سکتی تھی۔ قدیم ایران کے اثر سے دورِ متوسط کے مسلمانوں میں بھی اسی قسم کے عجیب عجیب افسانے مشہور ہو گئے تھے اور حال میں جن علما نے (جیسے جرمن پروفیسر بیلوخ نے) اس کی سپہ سالاری پر حرف زنی کی ہے انھوں نے بھی بالعموم ہندوستانی مہم کی یونانی روایات کو بجنسہٖ تسلیم کر لیا ہے حالانکہ ان کے مبالغہ آمیز ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ ان غیر اہم قرائن سے قطع نظر جن پر مفصل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں، خود ہی واقعہ کہ ۳۰۳ ق م میں چندر گپت نے سلیوکس (سلوکس) کو شکست فاش دے کر کوہستان سلیمان کے پار کا وہ سارا ملک لے لیا جو اب دولت افغانستان

[1] پلینی کا قول ہے کہ سکندر کے حملے کے وقت بھی دریائے سندھ تک مگدھ کے راجہ کی عملداری تھی۔ بدھسٹ انڈیا صفحہ ۲۶۷ بحوالہ پلینی۔

303 - BC Selukas

باب

کہلاتا ہے، مذکورۂ بالا قیاس کی بالواسطہ تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ جنگی ساز و سامان اور غالباً تعداد کے اعتبار سے، سلیوکوس کا لشکر اپنے نامور آقا سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اور بعض اقوال کے بہ موجب سلیوکوس نہ صرف سکندر کے مفتوحہ علاقے واپس لینا چاہتا تھا بلکہ مشرقی ممالک گنگا پر بھی اس کی نظر تھی[1]۔ کم سے کم وہ ان کے مقابلے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ بایں ہمہ لڑائی میں شکست کھائی اور اُلٹے اپنے تین صوبے (ست رائی) ہند کے فاتح راجہ کے حوالے کرنے پڑے۔ دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے اس نے اپنی بیٹی بھی چندرگپت کو بیاہ دی تھی۔ اور اسی کے ہمراہ یونانی سفیر مگاس تھنیز پاٹلی پترا میں بھیجا گیا۔

دوسری فصل۔ مگاس تھنیز کی تحریریں

یہ سفیر بہت دن تک مگدھ کے پائے تخت میں رہا اور اس نے ہندوستان کے جغرافی اور سیاسی حالات لکھے جن میں کچھ اُس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی تھے اور بہت سی باتیں سُنی سنائی جمع کر دی تھیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، مگاس تھنیز کی اصل کتاب مفقود ہو گئی اور اب اس کے صرف وہ اجزا ملتے ہیں جنھیں دوسرے مصنفوں (خاص کر ایریان) نے نقل کیا ہے۔ اور ان منقولات میں بہت سے قصّے ایسے ناقابل اعتبار ہیں کہ بعض اہل الرائے نہ مگاس تھنیز کو سچا جانتے ہیں اور نہ اس بات کا انھیں اطمینان ہے کہ یونانی مصنفوں نے ان کے اقوال بجنسہ اور بلا کم و کاست نقل کر دیے ہیں[2]۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مگاس تھنیز جس تمدن میں خود پلا تھا ہندوستان کا تمدن اس سے بالکل مختلف تھا اور اس لیے وہ یہاں کی ہر چیز اور ہر آئین و رسم کو

---

[1] و۔ اسمتھ۔ صفحہ ۱۱۹۔

[2] بدھسٹ انڈیا صفحہ ۲۶۱ وغیرہ۔

سخت حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہاں کی زبان اور عادات سے بہ خوبی واقف نہ ہونے کے باعث بعض باتوں کے کچھ سے کچھ معنی سمجھ لیتا ہے۔ جیسا کہ آج کل بھی تازہ ولایت انگریز ہندوستانیوں کے متعلق بعض اوقات عجیب عجیب خیالات قایم کر لیتے ہیں مختصر یہ کہ اُس کی تحریر یا وہ اقوال جو اس سے منسوب ہیں، مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ تمام اسقام اور غلطی کے امکانات مدِ نظر رکھنے چاہئیں۔

راجہ کی ذات ومشاغل

چندر گپت کی نسبت مگاس تھنیز کہتا ہے کہ وہ بالعموم محل کے اندر اپنی خواصوں[1] میں گھرا رہتا ہے مگر دن میں ایک مرتبہ اُسے (یعنی بادشاہ کو) اپنی صورت لوگوں کو دکھانی ضروری ہے اور انھی اوقات میں وہ فریادیوں کی فریاد سنتا اور مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب وہ باہر آکر بیٹھے تو رسم ہے کہ چار نوکر اس کی چپی کرتے اور ہاتھ پاؤں دباتے ہیں۔ شکار کا اسے بہت شوق ہے اور اس کے لیے ہانکا دے کر جنگلی جانوروں کو ایک مخصوص احاطے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ تیر سے اُن کا شکار کرتا ہے۔ ہاتھی، گینڈے، سانڈ اور مینڈھے کی لڑائی بادشاہ کی تفریح کا سامان ہے اور کبھی کبھی اس کے حضور میں پہلوانوں کی کشتیاں بھی ہوتی ہیں۔

محلاتِ شاہی

شاہی محلات کے متعلق مگاس تھنیز کا بیان ہے کہ وہ سُوس، وہمدان کے ایرانی محلوں سے بھی آرایش وشان شوکت میں بڑھے چڑھے تھے۔ یہ عمارتیں زیادہ تر لکڑی کی بنائی جاتی تھیں لیکن ان کے ستون و رواق کو سونے کے پانی سے رنگ کر ان پر جابجا سونے

---

[1] ۔ (چندر گپت کے) "دربار میں تربیت یافتہ طوائف کی بڑی قدر ہوتی تھی اور یہ رسم بد تھوڑے دن پہلے تک ہندوستانی رئیسوں کے ہاں جاری تھی بلکہ بعض مقامات پر شاید اب بھی جاری ہو۔ چندر گپت کی سرکار میں یہ عورتیں خادمہ کی حیثیت سے گھر کا کام کاج کرتی تھیں عطر لگانا، ہار گوندھ کے پہنانا، چتر برداری وغیرہ کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور دربار میں سواری کے وقت جلو میں رہتی تھیں۔ عام رنڈیوں کی بھی سرکاری طور پر پوری نگرانی رکھی جاتی تھی اور اُن کو کچھ روپیہ سرکاری خزانے میں داخل کرنا پڑتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں دکن کی ریاست بجے نگر (Vijayanagar) میں اس قسم کی رسوم کا ثبوت ملتا ہے مگر حکومت موریا کے محکمۂ سراغ رسانی کو ان رنڈیوں سے خفیہ معلومات حاصل کرنے میں بھی کچھ عار نہ تھا۔" (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۷۹)۔

باب۳

چاندی کی بیلیں چڑھاتے جن کی شاخوں پر زمزمہ سرا طیور بنے ہوئے ہوتے تھے۔ زر و جواہر کی یہ کثرت اب سے دو صدی پہلے تک ملکِ ہندوستان کا مایۂ امتیاز تھی لیکن یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی تہذیب و تمدن خاص کر شاہی آداب اور سامان عشرت و تکلفات میں ہندوستان کے درباروں پر ایران کا اثر نمایاں تھا اور وہاں کے بعض طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی[1]

شہر "پاٹلی پترا"

پائے تخت کے بیان میں میگاس تھنیز کی کئی تحریریں محفوظ ہیں قدیم ہندوستان کا یہ نامور شہر سون اور گنگا کے سنگم پر واقع تھا جہاں اب "پٹنہ" اور بانکی پور آباد ہیں۔ اور ان کی مثل اس کی آبادی بھی عرضاً کم اور طولاً دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ حفاظت کے لیے اس کے گرد شہتیروں کی نہایت مستحکم اور چوڑی شہر پناہ بنائی تھی جس میں ۶۴ دروازے اور ۵۷۰ برج تھے اور فصیل کی خندق کے لیے سون کا پانی آتا تھا۔ میگاس تھنیز اس خندق کا عرض دو سو گز اور گہرائی ۳۰ ہاتھ بتاتا ہے[2]۔ اور اتنی عریض خندق دنیا میں بہت کم کسی شہر پناہ کے گرد بنی ہوگی۔ لیکن شاید سب سے زیادہ قابل ذکر وہ شہری مجلسیں ہیں جن کا میگاس تھنیز نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کوئی جماعت تو صنعت و تجارت کی نگرانی کرتی تھی اور کسی کے سپرد اہل شہر کی ولادت و اموات لکھنے کا کام تھا تاکہ سرکار کو رعایا کے حال کی خبر رہے اور محصولات کے لگانے میں آسانی ہو۔ شہر کی ان سرکاری مجلسوں کے فرائض و ضوابط اتنی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں کہ بعض جزئیات پر گو راوی کی من گھڑت معلوم ہوتی ہیں اور بعض اوقات شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ تمام "شہری نظام" کسی ذہین یونانی مصنف کا نتیجۂ فکر نہ ہو جس نے اپنے شہر والوں کو توجہ دلانے کی غرض سے میگاس تھنیز کا قول بنا کر اسے پاٹلی پترا سے منسوب کر دیا اور بعد میں عام طور پر اس کی روایت کو لوگ صحیح سمجھنے لگے؟

[1] مثلاً راجہ بیماری میں "مقدس آتش" کے روبرو بیٹھ کر اطبا سے مشورہ کرتا تھا یا "سر دھلائی" کا دھوم دھام سے جلسہ کیا جاتا تھا اور یہ وہ رسم ہے جو شاہانِ ایران جشنِ سالگرہ کے وقت مناتے تھے۔ (آوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۷۹)۔

[2] وی۔ اسمتھ صفحہ ۱۲۴۔

جلسہ کی تعداد، شہر جو تھی - (۱) صنعت و حرفت - (۲) اجنبی

باب ۴

فوجی نظم اور اسلحہ

تعداد فوج کے متعلق ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ راجہ چندر گپت کے زمانے میں مگدھ کی جنگی قوت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس کے لشکر میں ٦ لاکھ پیادہ ٣٠ ہزار سوار اور ٩ ہزار ہاتھی تھے۔ مہاوت کے علاوہ، ہر ہاتھی پر تین تیر انداز ہوتے اور یہ میدان جنگ میں آج کل کے توپ خانے کی طرح سب سے آگے آگے رہتے تھے۔ ان کے سوا ٨ ہزار جنگی رتھیں تھیں اور ہر ایک میں کم سے کم تین لڑنے والے سپاہی ہوتے تھے رتھ میں دو اور بعض اوقات چار گھوڑے لگاتے اور یہ بالعموم سواروں کے ساتھ فوج کے بازوؤں پر رہتی تھیں۔ سواروں کے پاس صرف دو بھالے اور ایک ڈھال ہوتی تھی لیکن پیادہ سپاہی تیغ سے مسلح ہوتے اور سانگ یعنی چھوٹی برچھی (جسے پھینک کر مارتے ہیں) یا تیر کمان لیے رہتے تھے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام فوج ایسے تنخواہ دار سپاہیوں کی تھی جن کا پیشہ ہی سپہ گری تھا اور جو اپنی چھاؤنیوں میں انھی مشاغل میں مصروف اور بادشاہ کے حکم پر جنگ کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی نگرانی اور انتظام کی غرض سے ایک محکمۂ جنگ[1] قایم تھا جس کی چھ شاخیں تھیں۔ یعنی پیادہ و سوار فوج اور جنگی رتھوں اور فیل خانے وغیرہ کے انتظام کے لیے ایک ایک شاخ الگ بنادی گئی تھی، اور ہر ایک میں پانچ پانچ عہدہ دار کام کرتے تھے۔

عام حالات

۱ سلطنت کے مختلف صوبوں پر بالعموم شاہی خاندان کے افراد صوبہ دار مقرر کر دیے جاتے تھے اور پرچہ نویسوں کے ذریعے ان کی خبریں راجہ کو پہنچتی رہتی تھیں اور اگر مگاس تھنیز کا قول صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صدر حکومت کی عمّال و رعایا کے ہر طبقے پر کافی سے زیادہ نگرانی تھی اور جاسوسی کا بہت بڑا محکمہ قایم تھا۔

۲ لیکن اس عہد کے لوگوں کی دماغی اور اخلاقی حالت کا شاید سب سے اچھا اندازہ جرائم اور سزاؤں کا حال پڑھ کر ہو سکتا ہے اور ان کی خاصی تفصیل ارتھ شاستر اور مگاس تھنیز کے اجزا میں موجود ہے۔

[1] کتاب ارتھ شاستر" سے جس میں سلطنت کے تمام محکموں کے نام اور کام لکھے ہیں اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ محکمۂ جنگ بھی کوئی علیحدہ محکمہ ہوتا تھا۔ دیکھو اسمتھ صفحہ ۱۴۱۔

یونانی سفیر لکھتا ہے کہ ہندوستان میں جرائم کا ارتکاب کم ہوتا ہے اور جب ہوتا ہے تو اس کی نہایت سخت وعبرت انگیز سزائیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ راجہ کی سواری نکلتے میں کسی قسم کا ہنگامہ کرنا، یا ادائے محصول سے بچنے کی کوشش بھی سنگین سزا کے لایق سمجھی جاتی ہے۔ بغاوت یا بادشاہ کے خلاف کسی قسم کی سازش سب سے بڑا جرم سمجھی جاتی تھی اور اس کے مجرم کو زندہ آگ میں جھونک دیتے تھے حتیٰ کہ برہمن بھی جنھیں سخت سے سخت جرم کی سزا میں صرف جلاوطن کرنا، جائز تھا مذکورۂ بالا جرائم کی پاداش میں سزائے موت کے مستوجب سمجھے جاتے تھے[1] اور اسی واقعے سے ہندوستان میں مطلق العنان بادشاہوں کا غیر معمولی مرتبہ ظاہر ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے مذہب کے عزیز ترین اصول میں بھی استثنا کر دیا گیا تھا۔ سرکاری ملازمین کا آٹھ دس پن چرا لینا انھیں سزائے موت کا مستوجب بنا دیتا تھا[2]۔ اور ونسنٹ اسمتھ کا قیاس ہے کہ پن چاندی کا سکہ ہوتا تھا جس کی قیمت تقریباً ایک انگریزی شلنگ کے برابر سمجھنی چاہیے۔ اصولاً آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کا قانون رائج تھا لیکن بعض معمولی قصوروں پر بھی اعضا کی قطع وبرید جایز سمجھی جاتی تھی اور ایک عجیب سزا یہ تھی کہ خاطی کا سر منڈوا دیا جائے۔ اس "مجموعۂ تعزیرات" کا شاید سب سے خوفناک حصہ وہ ہے جس میں اقبال جرائم کے لیے ملزم کو اذیت پہنچانے کی اٹھارہ شکلیں بیان کی گئی ہیں۔

وسائل آب پاشی

مگر مہاراجہ چندر گپت کے زمانے کی سب سے زیادہ قابل تعریف شئے آب پاشی کے وسائل ہیں جن کا مختلف ذرایع سے اجمالی حال معلوم ہوا ہے۔ یہ تو یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ چندر گپت یا اس کے کسی پیش رو نے باقاعدہ نہریں کھدوائی ہوں گی۔ لیکن ارتھ شاستر میں "آبیانے" کی مختلف شرحیں اور مگاس تھینز کے بعض اقوال سے

۱۔ ملاحظہ ہو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۸۰۔

۲۔ اتنی سخت سزا کے باوجود ارتھ شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمین کی خیانت ورشوت ستانی کا کوئی انسداد نہ ہو سکا تھا، کیونکہ بقول مصنف "جس طرح یہ معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ پانی کے نیچے مچھلی نے کتنا پانی پیا اسی طرح سرکاری عمال کی چوری پکڑنی بھی محال ہے"۔

ثابت ہوتا ہے کہ بارش کے علاوہ بہت سے کھیتوں کو ندی نالے تالاب یا اس قسم کے بند باندھ کر پانی دیا جاتا تھا جن پر سرکاری نگرانی رہ سکتی تھی کم سے کم ایسے ایک بند کا حال تو یقین کے ساتھ ہمیں معلوم ہے جس کی سک دیا سکا (Saka) قوم کے ایک صوبہ دار نے دوسری صدی عیسوی میں مرمّت کرائی تھی۔ اس صوبہ دار کا جو کتبہ گرنار (علاقہ کاٹھیاوار) سے برآمد ہوا ہے اس میں تحریر ہے کہ اس مقام پر سب سے اول چندرگپت کے صوبہ دار نے بند باندھ کر جھیل کا پانی روکا تھا لیکن اس بند کی تکمیل اشوک راجہ کے زمانے میں ہوئی اور وہ چار صدی تک اس علاقے میں آب پاشی کا نہایت عمدہ وسیلہ رہا۔ مگر جب ۱۵۰ء کے سخت طوفان میں بند لوٹا اور جھیل خالی رہ گئی تو اس وقت از سر نو اسے بنوایا اور مذکورۂ بالا کتبہ کندہ کرایا گیا۔

اس واقعے سے نہ صرف سلطنت مگدھ کی وسعت بلکہ نظم ونسق کی بھی خوبی ثابت ہوتی ہے کہ موریا خاندان کے راجہ اپنے دُور دراز کے صوبوں تک کی خبر رکھتے تھے اور انھیں اپنی رعایا خاص کر کاشتکاروں کی سہولت ورفاہ کا بڑا خیال تھا۔ مالگزاری کے قواعد وضوابط ان کی انتظامی قابلیت کے گواہ ہیں جنھیں مگاس تھنیز اور کتاب ارتھ شاستر کے مصنف نے جستہ جستہ نقل کیا ہے۔

چندرگپت کی وفات

غرض چوبیس برس تک کمال شان وشوکت اور حشمت وکامرانی کے ساتھ حکومت کر کے چندرگپت نے دنیا کی ناپایدار خوشیوں پر لات ماری اور سلطنت چھوڑ کر فقیر ہوگیا۔ یہ بیان جینیوں کی ایک مذہبی روایت پر مبنی ہے۔ انھی کا قول ہے کہ یہ راجہ جین مَت کا پیرو تھا اور اسی مِلّت کے ایک گرو کے ساتھ جنوب کے جنگلوں میں نکل گیا تھا پھر وہیں (میسور کے علاقے میں) اس نے فاقہ کشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ یہ عبرت ناک واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، کم سے کم ہمیں قدیم ہندوستان کے حکما کے عقائد وافکار کا سراغ دیتا ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو نہ صرف حقیر وذلیل بلکہ قابل نفرین شے سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک روح کی تمام آلائش وآلام کا سبب ہی جسمانی زندگی تھی جس کا خاتمہ کر دینا گویا روح کو عذاب الیم سے چھڑا دینا تھا۔

غرض خواہ چندرگپت نے اپنے پائے تخت میں مرگِ طبعی سے وفات پائی ہو یا سلطنت سے دست بردار ہو کر چلا گیا ہو، اتنا قریب قریب یقینی ہے کہ اس کا دورِ حکومت

باب

۲۹۸ء ق م میں ختم ہوگیا اور اس کا بیٹا **بندسار** بادشاہی کا وارث ہوا۔

راجہ بندسار ۲۹۸ء تا ۲۷۲ء ق م

اس عہد کے ہمیں اتنے حالات میسر نہیں آتے جتنے چندر گپت کے زمانے کے معلوم ہیں۔ اور مگاس تھنیز کے بعد جو یونانی سفیر دربار مگدھ میں آکر رہے ان کی تحریریں اب بالکل مفقود ہوگئی ہیں۔ البتہ اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ اس راجہ نے جانب دکن سلطنت کو وسعت دی اور نربدا کی بجائے تنگ بھدرا اور پنیار نامی ندیوں سے بھی کچھ آگے بڑھ کر اس کی جنوبی سرحد قایم ہوئی[1]۔ مگر یہ سب قیاسی باتیں ہیں اور بندسار کا نام اس وجہ سے اور بھی تاریکی میں چھپ گیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ اقبال مند باپ کا بیٹا اور اس سے بھی زیادہ نامور بیٹے کا باپ تھا!

[1] ملک تبت کے ایک مورخ (تارا ناتھ) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ بندسار نے مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان تمام ملک فتح کر لیا تھا۔

باب ۸

پہلی فصل عہد اشوک (۱)

راجہ بندُسار کے بیٹے کی بھی اگرچہ باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی لیکن بہت سی باتیں صحت ویقین کے ساتھ معلوم ہیں اور اُس کے مشہور کتبات پڑھ کر یہ دھندلی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے کہ درویشی لباس میں ایک بادشاہ مصروفِ فرماں روائی ہے۔ اگر اشوک نے ہوش آتے ہی یا تخت پر بیٹھتے ہی یہ زہد وتقویٰ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے بارہ تیرہ برس تک اس کی بادشاہی کا رنگ وہی رہا جو دنیا کے اور طاقتور بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے۔ اور اگر وہ ہاتھ جن سے اس نے سلطنت مگدھ کا تاج اپنے سر پر رکھا، بھائیوں کے خون سے لال نہیں ہوئے (جس کے متعلق قرائن کے سوا کوئی قابل سند تحریر نہیں ملتی) تو کم سے کم اُس کشت وخون کا جو ملکِ کلنگ میں ہوا اصلی ملزم وہی ہے۔

فتح کلنگ — کہنے کو تو وہ اپنے باپ کے مرتے ہی تاج وتخت کا مالک ہو گیا تھا مگر تخت نشینی کی رسم چار سال بعد سنہ ۲۶۹ ق م میں ادا ہوئی اور اسی وجہ سے اس قول کو تقویت پہنچتی ہے کہ گو باپ نے اُسے ولی عہد بنا دیا ہو لیکن دوسرے بھائی بھی تخت کے دعویدار تھے اور یہ چار سال انھی کے ساتھ جنگ وکشمکش میں گزرے۔ غرض تخت نشینی کے نویں برس

باب ۵

عہد اشوک کا پہلا واقعہ جو ہمیں معلوم ہو سکا وہ ملکِ کلنگ پر فوج کشی ہے جہاں مگدھ کے ہمسائے میں خود مختار سلطنت قایم تھی۔ بلکہ مگاس تھنیز نے ہندوستان کی جن ریاستوں کا مجمل حال لکھا ہے اُن میں فوجی قوت کے اعتبار سے مگدھ کے بعد دوسرا نمبر کلنگ ہی کا سمجھنا چاہیے کیونکہ ریاست آندھرا میں اگر پیادہ فوج اور ہاتھیوں کی تعداد زیادہ تھی تو سوار فوج کا شمار کلنگ کی نسبت ایک چوتھائی سے بھی کم تھا (دیکھو صفحہ ۸۲) بایں ہمہ یہ ریاست مگدھ کا مقابلہ نہ کر سکی اور سخت کشت وخون کے بعد اشوک نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ اور اب مگدھ میں پنیار ندی تک (موجودہ نیپال و افغانستان سمیت) تمام ہندوستان کا علاقہ داخل ہو گیا اور یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ زمانۂ تاریخی میں نہ پہلے کبھی یہاں قائم ہوئی تھی نہ آیندہ کسی ہندو راجہ کے نصیب میں آئی لیکن فتح وکامرانی کی مسرّت کے ساتھ صاحبِ فکر فاتح کے دل پر ان عظیم مصائب کا بڑا اثر ہوا جو ملک مفتوحہ کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی تھیں اور اس کا ایک ثبوت تو وہ کتبات ہیں جن میں مفتوحہ ملک کے عمّال کو بہ تاکید ہدایت کی ہے کہ رعایا پر کمال شفقت وانصاف کے ساتھ حکومت کریں، اور دوسرا ثبوت وہ اندرونی تغیر ہے جس نے فاتح کو آخر کار بودھ مت کا پیرو بنا دیا۔

کتبات

ان کتبات کی تعداد جو اب تک دستیاب ہوئے ۳۴ ہے اور عجب نہیں کہ آیندہ بھی اس میں اضافہ ہوتا رہے کیونکہ میسور سے ہمالیہ اور خلیج بنگال سے بحرِ عرب کے ساحلوں تک مختلف مقامات پر ان کا پتا چلا ہے اور اتنے وسیع رقبے میں بہت ممکن ہے کہ بعض کتبے ڈھونڈنے والوں کی نظر سے چھپے رہے ہوں۔ مخفی رہنے یا ضایع ہو جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ بعض کتبے پہاڑ کی چٹانوں پر کھدوا دیے گئے تھے اور بعض پتھر کے میناروں پر کندہ ملے ہیں۔ سنینِ کتابت کے اعتبار سے ان کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں:۔

(۱) "چٹان کے کتبات" جن میں "کلنگ کے فرامین" بھی شامل ہیں، ۲۵۷ و ۲۵۶ ق م میں کندہ ہوئے اور ان میں چٹان کے "چودہ فرامین" سب سے زیادہ کارآمد ہیں جن میں اشوک نے اپنے مذہبی عقائد اور اصول حکومت کا ذکر کیا ہے اور اپنے عمّال کو بھی انھی کے مطابق چلنے کی تاکید کی ہے۔

(۲) "تین غاروں کے کتبے" جو ضلع گیا سے برآمد ہوئے ہیں اور جن کی تاریخ کتابت

۲۵۷ءؔ اور ۲۵۰ءؔ ق م ہے اشوک نے بہت سا روپیہ صرف کرکے اُن غاروں میں قابل سکونت مکانات بنوادیے تھے اور انھیں سنیاسیوں کے ایک فرقے کو دے دیا تھا جو بہ اعتبار عقائد بودھ مت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا ان مختصر کتبوں سے بھی اتنا پتا چلتا ہے کہ بودھ مت کا نہایت پرجوش حامی ہونے کے باوجود اشوک دوسرے مذہب کے فقرا کا خیال رکھتا تھا۔

(۳) "ترائی کے دو میناری کتبے" جو ۲۴۹ءؔ میں نصب کیے گئے تھے۔ یہ تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ راجہ اشوک نے واقعی نیپال کے ان علاقوں کا سفر کیا تھا جو بودھ مت والوں کے نزدیک گوتم کا مولد ہیں۔

(۴) "میناری کتبات" جو ۲۴۳ءؔ سے ۲۴۰ءؔ ق م تک کی یادگار ہیں۔ ان میں اول کے سات کتبوں کا مضمون وہی ہے جو پہلے چٹانوں پر کندہ کرایا گیا تھا یعنی وہی احکام زیادہ مفصل اور تاکیدی پیرائے میں میناروں پر کندہ کرادیے ہیں اور باقی تین چھوٹے میناروں کے کتبات میں بودھ مت کے اندرونی اختلافات کا ذکر ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ یہ سب کتبے کسی ایک زبان میں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جس ملک میں جو بولی یا پراکرت رائج تھی وہاں کے کتبے میں اسی سے کام لیا گیا ہے۔ اور پیرایۂ بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب اشوک نے یہ مذہبی احکام و ہدایات کندہ کرائی ہیں، اس وقت ملک میں بودھ مت عام طور پر شایع ہوچکا تھا اور عوام الناس میں بہ کثرت اس کے ماننے یا کم سے کم جاننے والے موجود تھے۔ کتبات کے کندہ اور نصب کرانے کے واسطے وہی مقامات منتخب کیے گئے ہیں جو تیرتھ جاترا یا کسی عام شاہراہ پر واقع تھے۔

مینار اور دیگر عمارات

اشوکی مینار یا لاٹھیں جن میں سے بعض پر کتبہ کندہ ہے اور بعض پر نہیں ہے، ہند کی قدیم سنگ تراشی کا بے بہا نمونہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی بلندی پچاس فیٹ کے قریب ہے اور وہ سب پتھر کی ایک ڈال کو گول تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اشوک نے ایسی بہت سی لاٹھیں جا بہ جا نصب کرادی تھیں اور یہ اس کے ذوق تعمیر کی ادنیٰ یادگاریں ہیں ورنہ عام روایات میں اسے ہزاروں عمارتوں کا بانی قرار دیا گیا ہے جن میں، شاہی محل، گنبد، خانقاہیں وغیرہ ہر قسم کے مکان شامل تھے۔ شان شوکت اور نقش و نگار کے

باب ۳

اعتبار سے یہ بادشاہی عمارتیں صدیوں تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی تھیں لیکن زمانے کی گردش نے آج اُن کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑا اور اس عہد کے اگر آثار قدیمہ کہیں ہیں تو صرف قصبۂ سانچی میں جو اجین سے تقریباً سو میل مشرق میں واقع ہے۔ ولیعہدی کے زمانے میں اشوک، اجین کا صوبہ دار تھا اور اس نے اسی علاقے میں شادی کرلی تھی پس قرینہ کہتا ہے کہ یہاں کی سب نہیں تو بعض عمارات ضرور اس کے حکم سے تعمیر ہوئی ہوں گی۔

سنگ تراشی

اشوک کی عمارات کے منہدم اور بے نشان ہو جانے کے باوجود، میناروں کے علاوہ، اس عہد کی سنگ تراشی کے بعض اور نمونے بھی باقی رہ گئے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس فن کو ہندوستان میں سب سے اول اسی زمانے میں فروغ ہوا[1] کیونکہ اشوک سے پہلے عمارات میں پتھر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے تعمیر و آرائش کے لیے زیادہ تر لکڑی یا ہاتھی دانت سے کام لیتے تھے۔ مگر اشوک زیادہ دیرپا شے کا خواہاں تھا اور ہندوستانی کاریگروں میں بھی اس بات کی استعداد موجود تھی کہ لکڑی کی بجائے پتھر پر اسی قسم کی صناعی دکھادیں۔ چنانچہ "بہت سی جزئیات ظاہر کرتی ہیں کہ یہاں کے سنگ تراش لکڑی اور دانت کے کاریگروں کی تقلید کرتے تھے" اور گو اس فن میں ہندوستان والوں نے اہل ایران و یونان سے استفادہ کیا تھا تاہم اس وقت کے جو نمونے موجود ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم سے کم عہد اشوک میں ہندی کاریگر خود استادِ فن ہو گئے تھے اور انھوں نے ہندوستانی سنگ تراشی کو ممالک غیر سے بالکل جداگانہ اور ممتاز بنادیا تھا چنانچہ بنارس کے قریب قصبۂ سارناتھ سے اور بعض دیگر مقامات سے سنگ تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں، قدیم یونان و ایران میں ان کی نظیر ملنی دشوار ہے اور ہمارے زمانے کے ایک مبصرِ[2] فن کی رائے میں "باقاعدگی اور صحت تراش کے لحاظ سے ایتھنز کی عمارات کی بہترین دستکاری بھی ان سے بڑھ کر نہیں ہے۔"

[1] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۱۱۔

[2] سر جان مارشل۔ ناظم آثار قدیمہ ہند۔

دوسری فصل۔ عہد اشوک (۲)

مذکورۂ بالا کتبات و فرامین سے اس "دھم" (دھرم) یعنی "قانونِ فرائض" کو سمجھنا آسان ہے جس پر اشوک اپنی رعایا کو چلانا چاہتا تھا۔ درحقیقت یہ "بودھ مت" کے بڑے بڑے اصولوں کی عملی تعلیم تھی اور اس کے تین بنیادی عقائد تھے:۔ (۱) جیو رکھشا یا "آہمسا" یعنی جانداروں کو تکلیف نہ دینا (۲) معلّم، والدین اور بزرگوں کا ادب اور (۳) راست گفتاری۔

جیو رکھشا تناسخ اور "کرم" کا مسئلہ ہندوستان کے قریب قریب ہر قدیم مذہب میں کسی نہ کسی پیرائے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ بودھ مت بھی روح کے وجود سے منکر ہونے کے باوجود اِن کی صداقت کا قائل تھا اور چونکہ اس عقیدے کی رُو سے ایک ذلیل کیڑا آئندہ کسی جُون میں دیوتا کے درجے تک ترقی کر سکتا ہے اس لیے ہر جاندار کی جان اسی قدر واجب احترام ہے جس قدر کہ انسان کی اور کسی جاندار کو آزار پہنچانا گویا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ حتیٰ کہ بودھ اور جین مت کے بعض فرماں رواؤں کو اس بارے میں یہاں تک غلو تھا کہ جانوروں کی جان کا آدمی کی جان سے بھی بڑھ کر احترام ملحوظ رکھتے تھے اور اشوک نے بھی جانور کو مارنے کی سزا "موت" رکھی تھی جیسا کہ اس کے بیناری کتبے میں صراحت سے ساتھ مرقوم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بودھ مت کا حلقہ بگوش ہونے سے پہلے جب وہ خونخوار شِو کا پرستار تھا، تو اس کے دسترخوان پر بیسیوں قسم کا گوشت چُنا جاتا تھا اور شاہی ضیافتوں کے موقع پر سیکڑوں جانور مارے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ طریقہ بالکل موقوف ہو گیا اور شکار کی قدیم رسم شاہانہ بھی قطعاً ترک کر دی گئی (۲۵۹ءسنہ، ۲۵۷ء سنہ ق م) پھر ۲۴۳ سنہ میں ایک مفصل قانون شایع کیا گیا جس کی ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذہب و ملّت کا ہو، پابندی لازمی تھی۔ اس قانون میں بعض جانوروں کو مارنے کی قطعاً ممانعت کر دی گئی تھی اور گوشت خواروں کو جن جانوروں کے

کھانے کی اجازت دی گئی تھی ان کے متعلق بہت سی قیود بڑھادی تھیں۔[1]

ادب اور سچائی

اس "دھم" کا دوسرا اصول بزرگوں کی تعظیم و تکریم اور تیسرا راست گفتاری ہے جس پر اشوک اپنے فرامین میں بار بار زور دیتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان اخلاقی فرائض کے واسطے سرکاری قواعد و ضوابط بنانا اتنا کارآمد نہیں ہو سکتا جتنا کہ خود لوگوں کا ان کی خوبیاں سمجھ کر ان پر عمل کرنا مفید ہے۔ چنانچہ اپنے آخری کتبے میں خود اشوک معترف ہے کہ یہ سرکاری قواعد محض لوگوں کی رہنمائی کے واسطے بنائے گئے ہیں ورنہ عمدہ اخلاق اور نیکی اختیار کرنے کی بہترین سبیل یہ ہے کہ خود لوگ غور و فکر سے کام لیں۔

احتساب

لیکن واضح رہے کہ اشوک نے ان قوانین کو نقط کندہ کرا دینے پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ یہ بات تمام بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں کے فرائض میں داخل تھی کہ وہ مقررہ ایام میں اپنے مستقر پر اور جب دورے پر جائیں تو دیہات میں عام جلسہ کر کے اپنے مالگزاروں اور زمینداروں کو "دھم" کی تعلیم اور قوانین شاہی کے مطابق عمل کرنے پر زور دیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص محکمۂ احتساب قائم کیا گیا تھا اور اس کے عہدہ داروں کا کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کے افعال کی نگرانی کریں اور بلا لحاظ مذہب و حیثیت جو شخص مذکورۂ بالا اصولوں کے خلاف چلے اسے سزا دلوائیں۔ تاریخی مواد اور کتابیں میسر نہ آنے کی وجہ سے یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ بادشاہ کی ان کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا اور اسے اپنے منشا میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن مطلق العنان حکومت کا زور اور بادشاہ کو اپنے قانون کے رائج کرنے میں جس قدر انہماک اور جوش تھا اسے دیکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ کم سے کم عہدِ اشوک میں اہلِ ہند ان اخلاقی قواعد و ضوابط کے پابند تھے اور جو دل سے نہ مانتے ہوں وہ بھی ان کی ظاہری تعمیل پر

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ اشوک نے جن جانوروں کو مارنا ممنوع قرار دیا ہے ان میں گائے بیل اور سینگ والے جانور شامل نہیں ہیں اگرچہ اس سے پہلے ان جانوروں کو مارنے پر جرمانے کی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن اشوک نے اتنی سزا کو بھی اپنے قانون میں جائز نہیں رکھا۔

(دیکھو دی اسمتھ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷)

مجبور تھے۔

بیرونی ممالک میں تبلیغ

اس مذہبی جوش کا اقتضا یہ تھا کہ ان کوششوں کو اپنی مملکت تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ گوتم بودھ کی ہدایت کے بہ موجب ممکن ہو تو ساری دنیا میں "دھرم کا ڈنکا" بجا دیا جائے۔ خاص اپنی رعایا میں اس اخلاقی تعلیم کو پھیلانے کی جو تدبیریں اشوک نے اختیار کی تھیں وہ سب اس کی ذہانت اور دماغی محنت کا نتیجہ تھیں اور غالباً پہلے کسی راجہ مہاراجہ نے اپنی سیاست و قوت کو ایسے مذہبی کاموں میں صرف کرنے کا ارادہ بھی نہ کیا ہوگا۔ اسی طرح بیرونی ممالک میں اپنے دین کی تبلیغ کرنے کا کسی ہندی کو سب سے پہلے خیال آیا تو وہ بھی مگدھ کا یہی نامور بودھ راجہ ہے۔ اس کے واعظ تبّت افغانستان اور شمالی دکن کی بعض خراجگزار ریاستوں میں گئے بلکہ انتہائے دکن اور لنکا تک پہنچے اور کتبوں کا اعتبار کیا جائے تو مصر و یونان کے بعید ممالک بھی اس تبلیغ کے دائرے سے باہر نہ رہے۔ لیکن اس آخری قول کی تصدیق میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ کمزور ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کا یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جو غالباً اپنے مذہب کی شوکت نمائی کے لیے اس نے کتبات میں کندہ کرا دیا ہے[1]۔

لنکا میں کامیابی

بہرحال، اس کوشش میں سب سے بڑی کامیابی جزیرۂ لنکا میں حاصل ہوئی جہاں اشوک نے خاص اپنے بھائی مہندر یا مہندا کو سرگروہ بنا کے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھیوں کی تقریر اور ایسے طاقتور بادشاہ کے اثر سے راجہ لنکا (ٹیسا) اور اس کے امیروں نے بودھ مت قبول کر لیا اور چند ہی سال میں یہ مذہب اس ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔ حتیٰ کہ اگر صحیح معنی میں کوئی قوم آج تک بودھ مت کی پیرو ہے تو وہ لنکا ہی کے سنگھالی ہیں جن کی تعداد اکیس لاکھ سے کچھ اوپر ہے۔

دیگر بعید ممالک میں اس تبلیغ و دعوت کا جو کچھ اثر ہوا ہو اس کا ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے اور خود یہی امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ اشوک نے کون کون سے ملکوں میں دُعاۃ بھیجے تھے۔ البتہ یہ بات قریب قریب ہر محقّق کو تسلیم ہے کہ بودھ مت کو

[1] رہس ڈیوڈ اس دعوے کی جن دلائل و قرائن سے تردید کرتے ہیں ان کے لیے دیکھو "بدھسٹ انڈیا" صفحہ ۲۹۸۔

محض ایک مقامی فرقے کی بجائے مذاہب عالم کی صفِ اول میں پہنچا دینے والا اشوک ہی ہے۔ اور ہندوستان کے باہر اس مذہب کے جس قدر نام لیوا پائے جاتے ہیں وہ سب مگدھ کے اسی راجہ کے رہینِ منّت ہیں جس نے غیر ملکوں میں تبلیغ و دعوت کی بنا ڈالی تھی اور اپنی زندگی ہی میں اس کام کو ایسے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا تھا کہ بعد میں صدیوں تک اس کا اثر قائم اور وہ کام جاری رہا۔

تیسری فصل اشوک کے ذاتی حالات اور جانشین

"اپنے مذہب اور اخلاقی نظام کی تعلیم کو پھیلانے کی جس شد و مد سے اشوک نے کوشش کی وہی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے مقصد کو سچّا جانتا تھا اور اس لیے اپنی دین داری کا جو اظہار اس نے کتبات میں کیا ہے اُسے جدید اہل تحقیق درست سمجھیں تو بالکل بجا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "لوگوں کی بھلائی کے واسطے کام کرنا میرا فرض ہے" اور بے شبہہ اُس نے یہ فرض ادا کیا۔ اُس کے کاموں کا ثمرہ آج تک اہل دنیا کے سامنے ہے اور اس کے اقوال ہیں، "جو گم ہو گئے تھے اور اب پھر ان میں آواز بھری گئی ہے" صداقت و اخلاق کی گونج ہے۔

"اشوک نہایت مشقّت پسند فرماں روا تھا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ ثانی کی طرح کام کرنے سے کبھی نہ تھکتا اور ہر وقت اور ہر جگہ ملک کے حالات سننے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اور پھر بھی اُسے اپنے کام سے سیری یا تشفی نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ خود شکایت کرتا ہے کہ "مجھے اپنی محنت اور سرعت کار پر کبھی پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا" معلوم ہوتا ہے کہ اشوک ضرورت سے زیادہ محنت کرتا تھا اور عجب نہیں کہ اگر اتنی زیادہ دردسری نہ اٹھاتا تو زیادہ کام کر جاتا۔ مگر اس نے ادائے فرض کا جو تصور اپنے ذہن میں قائم کیا ہے وہ بہت بلند تھا۔ فلسفۂ رواقیہ کے ماننے والوں کی طرح اسے اپنی فطرت کے احکام ماننے لازمی اور بلا لحاظ کامیابی و ناکامی محنت کیے جانا مقدّر تھا۔

باب ۳

"××× کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک راہبانہ پرہیزگاری کو شاہانہ دانائی کے ساتھ آمیز کردینے کا متمنی تھا اور اپنی سمجھ کے مطابق ہندوستان میں حق کی سلطنت قائم کرنی چاہتا تھا۔ مگر یہ حق کی ایسی سلطنت تھی جس میں خُدا کا نام تک نہ تھا اور اس کی بجائے لوگوں کو حق کے راستے پر سلطنت چلاتی تھی ×××"[1]

بیویاں اور اولاد

اشوک کی دو بیویاں اور کئی بچے تھے مگر ان کے متعلق صرف غیر معتبر افسانے باقی رہ گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس اقبال مند راجہ کے بعد اس کے کسی بیٹے کے تخت نشین ہونے کی نوبت نہیں آئی بلکہ اس کے دو پوتے دسرتھ اور سامپتی تخت کے وارث ہوئے اور سلطنت مگدھ اشوک کے مرتے ہی کمزور اور کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اشوک کی وفات کا سال ۲۳۲ء ق م کو قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد موریا خاندان کے اور چھ بادشاہوں کا پتا چلتا ہے جو ۱۸۵ء ق م تک مگدھ پر فرماں روائی کرتے رہے اگرچہ ان کی سلطنت صرف قریب کے علاقوں تک محدود رہ گئی تھی۔

موریا خاندان کا خاتمہ

موریا خاندان کے زوال کے اسباب و واقعات کا مفصل حال معلوم نہیں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں برہمنوں کی عداوت کو بہت کچھ دخل تھا۔ اشوک کے سخت قوانین سے لوگوں میں بددلی پیدا کردینا اور اس بددلی سے فائدہ اٹھانا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ بایں ہمہ سلطنت کو اصلی نقصان بیرونی حریفوں سے پہنچا اور دوسری صدی (ق م) کے اواخر میں کلنگ اور اندھر خاندان کے راجہ مگدھ کی اطاعت سے آزاد ہوگئے۔ موریا خاندان کے آخری فرماں روا کو اس کے سپہ سالار پشی متر نے دغا سے قتل کر ڈالا اور خود بادشاہ بن کر نئے خاندان شاہی کا بانی ہوا۔ (۱۸۵ء ق م) اشوک و چندرگپت کی اولاد میں بعض خاندان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رئیس رہ گئے تھے اور ان کے نام کہیں کہیں ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک کے کتبوں میں موجود ہیں لیکن انھیں کبھی اتنا عروج حاصل نہیں ہوا کہ اپنے نامور خاندان کی عظمت کو دوبارہ تازہ کردیتے۔

[1] منقول از، اسمتھ صفحہ ۱۹۰۔

باب ۹

پہلی فصل سنگ (کانو) اور آندھر خاندان

پشی متر[1] اور اس کی اولاد میں جتنے بادشاہ مگدھ کے حکمراں ہوئے وہ سنگ (سنگا (Sanga) خاندان سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مگر ان سب سے عرصے تک اور کامیابی کے ساتھ پشی متر ہی نے حکومت کی اور معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے سوا تمام شمالی ہند کا علاقہ اس کے زیر نگیں آگیا تھا۔ اس راجہ کے آخری عہد حکومت میں کابل کے یونانی نژاد بادشاہ مناندر نے ہندوستان پر حملہ کیا، اور سندھ و گجرات، پنجاب و راجپوتانہ فتح کر کے جنوبی اودھ تک بڑھ آیا۔ (قیاساً ۱۵۳ سنہ ق م) ان یونانی یا نیم یونانی اور ایرانی بادشاہوں کا حال آگے آئے گا جو دوسری صدی

[1] اس خاندان کے بعض ناموں کا آخری جز "متر" دلالت کرتا ہے کہ غالباً یہ لوگ متر یعنی سورج دیوتا کے پرستار اور ایرانی نسل سے تھے۔ اس بات کی اور شہادتیں بھی موجود ہیں کہ ہندوستان کے قدیم راجہ اہل ایران کے قدردان تھے اور بعض ایرانی یہاں کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ پس کیا عجب ہے کہ سپہ سالار پشی متر یا پشیا متر بھی کوئی ایرانی نژاد سردار ہو۔

باب ۹

قبل مسیح علیہ السلام سے تیسری صدی عیسوی تک ہند کے بعض حصوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس جگہ سلسلۂ بیان درست رکھنے کے لیے اتنا لکھنا کافی ہے کہ پشپی متر نے بہ مشکل منانڈر کا حملہ روکا اور آخر حملہ آور اپنے شمالی مستقر کی جانب ہٹ گیا۔ اس خطرناک دشمن سے نجات حاصل کرنے کے بعد پشپی متر نے اشومدھ کا جشن منانے کی تیاریاں کیں۔ اس کی نسبت خیال جاتا تھا کہ دنیا کا سب سے طاقتور بادشاہ ہی یہ رسم ادا کر سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک عمدہ نسل کے گھوڑے کو سال بھر کے واسطے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور خود راجہ یا اُس کا کوئی نائب فوج لیے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جاتا تھا کہ جس غیر ملک میں وہ جائے وہاں کے حکمرانوں کو زیر کرے۔ اسی طرح سال بھر تک اگر کامیابی ہوئی تو پھر وہ گھوڑا اور مغلوب فرماں روا دھوم دھام کے ساتھ پائے تخت میں لائے جاتے تھے اور وہاں فتحمند راجہ جشنِ عظیم برپا کرتا جس میں اُس گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی۔

پشپی متر نے اس غرض کے لیے جو گھوڑا چھوڑا تھا اس کے ساتھ اپنے پوتے بسومتر کو روانہ کیا تھا اور اسے صرف راجپوتانے کے مشرقی حصوں میں ایک لڑائی غالباً اُن سرداروں سے لڑنی پڑی جو منانڈر کے بعد اس علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔

غرض پشپی متر کی آرزو پوری ہو گئی اور اُس نے دھوم دھام کے ساتھ اشومدھ کی رسم ادا کی۔

برہمنوں کا فروغ

مگر اس واقعے سے پشپی متر کا سب سے طاقتور ہونا ثابت ہو یا نہ ہو ایک بات کا ضرور سراغ لگتا ہے کہ اُس کے عہد میں برہمنوں کو دوبارہ فروغ ہوتا جاتا تھا کیونکہ انھی کے عقیدے میں اس قسم کی قربانیاں اُن دنوں جائز تھیں۔ بعض اور شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پشپی متر نہ صرف قدیم برہمنی مت کا دلدادہ بلکہ بودھ مت کا سخت مخالف تھا اور اس نے ان پر ایسے ایسے ظلم کیے کہ بہت سے بھکشو مگدھ سے بھاگ کر پنجاب میں چلے آئے۔

پشپی متر نے غالباً ۱۴۹ ق م میں وفات پائی اور اس کا بیٹا اگنی متر وارث تخت ہوا۔ مگر اس کے اور اس خاندان کے باقی پانچ راجاؤں کے نام ہی نام

باب ۹

باقی ہیں اور قتل وخون کی بعض سازشوں کے سوا اس عہد کے کسی تاریخی واقعے کا پتا نہیں چلتا۔ اسی قسم کی ایک سازش میں خاندان سنگ کے آخری فرماں روا کی جان گئی اور حکومت اس کے وزیر بسو دیو (Vasu Deva) کے خاندان میں منتقل ہو گئی (۷۲ء ق م) جسے کانو یا کانواین کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

کانو خاندان

مگر یہ خاندان جس کے چار راجہ صرف ۴۵ سال تک حکومت کرتے رہے تاریخ میں کوئی شہرت نہیں رکھتا۔ اس کے آغاز کے متعلق تو اتنا معلوم ہے کہ بسو دیو نے سنگ خاندان کے آخری راجہ کو قتل کر کے بادشاہی پر قبضہ کر لیا اور یا اس کے خاتمے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کے چوتھے راجہ کو دکن کے ایک (آندھری یا سات واہن خاندان کے) فرماں روا نے (شاید ۲۷ء ق م میں) قتل کر دیا۔ درمیانی واقعات کا کچھ پتا نہیں چلتا اور پرانوں کی بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے سے کہیں پہلے مگدھ کے یہ راجہ اپنی خود مختاری کھو کر آندھروں کے باجگزار بن چکے تھے۔

آندھر خاندان کا ابتدائی حال

مذکورۂ بالا روایت کو جدید اہل تحقیق تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ آندھر خاندان کی مدت دراز سے دکن میں حکومت قائم تھی اور مگاس تھینیز یونانی کے زمانے میں یہ ریاست سلطنت مگدھ کے بعد ہند میں سب سے طاقتور مانی جاتی تھی۔ یہ خاندان دراوڑی نسل سے تھا اور اس قدیم زمانے میں گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے درمیان کا وہ ملک (یعنی تلنگانہ) اس کا خاص علاقہ سمجھا جاتا تھا، جہاں اب بھی سب سے زیادہ دراوڑی زبانوں کا رواج ہے[1]۔ اس ریاست کا قدیم پائے تخت "سری کاکولم" نامی شہر کو بتایا گیا ہے جو کرشنا ندی کے کنارے آباد تھا۔

مگاس تھینیز کی تحریریں دیکھ کر اس میں تو شبہہ نہیں رہتا کہ یہ ریاست ان دنوں (یعنی چوتھی صدی ق م تک) خود مختار تھی لیکن اس کے ستر اسّی برس بعد اشوک نے اپنے بعض کتبات میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ گویا وہ سلطنت مگدھ کی باجگزار ہو گئی تھی۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہاں کے راجاؤں کی اندرونی خود مختاری میں

[1] - دی اسمتھ۔ صفحہ ۲۰۶۔ مگر ایک ہندو محقق مسٹر اینگر لکھتے ہیں کہ آندھر خاندان کے راجہ تلنگی زبان نہیں بولتے تھے۔ (رسالۂ انڈین اینٹی کوئری۔ نومبر ۱۹۱۳ء)۔

زیادہ فرق نہیں آیا تاہم وہ چندر گپت یا اس کے بیٹے بندسار کے عہد میں مگدھ کی سیادت تسلیم کرنے لگے تھے اور عہد اشوک تک ان کی یہی حیثیت رہی۔ مگر اس اقبال مند راجہ نے وفات پائی تو جہاں سلطنت کے دور دست صوبے (خاص کر ریاست کلنگ) مگدھ کی اطاعت سے آزاد ہوئے وہاں آندھروں نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، بلکہ عجب نہیں کہ اشوک ہی کے آخری زمانے میں وہ اس کی اطاعت سے آزاد ہو گئے ہوں کیونکہ ان کے راجہ سِموکا کی حکومت کا یہی زمانہ ہے اور وہ غالباً اپنی ریاست کا خود مختار بادشاہ تھا اور اسی کے جانشین راجہ کرشنا (یا کنہا) نے مغربی ساحل سمندر کے قریب تک تمام علاقہ فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا۔

غیر ملکی قبائل سے لڑائیاں

یہ تیسری صدی ق م کے واقعات ہیں اور ان کے بعد تقریباً دو صدی تک آندھروں کے حالات کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ان کے تمام راجاؤں کے نام کی ایک لمبی فہرست ضرور مرتب کر لی گئی ہے لیکن ان میں بھی بہت سے نام مشتبہ اور تاریخی واقعات بالکل مفقود ہیں۔ البتہ دو صدی بعد جب اس خاندان کے کسی راجہ نے مگدھ میں کانو خاندان کا خاتمہ کیا (۲۷ ق م) اور اس کے سو برس بعد ان کی غیر ملکی قبائل سے لڑائیاں شروع ہوئیں تو پھر بعض واقعات تاریخ کی روشنی میں آئے۔

بکٹریا (باختر)، پارتھیہ (دہستان یا خراسان) اور آخر میں سیتھیہ (یا ترکستان) کے بادشاہوں کے ہندوستان پر حملوں اور تسلط کا حال ہم کسی قدر تفصیل سے آئندہ پڑھیں گے۔ مناندر کے وقت میں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے ان غیر ملکی اقوام کی ہند میں آمد شروع ہو گئی تھی اور وہ موجودہ گجرات، مغربی مالوہ اور احاطۂ بمبئی کے بعض حصوں میں آباد ہونے لگے تھے اور پہلی صدی عیسوی میں آندھروں کی انھی کے حکمرانوں سے لڑائیاں ہوئیں۔ یہ حکمراں "ست راپ" کہلاتے تھے (یہ صوبہ دار کے معنی میں قدیم ایرانی اصطلاح ہے) اور غالباً اول اول پارتھیہ پھر سیتھیہ کے اور آخر میں کچھ عرصے تک کشان خاندان کے بادشاہوں سے ان کا محکومانہ تعلق تھا۔ انھی کا (جنوبی ممالک میں) دوسرا ست راپ جس کے حالات ہم تک پہنچے ہیں، نہاپان (یا نہپان) تھا۔ پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں جنوبی راجپوتانے سے ناسک و پونا تک اور شمال مغرب میں گجرات کا علاقہ اسی نہاپان کی قلمرو میں داخل تھا اور آندھر خاندان کے تیئیسویں راجہ

باب ۵

گوتمی پتر بل باے کر (Gautamiputra Vilivayukura) کی قوت آزمائیاں اسی کے ساتھ شروع ہوئیں۔ یہ دکنی راجہ ہندوؤں کا ایک قومی سورما مانا جاتا ہے اور اپنے عہد میں "غیر ملکی مذاہب کی بیخ کنی کر دینے کا مدعی تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے اُسے ہنا پان کی زندگی میں کوئی نمایاں غلبہ حاصل نہ ہو سکا البتہ جب وہ مرگیا تو اس کے جانشین راجہ بل باے کر کے حملوں کی تاب نہ لائے اور یہ جنوبی علاقہ (مہاراشٹر) ست راپوں کے قبضے سے نکل کر آندھروں کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ (۱۲۶ء)

آندھرخاندان کا خاتمہ

دکن کے شمالی ممالک، یعنی مالوے میں ست راپوں کا ایک اور خاندان حکومت کرتا تھا اور جنوبی حریفوں کے مغلوب ہونے کے بعد آندھروں کی اُن سے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ان میں بل باے کر کے جانشین کو ناکامی نصیب ہوئی اور وہ علاقہ جو ہنا پان کے ورثہ سے چھینا تھا، ہاتھ سے نکل گیا۔ شمال کے اس حریف غالب کا نام رُدر دامن (اول) ہے اور وہ ست راپوں کے شمالی خاندان کا تیسرا راجہ یا فرماں روا تھا مغربی ہند کے ان ست راپوں کا پائے تخت اجین میں تھا۔ اس وقت (دوسری صدی عیسوی) وہ شمال مغربی ہند کے سیتھی یا کشان بادشاہوں کے باجگزار تھے۔ ان کا کسی قدر تفصیلی حال ہم اگلی فصل میں پڑھیں گے یہاں صرف آندھر خاندان کے حالات لکھنے مقصود ہیں جن کے ستائیسویں راجہ جگن سری (Yajna Sri) نے مغربی ست راپوں سے دوبارہ جنگ چھیڑی اور غالباً بعض مغربی اضلاع چھین لیے سکوں اور کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک (از ۱۷۳ء تا ۲۰۲ء) حکمراں رہا اور آندھر خاندان کا آخری اقبال مند راجہ ہوا ہے کیونکہ اس کے بعد ان راجاؤں کی حکومت میں زوال آگیا اور ساڑھے چار صدی سے زیادہ عرصہ تک فرماں روائی کرنے کے بعد ان کے خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔ انتزاع حکومت کے اسباب و واقعات بالکل تاریکی میں ہیں قیاساً اندرونی فساد کو ان کے زوال کا سبب مانا جائے یا بیرونی دشمنوں کے حملوں کو، یقینی طور پر جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ۲۲۶ء سے اس خاندان کا نام گم ہے اور ان کے ملک میں آندھروں کے بجائے بیرونی اقوام کے چھوٹے چھوٹے سردار حکومت کرتے نظر آتے ہیں۔

دوسری فصل
ہند باختری پارتھی اور ستھی حکمراں

باختر و پارتھیہ کی خود مختاری

جس زمانے میں اقبال مند اشوک فرصت و اطمینان سے اپنے اخلاقی قوانین کی ترویج میں مصروف تھا، اس کے ہمسائے میں سخت خونریزی اور انقلابات ہو رہے تھے۔ ہماری مراد سلطنت ایران سے ہے جہاں ان دنوں سکندر کے سپہ سالار سلیوکوس کا پوتا وارث تخت ہوا تھا۔ اس بادشاہ (انتیاکوس) میں جو فرط غرور سے اپنے تئیں "خداوند" (تھیوس) کہواتا اور اپنی پرستش کراتا تھا، بادشاہی کی معمولی قابلیت بھی نہ تھی۔ اور اسی کے زمانے میں صوبہ بکٹریا اور پارتھیہ نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ بکٹریا کا ایشیائی اور اصلی نام باختر ہے یہ قدیم ایران کا سب سے زرخیز اور متمدن علاقہ تھا جس میں روایت عام کی بموجب ایک ہزار بستیاں تھیں۔ برخلاف اس کے پارتھیہ وہ صحرائی اور کوہستانی ملک ہے جس میں موجودہ خراسان، سمرقند اور ہرات کے اضلاع داخل تھے، اور آسانی کے لیے ہم اسے "خراسان" کے جدید نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں۔ اسی قوم کی زبان "پارتھوی" بعد میں پہلوی کہلائی خود یہ لوگ فارس میں "پہلوان" کہلاتے تھے مگر فردوسی نے اس لفظ کو بہادر یا جنگجو کے معنی میں اتنا عام کر دیا کہ اب اُس کی اصلیت نگاہ سے مخفی ہو گئی ہے۔ غرض ان مختلف النوع صوبوں میں ایک ہی وقت بغاوت ہوئی (تقریباً سنہ ۲۵۰ ق م) اور دونوں شاہانِ سلیوکوسی کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ مگر اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ باختر میں محض وہاں کا یونانی صوبہ دار موقع پا کر منحرف ہو گیا تھا اور پارتھیہ کے جنگجو شہسواران اشکان کے جھنڈے کے نیچے اس لیے جمع ہوئے تھے کہ غیر ملکی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار کے پھینک دیں۔

باختر کے یونانی بادشاہ

اس طرح ملک باختر میں یونانی نسل کے بادشاہوں کی ایک علٰحدہ سلطنت قائم ہو گئی (سنہ ۲۵۰ ق م) اور کوئی سوا سو برس تک ان کے افراد باختر، کابل اور نیز ہندوستان کے بعض اقطاع پر حکومت کرتے رہے۔ یہی آخری تعلق ہے جس کی وجہ سے ان کے حالات اس کتاب میں ہمیں لکھنے پڑے اگرچہ تاریخی اسناد بہت

نہ آنے کے باعث ان میں سے بعض باتیں قیاسی ہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ ان کے ایام خود مختاری میں ہند پر سب سے پہلے شام کے یونانی بادشاہ انتیاکوس اعظم نے فوج کشی کی تھی مگر غالباً افغانستان سے آگے بڑھنے کی نوبت نہ آئی اور وہ بہت جلد شام کی جانب واپس چلا گیا (۲۰۶ سنہ ق م) واضح رہے کہ انتیاکوس باختر کے یونانی فرماں روا کا حلیف اور رشتہ دار تھا اور شاید اسی کی امداد اور تحریک سے اُس نے یہ جرأت کی ورنہ خود اس کے ملک (شام) سے ہندوستان کو براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا اور ان میں جس قدر بُعد ہے وہ ظاہر ہے۔

شمال مغربی ہند کی فتح

انتیاکوس کے بعد باختر کے چوتھے بادشاہ دمت ریوس نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور غالباً ۱۹۰ سنہ ق م میں کابل کے علاوہ سندھ و پنجاب کے اضلاع فتح کر لیے۔ حملہ آوروں سے ان علاقوں کو بچانے والی کوئی بڑی قوت موجود نہ تھی کیونکہ موریا خاندان کے راجہ زوال کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے اور عجب نہیں کہ ان بعید صوبوں سے ان کا تسلط اُٹھ چکا ہو۔ گر دمت ریوس کے اتنی دور تک بڑھ آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اس کے گھر یعنی باختر میں بعض سرداروں نے بغاوت کی اور خود مختار بن بیٹھے۔ دمت ریوس کے پاس فقط ہند کے مفتوحہ صوبے رہ گئے اور اسی لیے وہ یونانی تاریخوں میں "شاہِ ہندیاں" کے نام سے مشہور ہے۔

اُس یونانی سردار کا نام یوک راتی دیس تھا جس نے دمت ریوس کو باختر سے بے دخل کیا اور اس کی شجاعت و جنگجوئی کی بڑی شہرت تھی۔ باختر پر قابض ہونے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ یوک راتی دیس اپنے پہلے آقا (دمت ریوس) کو ہندوستان میں چین سے بیٹھنے دے۔ اس نے یہاں کے مقبوضات کا دعویٰ کیا اور عرصے تک جد و جہد کرنے کے بعد آخر کار ان علاقوں کو بھی چھین لیا۔ یہ شاید ۱۵۶ سنہ ق م کا واقعہ ہے۔

یوک راتی دیس کو خود اس کے بے رحم بیٹے نے قتل کرا دیا اور پھر اپنے بھائیوں سے خانہ جنگی میں مصروف ہو گیا۔ اس واقعے نے باختر کی نئی سلطنت میں سخت انتشار و فساد برپا کر دیے۔ چنانچہ ہندوستان کے شمال مغربی صوبے سے اُس زمانے کے بہت سے سکے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بد عملی میں بیسیوں یونانی سردار

بادشاہی کے دعویدار تھے اور جس کا جہاں زور چلتا تھا وہاں خود مختار حاکم بن بیٹھتا تھا۔

مناندر

مدعیان حکومت کے اس انبوہ میں ناموری کا مستحق اگر کوئی ہے تو وہ مناندر ہے جو غالباً یوک راتی دیس کا رشتہ دار اور کابل کا بادشاہ تھا۔ ٹھیک ٹھیک سنین کا تو پتا نہیں چلتا مگر اتنا ثابت ہے کہ وہ دوسری صدی ق م کے آخر اور پہلی صدی کے آغاز میں فرماں روائی کرتا تھا۔ ونسنٹ اسمتھ کے قول کے بہ موجب ۱۵۵ ؁ ق م میں اس نے ہندوستان پر وہ حملہ کیا جس کا مجمل ذکر ہم پہلے پڑھ آئے ہیں مگر محققین کا ایک اور گروہ اس حملے کو پندرہ بیس برس بعد کا واقعہ سمجھتا ہے[1]۔ بہر حال اس میں شبہہ نہیں کہ یہ حملہ نہایت کامیاب ہوا اور سندھ و گجرات کو فتح کر کے مناندر نے قلعہ مدھمیکا اور رسا کے تھم کا محاصرہ کر لیا (پہلا قلعہ آج کل ناگری کے نام سے چتوڑ کے قریب موجود ہے اور دوسرا جنوبی اودھ میں واقع تھا) پھر مناندر "ایساموس" ندی تک بڑھا یعنی شاید خاص پائے تخت پاٹلی پترا تک پہنچ گیا تھا کیونکہ "ایساموس" سے غالباً دریائے سون مراد ہے جسے یونانیوں نے اس طرح بگاڑا ہے کہ اب اس کے اصلی نام کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن ایسے شخص کا جس کے گھر میں بیسیوں رقیب و مفسد موجود ہوں زیادہ عرصے تک وطن سے باہر رہنا مخدوش تھا۔ مناندر کو بھی خانگی تنازعات کی وجہ سے واپس ہٹنا پڑا اور اس کی پسپائی میں ممکن ہے کہ پشپی متر کی جنگی کوششوں کو بھی کچھ دخل ہو۔

مگر مناندر کی شہرت کا ایک اور قوی سبب پالی زبان کی مشہور کتاب "ملند اپان ہو" ہوئی جس کا حال میں انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس میں مناندر کو "ملندا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اس کی زبان سے بودھ مت کے متعلق بہت سے سوالات کرائے ہیں۔ اس کا مخاطب بودھ مت کا "بھکشو ناگ سین" ہے اور بودھوں کا قول ہے کہ اس بھکشو نے آخر کار مناندر کو قائل کر دیا اور وہ اسی مذہب کا پیرو بن گیا تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط اس میں شک نہیں کہ مناندر منصف مزاج اور اپنی رعایا میں بہت ہر دل عزیز بادشاہ تھا اور اس کے بعد گو یونانی نسل و نام کے سردار

---

[1] انسائکلوپیڈیا جلد ۱۸ صفحہ ۱۱۰۔

شمال مغربی ہند کے علاقے میں کہیں کہیں فرماں روائی کرتے رہے لیکن انھیں کوئی خاص قوت حاصل نہ ہوئی اور ان میں سے اکثر شاہانِ پارتھیہ یا سیتھی اقوام کے باجگزار بن گئے۔ کیونکہ پہلی صدی ق م کے شروع ہونے سے پہلے (۱۲۳ سنہ ق م کے قریب) باختر کی یونانی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا تھا اور اب وہاں سیتھی حملہ آور قابض تھے۔

شاہانِ پارتھیہ

یونانی نسل کے باختری بادشاہوں کی خانہ جنگی اور زوال کا زمانہ پارتھیہ کی نئی حکومت کے فروغ و ترقی کا زمانہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہماری عربی، فارسی تاریخوں میں ان پارتھی بادشاہوں کا بہت کم ذکر ہے اور سکندر اعظم کے بعد ساسانیوں تک کے تمام زمانے کو "عہد ملوکِ طوائف" کہہ کے ٹال دیا ہے جن میں "اشکانیوں" کو کسی قدر امتیاز حاصل ہوا۔ اصل یہ ہے کہ اشکانی بادشاہوں نے اپنے صوبہ داروں کو بہت کچھ آزادی دے رکھی تھی اور وہ اپنے اپنے مقام کے خود مختار فرماں روا معلوم ہوتے تھے ورنہ ساڑھے چار صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک ایران کی اصلی شاہنشاہی اسی خاندان میں رہی اور بعض بڑے نامور فرماں روا گزرے جنھوں نے عراق عرب تک تمام علاقہ یونانی تسلط سے آزاد کیا اور ہندوستان کے بعض حصے فتح کیے۔ ہندوستان کے ان صوبوں پر پارتھی صوبہ دار (یا ست راپ) مقرر اور ایک حد تک خود مختار تھے۔ اور ہماری تاریخ کا انھی نیم خود مختار صوبہ داروں سے تعلق ہے۔ مگر ان کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت یہ ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا اس کے ماخذ ناقص ہیں۔ شاہان پارتھیہ ہی کی کوئی مسلسل اور معتبر تاریخ موجود نہیں تو ان کے ہندوستانی ست راپوں کی کون لکھتا۔ پس بہت سی باتیں قیاسی اور مختلف فیہ ہیں۔

ہند کے پارتھی حکمران

معلوم ہوتا ہے شاہانِ پارتھیہ نے شمال ہند میں دو صوبے بنائے تھے:۔ ایک میں ہرات وسیستان اور شاید بلوچستان کا ملک شامل تھا اور دوسرے میں شمال مغربی پنجاب یا قدیم ٹکسیلا کا علاقہ۔ ہمیں زیادہ تر اس دوسرے صوبے سے بحث کرنی چاہیے اور سلسلۂ بیان کو ازلیس کے زمانے سے شروع کرنا چاہیے جسے شاہ متھرا دتیس (ثانی) نے سیستان سے بدل کر ٹکسیلا بھیج دیا تھا (۹۰ سنہ ق م)۔ ۲
ازلیس نے پارتھیہ کے باجگزار بادشاہ کی حیثیت سے مغربی پنجاب میں بہت دن تک

فرماں روائی کی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں وہ خود مختار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی سو برس تک اس کا بیٹا اور پوتا حکومت کرتے رہے اور غالباً ۲۰ ئہ میں ان سے گندوفاریس یا ہندوفاریس نے حکومت لے لی۔ اس شخص کے خاندان اور سلطنت پارتھیہ سے تعلقات کا صحیح علم نہیں مگر اس قدر معلوم ہے کہ مغربی پنجاب کے علاوہ سندھ وہرات پر بھی اس کا قبضہ تھا اور وہ تقریباً چالیس سال تک فرماں روا رہا۔ اس کے متعلق قدیم عیسائیوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ جب مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے دین مسیح کی تبلیغ کا ارادہ کیا تو سلطنت پارتھیہ طامس ولی کے حصے میں آئی چنانچہ وہ گندوفاریس کے دربار میں بھی پہنچے اور وہیں کہیں کابل کے علاقے میں شہید ہوئے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ جنوبی ہند میں آکے شہید ہوئے اور مدراس کے قریب میلاپور میں ان کے نام کی ایک درگاہ بھی بنی ہوئی ہے۔

گندوفاریس کے بعد اس کا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ان میں سے صرف پنجاب کا حال معلوم ہے کہ اسے پہلی صدی کے وسط میں کشان خاندان کے بادشاہوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا، اور غالباً سندھ وہرات پر بھی یہی گزری۔ اس میں شک نہیں کہ جنوبی سندھ میں بہت بعد تک پارتھی رئیسوں کا فرماں روا ہونا ثابت ہے مگر یہ بہت محدود ریاستوں کے حاکم تھے اور انھی کی طرح شمالی علاقوں میں یونانی بھی پہلی صدی عیسوی کے شروع تک کہیں کہیں حکومت کرتے نظر آتے ہیں۔

سیتھی اقوام کی آمد

جیسا کہ ہم اشارہ کر آئے ہیں پہلی صدی عیسوی سے شمال مغربی ہند پر قبضہ سیتھی یا ترکمانی اقوام کے حملہ آوروں کو حاصل ہو گیا تھا اور ان میں سک یا سکا (Saka) پہلی قوم ہے جو سیستان و سندھ سے گزر کر غالباً گجرات کے علاقے میں پھیل گئی تھی (دوسری صدی ق م) ان کو اپنے وطن یعنی وادیِ جیحوں سے خانہ بدوش ترکمانوں کے ایک اور بڑے گروہ نے بے دخل کر دیا تھا جو یوچی (yuehchi) کے چینی نام سے مشہور ہے۔ یہ قوم اتنی بڑی تعداد میں شمال مشرق سے آئی تھی کہ نہ انھیں جیحوں کے قبائل روک سکے نہ باختر و پارتھیہ کے وہ بادشاہ جن کی نئی سلطنتوں کے حالات ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اور گو پارتھیہ میں نو وارد یوچیوں کے قدم جمنے کی نوبت نہیں آئی لیکن سغد و باختر سے یونانی حکومت کا نام و نشان مٹ گیا اور یہ

باب ۹

خانہ بدوش وادیٔ سیحوں کی زرخیز سرزمین کے مالک بن گئے۔ یہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی اور اُن کے بڑے بڑے گروہ پانچ ریاستوں میں منقسم ہوئے جو پہلی صدی عیسوی کے آغاز تک موجود تھیں۔

شاید سنہ ۴۵ء میں انھی گروہوں میں سے ایک گروہ کُشان یا کسن (kushan) کے سردار نے پانچوں ریاستوں پر قبضہ کرکے دوبارہ قوم یوچی کو ایک متحد سلطنت میں شیرازہ بند کرلیا اور کوہستان ہندوکش کو اتر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا کتبوں میں اس بادشاہ کا نام "کجلاکر کادفسیس" کندہ ہے مگر آسانی کی غرض سے اہل یورپ کدفسیس کہنے لگے ہیں۔ ملک افغانستان کی فتح اسی سے منسوب کی جاتی ہے اور دریائے سندھ کے مغرب میں یونانی یا پارتھی نسل کے رئیسوں کی جو ریاستیں باقی تھیں ان کا خاتمہ بھی اسی بادشاہ نے کیا، گو پنجاب اور ملک سندھ میں غالباً وہ کچھ اور مدت تک قائم رہیں۔

کدفسیس دوم

یوچی قوم کے اس نامور بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا کدفسیس دوم فرماں روا ہوا (سنہ ۷۷ء یا سنہ ۷۸ء) اور وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ بلند حوصلہ اور اقبال مند بادشاہ گزرا ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے تاریخی واقعات پر تاریکی چھائی ہوئی ہے اور قیاس آرائی کے لیے صرف پرانے سکّے ملتے ہیں جن کی بنا پر بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ کدفسیس دوم نے نہ صرف پنجاب بلکہ وادیٔ گنگا میں بنارس تک اور جنوب میں نربدا تک تمام شمالی ہند کو فتح کرلیا تھا۔ اس خیال کو تقویت اس وجہ سے پہنچتی ہے کہ اُن دنوں شمالی ہندوستان میں کسی ایسی قوی ریاست کا پتا نہیں چلتا جو بیرونی دشمنوں کو روک لیتی۔ لہٰذا کدفسیس کو اگر دوسری طرف سے اطمینان تھا اور اس کا باپ اندرونی طور پر سلطنت کو مستحکم اور کشان خاندان کے ماتحت قوم یوچی کو متحد کرگیا تھا، تو یہ بات خلاف عقل نہیں کہ اس کے جنگجو وارث کو اپنے کمزور ہمسایوں کے زرخیز علاقے لینے کا لالچ پیدا ہوا ہو اور جہاں تک آگے بڑھ سکتا تھا وہاں تک اس بے نظیر زمین پر قابض ہوگیا ہو۔ کیونکہ اس میں تو کچھ شک نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کدفسیس دوم کو ایسی فتوحات کی بہت فرصت حاصل تھی اور وہ تیس پینتیس برس تک حکمراں رہا۔

مغربی ستراپ

کدفسیس دوم کی یورش کے وقت شمالی ہندوستان میں کئی جگہ غیر ملکی

ست راپوں کی حکومت تھی۔ ان میں سے بعض کے نام پارتھی ہیں لیکن وہ بالعموم سک یا سکا قوم کے لوگ تھے اور اس قوم کی نسبت ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یوچیوں نے اسے وادیِ سیحوں سے نکال دیا تھا اور اس کے بعض گروہ سندھ کے راستے گجرات اور مالوے میں داخل ہو گئے تھے۔ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ انھی کی مغربی ہند میں وہ حکومتیں قائم ہوئیں جن کی آندھر خاندان کے راجاؤں سے جنگ وجدال کا حال ہم پچھلی فصل میں پڑھ آئے ہیں۔ لیکن اس قوم کا اصلی مستقر ہند کے باہر ملک سیستان ہی میں رہا بلکہ خود یہ نام (''سکستانی'' پھر ''سکستان'' سے سیستان) انھیں کی یادگار ہے۔ ہندوستان میں اُن کی رسائی دوسری صدی ق م کے آخری سنین میں ہوئی تھی گمران کے مغربی صوبہ داروں کا ذکر دو صدی بعد سے شروع ہوتا ہے جب کہ پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں اجین کا فرماں روا چشتن (Chashtana) اور مہاراشٹر یا جنوبی صوبے کا پہلا حاکم بھومکا تھا۔ ان کا پتا صرف ان کے سکوں سے چلتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ شاید اس وقت تک یہ ست راپ حکومت سیستان کے محض ماتحت صوبہ دار تھے اور کدفسیس دوم کے زمانے میں سلطنت کشان کے باجگزار بن کر اپنے نام کا سکہ ضرب کرانے لگے ان میں سے بعض کے نام پارتھی ہیں اور اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ سیستان اور قوم سکا کے دیگر مقبوضات شاہانِ پارتھیہ کے زیر اثر آ گئے ہوں گے اور یا ان کی ہندی نو آبادیوں میں پارتھی عنصر داخل ہو گیا ہو گا؟

بہر حال، شاہانِ کشان کے باجگزار ہونے کے باوجود مالوے کے ست راپوں نے بڑا عروج پایا اور جنوبی ست راپوں کا علاقہ بھی آندھروں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا (دیکھو صفحہ ۱۱۶) یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور اس وقت تیسرا ست راپ یعنی (بانیٔ خاندان چشتن کا پوتا) رُدر دامن (اول)، مالوے کا فرماں روا تھا۔ اس فتح نے اسے سندھ سے کوکن تک تمام مغربی ہند کا مالک بنا دیا اور اسی بنا پر اجین کے یہ حاکم ''مغربی ست راپوں'' کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔

ان کا خاتمہ

ان غیر ملکی بادشاہوں نے تین صدی تک بادشاہی کی اور سلطنت کشان میں

لہ۔ اوکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۱۵۲۔

زوال آنے کے بعد وہ بالکل خود مختار ہو گئے تھے۔ ان کا پائے تخت اجین علم وفن اور صنعت و تجارت کا پہلے سے مرکز تھا غالباً ان ست راپوں کے عہد میں اسے اور بھی فروغ حاصل ہوا اور قرائن کہتے ہیں کہ بودھ مت کے خلاف انھوں نے برہمنوں کی حمایت اور سنسکرت علم ادب کی بھی سرپرستی کی۔ مگر یہ سب قیاسات ہیں اور ان کے ناموں کے سوا اور حالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت کا خاتمہ کس طرح ہوا کتاب "ہرش چرت" میں ایک عجیب روایت تحریر ہے کہ آخری ست راپ (جس کا نام رودرسنگھ (Rudrasinha) تھا کسی اور شخص کی بیوی پر فریفتہ ہوا اور بھیس بدل کر پاٹلی پتر ا پہنچا۔ مگدھ کے راجہ سمدر گپت کو جس کی ان ست راپوں سے جنگ ٹھنی ہوئی تھی، یہ حال کھل گیا اور اس نے وہیں دھوکے سے اپنے دشمن کا کام تمام کر دیا۔ اور گو افسانہ نگار کی یہ روایت قابل یقین نہیں لیکن یہ واقعہ صحیح ہے کہ مغربی ست راپوں کی حکومت کا راجہ سمدر گپت نے خاتمہ کیا اور ان کا تمام علاقہ چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سمدر گپت کا تفصیلی حال اگلے باب میں ہماری نظر سے گزرے گا مگر یہ فتوحات اسے چوتھی صدی کے اواخر میں حاصل ہوئی تھیں اور سکوں سے بھی ۳۸۸ئہ کے بعد مغربی ست راپوں کا نام و نشان غائب ہے۔

تیسری فصل :- راجہ کنشک

چشٹن کی مالوے میں حکومت کا زمانہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب کہ کدفسیس دوم شمالی ہند پر فاتحانہ حملے کر رہا تھا۔ ان علاقوں میں سکا قوم کے بعض چھوٹے چھوٹے صوبہ داروں کا اس کے ہاتھوں مغلوب ہونا ثابت ہے اور یہ صوبہ دار یا تو اس کے باجگزار ہو گئے اور یا انھیں شاہانِ یوچی (یا کشان) کے مقرر کردہ صوبہ داروں کے واسطے جگہ خالی کرنی پڑی۔ چنانچہ کشمیر، وسط پنجاب اور متھرا میں یہی ہوا کہ پہلی صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں سکا حکمرانوں کی جگہ یوچی سردار

باب ۹

حکومت کرنے لگے جنھیں کدفسیس دوم نے مقرر کیا تھا۔ شاید انھیں سرداروں میں کنشک (Kanishka) بھی تھا جو یوچیوں کے ایک دوسرے گروہ میں شامل ہے اور کدفسیس یا اس کے گروہ کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا[۱]۔

وسعت سلطنت

اس کے سکّے جو کابل سے غازی پور تک مختلف مقامات میں ملے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ غالباً وہ کدفسیس دوم ہی کے زمانے سے اپنے نام کا سکّہ ضرب کرانے کا اختیار رکھتا تھا اور ان دونوں کے ایک ہی وقت کے سکّوں سے اہل تحقیق میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ آیا کنشک پہلے گزرا ہے یا کدفسیس۔ مگر محققین کا اب اس بات پر اجماع ہوتا جاتا ہے کہ کنشک کدفسیس دوم کا جانشین ہے اور ۱۲۰ء کے قریب تمام سلطنت کشان کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس کی تخت نشینی اور سنین کے متعلق اس قدر اختلافات ہیں تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دیگر واقعات کی صحت کا کیا حال ہوگا؟ چنانچہ اب تک ٹھیک پتا نہیں چل سکا کہ اس کی حدود سلطنت کیا تھیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ شمالی سندھ و کشمیر کو اس نے فتح کیا اور مشرق میں پاٹلی پترا تک بڑھا۔ مغربی ست راپ بھی اس کے مطیع ہو گئے تھے اور اس اعتبار سے وہ قریب قریب نصف ہندوستان کا فرماں روا تھا جس میں اس برّاعظم کے بہترین ممالک شامل تھے۔ شمال میں موجودہ دولت افغانستان کا تمام علاقہ یوچیوں کے قبضے میں تھا اور کاشغر، ختن اور یارقند کو کنشک نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ یہ علاقے چین کے باجگزار تھے اور ان کی فتح میں اس قدیم سلطنت سے بھی لڑائیاں پیش آئیں۔ کدفسیس دوم چینیوں کے ہاتھ سے سخت شکست کھا چکا تھا مگر کنشک ان کے مقابلے میں کامیاب ہوا

۱۔ ان تمام واقعات کی صحت میں بہت سے شکوک اور اختلافات ہیں مگر ہم نے ونسنٹ اسمتھ کی تازہ ترین کتاب کی پیروی کی ہے۔

۲۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۲۷۔ لیکن اُس کی تخت نشینی کدفسیس دوم کی وفات کے کوئی دس برس بعد ہوئی۔ اور جس طرح اس انتقال حکومت کے اسباب معلوم نہیں اُسی طرح اس بیچ کے زمانے کا بھی ہمیں کچھ علم نہیں کہ اس میں حکومت کس کے پاس رہی۔

باب ۹

اور چند چینی سردار یرغمال میں لے کر آیا (۱۵۲ء[۱]) یہ سردار گرمیوں میں بودھ مت کی ایک خانقاہ واقع کافرستان میں رکھے جاتے تھے اور وہاں کے بھکشوؤں نے خانقاہ کی دیواروں پر ان کی تصویریں بنائی تھیں، بلکہ ساتویں صدی میں ہوئین چونگ یا ہیون تسانگ سیاح یہاں پہنچا تو اس وقت بھی ان چینی نظربندوں کی یادگاریں موجود تھیں اور اہل خانقاہ ان کے حالات سناتے تھے۔

بودھ مت

علاقۂ گندھار میں پرش پور یعنی موجودہ پشاور کنشک کا پایۂ تخت تھا۔ وہاں اس نے بودھ مت والوں کے واسطے عالی شان مذہبی عمارات بنائی تھیں جن کے کھنڈروں سے حال میں بعض کارآمد اشیا دستیاب ہوئی ہیں۔ اس کے بودھ مت اختیار کرنے کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں اور گو ان میں واقعات کو نہایت مبالغہ آمیز طریق پر بیان کیا گیا ہے لیکن اتنا مسلم ہے کہ مہاراجہ اشوک کے بعد ہندوستان میں اس مذہب کا سب سے بڑا حامی اور سرپرست کشان خاندان کا یہی راجہ کنشک گزرا ہے[۲] اور اسی نے بودھ مت کے بڑے بڑے علما کی ایک مجلس عظیم کشمیر میں منعقد کی تھی۔ مشہور ہے کہ اس قسم کی پہلی مجلس اشوک کے ایما سے پاٹلی پتر میں ہوئی اور شاید اسی کی تقلید میں کنشک کو یہ خیال آیا تھا۔ اس مجلس کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس کے مذہبی مباحث کا مجموعہ (مہاوِبھاشا[۳]) علمائے تاریخ کے لیے بہت کام کی چیز ہے اگرچہ اس سے ابھی تک خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ علمائے بودھ کے

---

[۱] - یہ سن قیاسی ہے اور اس کی صحت کے متعلق ملاحظہ ہو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۳۱۔

[۲] - "معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ کنشک بودھ مت کی اتنی حمایت کرتا تھا۔ اس مذہب کی کتابوں میں جو وجوہ بیان کی گئی ہیں وہ کچھ دل کو نہیں لگتیں بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ مہاراجہ اشوک کے بودھ مت قبول کرنے کے متعلق جو کہانیاں مشہور تھیں گویا ان کو ذرا بدل کر کنشک سے منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ سکّوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ قدیم ایرانی، یونانی اور زرتشتی دیوتاؤں کے ایک عجیب مجموعے کا پرستار تھا اور معبودوں کے اسی گروہ میں اس نے بعض ہندی دیوی دیوتا بھی شامل کر لیے تھے ۔۔۔۔۔" (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۳۱)۔

[۳] - یہ چینی زبان میں محفوظ ہے۔ ۱۲ منہ

ان مناظروں سے اُس تعجب انگیز انقلاب کا پتا چلتا ہے جو بودھ مت میں پانچ صدی کے اندر پیدا ہو گیا تھا ضمناً لوگوں کے دماغی اور اخلاقی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بُت پرستی اور اندرونی اختلافات

پہلا اور بہت بڑا فرق تو یہ ہے کہ بودھ مت میں اب بُت پرستی کا رواج ہو گیا تھا اور بہت سے بتوں کے ساتھ خود بانیٔ مذہب کی مورت پُجنے لگی تھی۔ تین صدی پہلے کسی بودھ عالم کو یہ خیال بھی نہ آتا ہو گا کہ اپنے رہنما گوتم کی پرستش کرے لیکن اسی تھوڑے سے زمانے میں ہندوستان پر بیرونی حملوں نے یہ اثر ڈالا کہ بودھ مت کے پیرو گوتم منی کو خدائی صفات سے موصوف جاننے لگے۔ وہ نہ صرف اس سے اپنی مرادیں مانگتے بلکہ اس کی درگاہ تک دعا کی رسائی کے واسطے بھی اور اوتاروں (یا "بدھ ستّوؤں") کی شفاعت چاہتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ اس انقلاب کا بڑا سبب یہ تھا کہ وحشی یا نیم وحشی حملہ آوروں نے شمال مغربی ہندوستان کو فتح کیا اور یہاں بس گئے تو گو انھوں نے بودھ مت کو اختیار کر لیا لیکن ساتھ ہی ان کے قومی عقائد و اوہام کی بھی اس مذہب میں آمیزش ہو گئی اور چونکہ وہ صاحب حکومت و قوت تھے لہٰذا قرینہ کہتا ہے کہ علمائے بودھ اس خرابی کو نہ روک سکے۔ دوسرے خود ان میں بہت سے اندرونی اختلافات اور ملحدانہ خیالات پیدا ہو گئے تھے، اور کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ گوتم بدھ کی اصلی تعلیم کیا ہے؟ بلکہ انھی اختلافات اور متضاد خیالات سے گھبرا کر کنشک نے اپنے دینی معلّم پارسو (Parsva) سے تحریک کی تھی کہ بودھ مت کے تمام علما کو جمع کیا جائے تاکہ بحث و مشورہ کے بعد مذہب کے وہ اصول قرار دیے جا سکیں جو مسلّم و متفق علیہ ہوں۔ ان "پانچ سو منتخب علما" کی محنت و عرق ریزی کا نتیجہ وہ بسیط شرح ہے جسے "مہا وِبھاشا" کہتے ہیں اور جس میں تمام اختلافات کا مفصل بیان قلم بند کیا ہے اور اٹھارہ بڑے بڑے فرقوں کے اختلافات رفع کیے ہیں۔ بایں ہمہ بعض اصولی فرق باقی رہ گئے اور اس مذہب کے دو بڑے گروہ اب تک موجود ہیں جن میں ایک "ہینا یانی" (یعنی دَورِ صغریٰ) یا قدیم تر عقائد کا پیرو کہلاتا ہے اور دوسرے کو "مہا یانی" (یعنی دَورِ کبریٰ والے) کہتے ہیں۔

کنشک کی وفات اور جانشین

کنشک نے غالباً ۴۰ برس حکومت کی اور ۱۶۲ئہ میں فوت ہوا۔ اس کی موت کے متعلق ایک عجیب قصہ مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید رعایا نے

اس کی ہوس ملک گیری سے تنگ آکر اسے مار ڈالا تھا۔ واقعات تاریخی کے نہ ملنے کی وجہ سے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بادشاہ کا جانشین کون تھا لیکن قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد اسی کا بیٹا ہوشک (Huvishka) بادشاہ ہوا جس کے بہت سے سکے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے بست سالہ عہد حکومت میں سلطنت کشان اپنے عروج پر تھی لیکن زوال کا وقت بھی قریب آگیا تھا اور اگلے بادشاہ کے طولانی زمانۂ حکومت میں اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ یہ بادشاہ جس کا نام (باس دیو (Vasudeva)) ثابت کرتا ہے کہ اب یہ نووارد یوچی خالص ہندوستانی ہو گئے تھے، شاید ۱۸۲ء سے ۲۲۰ء تک فرماں روا رہا اور اس کے بعد سلطنت مختلف ریاستوں میں منقسم ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب و کابل میں کشان (یا "شاہی") خاندان کے بادشاہ چوتھی صدی کے اخیر تک حکومت کرتے رہے اور ان کا خاتمہ گورے ہونوں (White Huns) کے سیلاب نے کیا لیکن باس دیو کے بعد ان کی قوت میں ضعف آگیا تھا اور گمان غالب یہ ہے کہ وہ تھوڑے ہی عرصے بعد ایران کے ساسانی بادشاہوں کے خراج گزار ہو گئے تھے۔ ایران میں یہ (ساسانی) خاندان پارتھیوں کا جانشین ہوا تھا اور اس کے اولوالعزم بادشاہوں نے "عہد کیانی" کی یاد تازہ کر دی تھی۔ تیسری صدی میں ان کے بادشاہ بہرام کے ہند پر حملوں کا پتا چلتا ہے مگر تفصیلی حالات موجود نہیں اور بعد میں صرف دو واقعے مذکورۂ بالا قیاس کی تائید کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ ہرمزد ثانی کو شاہ کابل نے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی اور دوسرے یہ کہ جب شاپور ثانی نے ۳۶۰ء میں قلعۂ دیار بکر پر رومیوں کو شکست دی تو ہندوستان کے ہاتھی اور کشان خاندان کا راجہ اس کے ساتھ تھے۔

مگر جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے (چوتھی صدی کے آغاز تک اس ملک کی تاریخ بالکل معدوم ہے۔ کوئی کتبہ کوئی سکہ ایسا نہیں ملتا جو اس زمانے کا سراغ دے۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت یہاں کوئی بڑی سلطنت نہ تھی اور ایشیائی دستور کے مطابق بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی ہوں گی۔ ورنہ مغربی ست راپوں کے سوا اس تمام مدت میں شمالی ہند اور دکن کے کسی فرماں روا کا پتا نہیں چلتا۔

ضمیمہ باب ۹

غیر اقوام کا اثر ہندستان میں

ونسنٹ اسمتھ نے منو کے دھرم شاستر کی تدوین اسی (دوسری صدی ق م تا دوسری صدی عیسوی کے) زمانے سے منسوب کی ہے[1] لیکن سنسکرت علم ادب کے بعض ماہرین کے نزدیک وہ تین سو برس بعد کی کتاب ہے (انسائی کلوپیڈیا ج ۴ ص ۱۷۵) البتہ یہ قریب قریب مسلّم ہے کہ بودھ مت کے تین مشہور مصنف (ناگارجون، اسوگوش اور بسومترا) راجہ کنشک کے عہد میں ہوئے ہیں اور چرک (Charaka) نامی طبیب بھی اس کی سرکار کا ملازم تھا جو قدیم ہندی طب کا سب سے مشہور مصنف مانا جاتا ہے۔ بعض اہل تحقیق کا گمان ہے کہ عجب نہیں اس نے حکیم بقراط یونانی کی طبی تصانیف سے استفادہ کیا ہو کیونکہ اُن دنوں شمال مغربی ہندوستان کی بعض ریاستوں میں جہاں یونانی نسل کے افراد حکمراں تھے، یونانی زبان کے جاننے والے ضرور موجود ہوں گے لیکن یہ سب قیاسات ہیں اور ان کا کوئی قابل لحاظ تحریری ثبوت نہیں ملتا۔[2]

[1] ۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۴۳۔

[2] ۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۴۳۔

البتہ اس زمانے کے جو بُت ٹکسیلا یا پشاور کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے وہ زبانِ حال سے گواہی دیتے ہیں کہ اس فن پر یونانیوں کا بڑا اثر پڑا تھا چنانچہ گوتم بودھ کے بعض مجسّمے یونانیوں کے اپالو دیوتا سے مشابہ ہیں اور بعض کی وضع زئیس دیوتا سے ملتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے اخیر میں جب شام اور ایشیائے کوچک پر رومیوں کا مستقل قبضہ ہوگیا اور یونانی ملوک طوائف کی خانہ جنگیوں سے نجات ملی تو وہاں یونانی علم وفن اور صنعت وحرفت کو بڑی ترقی ہوئی اسی آخری دور کے سنگ تراش تھے جن کی صناعی کے نمونے ایران وخراسان ہوکر ہند میں پہنچے۔ خاص کر کنشک اور اس کے بیٹے ہوشک کے عہدِ حکومت میں ان بیرونی کاریگروں کا اثر بہت نمایاں ہے اور ہندی سکّوں پر بھی یونانی دیوتاؤں کی تصویریں ملتی ہیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ گو ان کشان بادشاہوں کی زبان ایران کی قدیم بولی سے قریبی تعلق رکھتی تھی تاہم سکّوں پر اپنے نام یا اپنی زبان کے الفاظ وہ یونانی حروف ہی میں کندہ کراتے تھے۔ اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک کتبے سے ثابت ہوا ہے کہ راجہ کنشک نے رومۃ الکبریٰ کے بادشاہوں کا لقب (''قیصر'') اختیار کرلیا تھا۔[1]

ایشیا کے ان مغربی ملکوں کا ہند پر جو کچھ اثر پڑا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ شاہانِ کشان اور نیز یہاں کے یونانی نژاد رئیسوں کا ترکستان وخراسان سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ مگر دوسرا قوی سبب بیرونی تجارت کو سمجھنا چاہیے جو اُن دنوں فروغ پر تھی۔ صحرائے شام کا قدیم شہر پامیرا ہندوستان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں سے کئی راستے (ایران ہوکر) شمال مغربی ہند کو آتے تھے، بلکہ ملک چین کا تجارتی مال بھی انھی ہندوستانی راستوں سے ایشیائے کوچک پہنچتا تھا۔

ان برّی راستوں کے علاوہ سمندر سے بھی تجارت کا مال آتا جاتا تھا۔ بحرِ عرب سے مغربی باد برشگال یا ''مونسون'' کے ساتھ ساتھ عرب تاجروں کی

[1] اوکسفورڈ ہسٹری۔ ص ۱۳۴۔ اگرچہ اس بارے میں ابھی تک کسی قدر اختلاف ہے۔

بادبانی کشتیاں ساحل ملیبار پر آپہنچتی تھیں اور دسمبر یا جنوری میں یہاں کے گرم مسالے جواہرات اور موتی لے کر یہ بحری تاجر واپس چلے جاتے تھے۔ سواحل عرب سے یہ مال اونٹوں پر لد کر مصر و شام کی منڈیوں میں پہنچ جاتا تھا۔ ساحل ملیبار پر کرنگ پور (یا "مزیریس") اور بکارے نامی بندرگاہیں اس بحری تجارت کا بڑا مرکز تھیں چنانچہ رومی قیصروں کی بہت سی پرانی اشرفیاں یہاں سے دستیاب ہوئی ہیں۔ کورومنڈل کی جانب کورکی اور پوہار دو قدیم بندرگاہوں کا ذکر آتا ہے جہاں سے ہندوستان کا مال مصر و اطالیہ کے شہروں تک پہنچتا تھا، چونکہ ادھر سمندر اپنی جگہ سے کسی قدر ہٹ گیا اس لیے وہ قدیم بندرگاہیں خشکی میں رہ گئیں اور جب بحری تجارت نہ رہی تو اُن کی وہ رونق اور آبادی بھی نہ رہی اور وہ رفتہ رفتہ ویران ہو گئیں۔

ان تمام تعلقات اور اثرات کے باوجود، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ (کشان) بادشاہ نسلاً ترکستانی اور مذہب کے اعتبار سے وسیع مشرب بت پرست تھے جنھیں ایرانی اور یونانی اصنام کے روبرو سجدہ کرنے میں باک تھا نہ ہندوستانی دیوتاؤں کے پوجنے میں۔ اُن کے لبادے اور پاؤں میں نرم چمڑے کے موزے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ بیرونی ہند سے وہ لباس کی طرز اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ قدیم ہندوستان میں چادر یا دھوتی کے سوا کسی لباس کے پہننے کا عام رواج نہ تھا۔

باب ۱۰

پہلی فصل سلطنت مگدھ کا دوسرا دورِ فروغ

گپت خاندان کا آغاز

قدیم تاریخ ہند کی یہ "صدائے بازگشت" بھی یاد رکھنے کے لایق ہے کہ سلطنت مگدھ کو پہلی مرتبہ بھی اس وقت عروج ہوا جب اجاتشترو نے لچھوی قوم کی کسی امیرزادی سے شادی کی۔ اور دوسری مرتبہ بھی اس ریاست نے فروغ پایا تو اس کا پہلا واقعہ بلکہ شاید قوی سبب یہی تھا کہ مگدھ کے گمنام سے راجہ چندر گپت کا اسی لچھوی قوم کے خاندانِ شاہی میں پیوند ہوا۔ یہ غیر ہندی قوم جس کے ساتھ راجگانِ ہند کا سنجوگ ایسا مبارک ثابت ہوا، دوسری صدی عیسوی کے شروع میں ملک نیپال پر قابض ہو گئی تھی۔ مگر اس ایک واقعے کے سوا، پانچویں صدی ق م سے چوتھی صدی عیسوی تک اس کا کہیں نام سننے میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ سنگ خاندان کے زوال کے وقت اُن کا دستِ تصرف خاص پائے تخت پاٹلی پترا تک دراز ہو گیا ہو اور مگدھ کی سلطنت کے خاتمے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہو۔ لیکن یہ سب بے بنیاد قیاسات ہیں البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھی کے ہاں رشتہ ہو جانے سے چندر گپت کو یہ حوصلہ ہوا تھا کہ اس نے ادھی راج یا "شہنشاہ" ہونے کا دعوے کیا۔

اس کے سکوں پر اپنے نام کے ساتھ اس کی بیوی کمار دیوی کا نام بھی کندہ ہے اور کتبات میں اس کا نامور جانشین کمار دیوی کا بیٹا ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں مذکورۂ بالا قول کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس خاندان کا نام چندر گپت سے بھی پہلے کا ہے لیکن اس کا (گپت نامی) دادا چھوٹی سی ریاست کا معمولی رئیس تھا اور سلطنت کی شان چندر گپت (اول) ہی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ اسی نے گنگا جمنا کے سنگم تک اپنا علاقہ بڑھایا اور اپنے نام کا سمت الگ جاری کیا جس کا کئی صدی تک ہندوستان میں رواج تھا۔ اس کا آغاز فروری ۳۲۰ء سے ہوتا ہے۔ اور اسی کو چندر گپت اول کی باضابطہ تخت نشینی کی تاریخ سمجھنا چاہیے اگرچہ کمار دیوی سے اس کی شادی ۳۰۸ء میں ہوئی تھی۔ غرض جس طرح ۳۲۲ ق م میں چندر گپت موریا کی تخت نشینی نے مگدھ کی پہلی سلطنت کا آغاز کیا تھا اسی طرح اس کے ہمنام چندر گپتا کی بادشاہی ۳۲۰ء سے مگدھ کے دوسرے دور فروغ کا افتتاح کرتی ہے۔

سمدر گپت

لیکن عہد چندر گپت کے واقعات کا ہمیں تفصیلی طور پر علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس نے کب وفات پائی۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وفات کا اور اس کے بیٹے **سمدر گپت** کی جانشینی کا سال ۳۳۰ء ہے اور گپت خاندان کا یہی وہ اقبال مند بادشاہ ہے جس نے مگدھ کو دوبارہ ہند کی سب سے بڑی سلطنت بنادیا۔ دربار کے شاعر **ہریشن** نے اس کے جنگی کارناموں کے بیان میں جو قصیدۂ مدحیہ لکھا تھا وہ اشوک کی ایک لاٹھ پر کندہ کیا ہوا ملا ہے۔ اور یہ انسانی مذاق اور خیالات کے تنوع کا عجیب نمونہ ہے کہ لاٹھ کے ایک پہلو پر تو درویش مزاج اشوک "نفس کشی" کو انسان کی سب سے بڑی فتح بتاتا ہے اور دوسری طرف دیکھیے تو سمدر گپت کو جنگجوئی اور جدال و قتال پر اس قدر ناز ہے کہ وہ بادشاہ کا فرض ہی "ملک گیری" کو قرار دیتا ہے۔ بہر حال، اگر ہریشن کے قصیدے میں کچھ بھی صداقت ہے تو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ غالباً سمدر گپت تاریخ ہند کا سب سے بڑا فاتح گزرا ہے جس نے دکن پر گیارہ حملے کیے اور شمال میں نو بڑی بڑی لڑائیاں لڑا۔ بدوی قبائل کے سرداروں یا سرحد پر ہمسایہ بادشاہوں سے جو مقابلے

باب

ہوتے رہے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ واضح رہے کہ ہریشن کا قصیدہ کوئی باقاعدہ تاریخی تحریر نہیں ہے اور عہد سمدر گپت کے واقعات وسنین بھی بہت کچھ تاریک ومشکوک ہیں۔ مگر ہم یہاں اتنا کرسکتے ہیں کہ ونسنٹ اسمتھ کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ مصنف ہے جس نے کئی سال کی محنت وعرق ریزی کے بعد سمدر گپت کے حالات دریافت کیے اور اسے دنیائے تاریخ میں روشناس کیا ورنہ پہلے لوگ اس کا نام تک نہ جانتے تھے۔

فتوحات اور وسعت سلطنت

ونسنٹ اسمتھ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے اس "نپولین" یا "ملک کافور" نے اول شمالی علاقوں کو فتح کیا ہوگا جس کے بغیر جنوب کے دور دست ممالک میں پیش قدمی کرنا دشوار تھا۔ ٹھیک سن کا پتا نہیں چلتا لیکن غالباً جنوب پر اس نے ۳۴۸ء کے قریب زمانے میں فوج کشی کی اور پہلے وادی مہاندی کے راجہ مہندر کو زیر کیا۔ پھر وسط ہند کی غیر آباد اور نیم متمدن ریاستوں کو پامال کرتا ہوا وہ ملک کلنگ میں در آیا اور وہاں کے بعض مشہور قلعے اور پائے تخت پشت پور کو اس نے مسخر کیا۔ یہ شہر دریائے گوداوری کے دہانے سے پچیس تیس میل شمال میں واقع اور پتھاپورم کے نام سے مشہور ہے۔ پھر اس نے گوداوری اتر کے ونگی کے راجہ کو شکست دی اور کانچی (یا کنجی ورم) تک بڑھ آیا جہاں ان دنوں پلو (Pallava) قوم کا کوئی راجہ حکومت کرتا تھا۔ اسی شہر کو جو پیلار ندی پر موجودہ مدراس کے جنوب مشرق میں واقع ہے، اولوالعزم حملہ آور کی پیش قدمی کی جنوبی حد سمجھنا چاہیے، غالباً یہیں پہنچ کر اس نے اپنے فتحمند رفقا کو واپسی کا حکم دیا اور موجودہ مہاراشٹر اور خاندیس کے راجاؤں کو مغلوب کرتا ہوا، مظفر و منصور اپنے وطن میں داخل ہوا (قیاساً سنہ ۳۵۰ء) بے شبہہ ان جنوبی فتوحات میں بہت کچھ لوٹ کا مال حملہ آوروں کے ہاتھ آیا ہوگا لیکن یہ علاقے مستقل طور پر سلطنت مگدھ میں شامل نہیں ہوئے اور سمدر گپت محض اطاعت کا عارضی اقرار لے کر واپس چلا گیا۔ اس کی سرحدی لڑائیاں جن کا ہریشن بہت بڑھا چڑھا کے ذکر کرتا ہے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں البتہ ان سے سمدر گپت کی حدود سلطنت قرار دینے میں مدد ملتی ہے اور ہم خاصی طرح یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہگلی سے

جمنا اور ہمالیہ سے نربدا تک کشور ہند کا بہترین حصہ سمدر گپت کے زیر نگیں تھا اور ان کے آگے بھی مشرق و جنوب کی سرحدی ریاستیں اس کی اطاعت کا دم بھرتی تھیں۔

ایسے طاقتور ہمسائے سے کابل و بخارا کے شاہانِ کشان کو دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا خیال آیا تو یہ قدرتی بات تھی۔ لیکن دربار لنکا سے رسل ورسائل کا سبب دوسرا پیدا ہو گیا۔ وہ یہ کہ وہاں کے ہمعصر بادشاہ سری میگھ ون نے بودھ گیا کی زیارت کے لیے دو بھکشو بھیجے اور ان غریب الوطن راہبوں کی ہندی باشندوں نے کچھ آؤ بھگت نہ کی۔ شاید اس بے مروّتی کا سبب یہ ہو کہ لنکا والے بودھ مت کے جس فرقے میں داخل تھے، یہاں اسے اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ بہر حال، یہ شکایت لنکا میں پہنچی تو سری میگھ ون نے سمدر گپت کے پاس بہت کچھ تحفے تحائف اور سفیر بھیجے اور درخواست کی کہ دربار لنکا کو اس متبرک درخت کے قریب (جہاں گوتم بدھ کو عرفان حاصل ہوا تھا) خانقاہ بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ سمدر گپت نے خوشی سے قبول کیا اور شاہ لنکا نے جو عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی وہ ہیونن چونگ چینی کی سیاحت کے زمانے تک سلامت اور آباد تھی۔

وفات اور ذاتی اوصاف

غالباً دکن کی مہم سے مراجعت کے بعد ہی اس اقبال مند راجہ نے "اشومیدھ" یعنی اسپ قربان کا جشن منعقد کیا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ عرصۂ دراز تک فرماں روائی کرتا رہا اور قرائن سے پایا جاتا ہے کہ اس نے ۳۷۵ء میں وفات پائی۔ ہرشین اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ فن شعر و موسیقی میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس قول کی قطعی تردید یا تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ سمدر گپت میں سپہ سالاری اور حکمرانی کی قابلیت بدرجہ اعلیٰ موجود تھی اور موسیقی سے اس کے شوق کا ثبوت وہ سکّہ ہے جس میں وہ تخت پر ایک پاؤں لٹکائے ستار لیے نظر آتا ہے۔ شاعر کا یہ بیان تسلیم نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ سمدر گپت علم و فضل کا قدرداں مربّی اور مذہبی مسائل کے مطالعے اور مباحثے کا بہت شائق تھا، اور ہر قسم کے اہل کمال اس کے دربار کی زینت بڑھاتے تھے۔

چندر گپت ثانی یا بکرماجیت

سمدر گپت نے آیندہ بادشاہی کے لیے اپنے کئی بیٹوں میں سے چندر گپت کو

باب[۱]

منتخب کر لیا تھا جس نے تخت پر بیٹھ کر "بکرماجیت" (Vikramaditya) یعنی شمس الدولہ) کا لقب اختیار کیا۔ ہندوستان میں ایک قدیم راجہ بیر بکرماجیت کی حشمت و کامرانی اور عدل و انصاف کے بہت سے قصے مشہور ہیں، عجب نہیں کہ وہ یہی چندر گپت ثانی ہو۔ اس قیاس کے خلاف سب سے بڑا دھوکا "بکرمی سمت" سے ہوتا ہے جس کا آغاز ۵۸ ق م سے ہوا۔ لیکن چندر گپت ثانی کہانیوں کا بیر بکرماجیت ہو یا نہ ہو اس میں شبہہ کی مطلق گنجایش نہیں کہ اول اول یہ سمت "بکرماجیت" کے نام سے منسوب نہ تھا۔[۱]

بہر حال، گپت خاندان کا یہ فرماں روا بھی اپنے وقت کا بڑا اقبال مند اور بہادر بادشاہ گزرا ہے اور مالوے پر کئی بار حملے کر کے مغربی ست راپوں کی حکومت کا اسی نے خاتمہ کیا۔ اس طرح، مگدھ کی سلطنت ایک مرتبہ پھر قریب قریب اسی قدر وسیع اور طاقتور ہو گئی جس قدر کہ شاہانِ موریا کے زمانے میں تھی۔ ان ست راپوں کے آخری حکمراں کی پاٹلی پترا میں موت کا قصہ پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ مگر اس سے ہم زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بکرماجیت کی "فتح گجرات و مالوہ" میں زور و قوت کے علاوہ بعض اتفاقی حادثات یا کسی مکر و فریب کا بھی دخل تھا۔

فاہیان کی سیاحت

اس نامور بادشاہ کی بھی کوئی تاریخ موجود نہیں لیکن خوش قسمتی سے فاہیان چینی[۲] اسی کے آخری عہد حکومت میں ہندوستان آیا اور اپنا سفر نامہ

[۱]۔ انسائی کلو پیڈیا جلد ۱۳ صفحہ ۴۹۷۔

[۲]۔ اس چینی سیاح کے متعلق انسائی کلو پیڈیا میں جو نوٹ لکھا ہے اس کا یہاں ترجمہ کر دینا فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:-

"بودھ مت کے اس چینی درویش نے کہ زائر سیاح اور انشا پرداز بھی ہے ہندوستان کے متعلق چینی زبان میں سب سے پہلی اور قابل قدر کتاب لکھی تھی۔ ان دنوں سلطنت "تسین" (یعنی چین) کا پائے تخت چنگن یا سی گان فو میں تھا، یہیں سے فاہیان روانہ ہوا اور چین کی بڑی دیوار سے گزر کے اس نے "ریت کا دریا" یعنی دشت گوبی طے کیا۔ یہ صحرا شیاطین اور ہوائے گرم کا گھر سمجھا جاتا تھا زمین پر کوئی جانور یا ہوا میں کوئی پرندہ وہاں نظر نہ آتا تھا

ہمارے لیے یادگار چھوڑ گیا ہے۔ بودھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت اور کتب و روایات کی تلاش اس کے سفر کی اصلی غرض تھی اور اس لیے وہ کسی دوسری طرف بہت کم توجہ کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے زمانے کے ہندی فرماں رواکا بھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ بایں ہمہ اس کی تحریر سے بعض کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور بکرماجیت کے نظم و نسق کا دھندلا سا خاکہ نظر میں پھرنے لگتا ہے: ہندوستان کے اکثر صوبوں میں فراغت و آسودگی نظر آتی ہے۔ ایسے قوانین بہت کم ہیں جو عمال کو رعایا کے پریشان کرنے کا موقع دیں۔ جرائم کی سزائیں بھی نسبتہً ہلکی ہیں اور اکثر جرمانوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ رہزنی اور بغاوت کی سزاؤں میں عدالت مجرم کا دست راست کاٹ دینے کا حکم دے سکتی ہے لیکن اس انتہائی سختی کی زیادہ نوبت نہیں آتی اور مجرموں کو اذیت دینے کا بھی رواج نہیں۔ ملک میں جرائم کی کمی ہے اور راستے خاص طرح محفوظ ہیں چنانچہ رستے میں لٹ جانے کی مصیبت سے جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور صرف مُردوں کی ہڈیاں راستے کا نشان دیتی تھیں۔ ختن پہنچ کر ہمارے سیاح نے بودھ مت کے ایک میلے کی سیر دیکھی جو اُن دنوں وہاں ہو رہا تھا۔ اُس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی علاقے میں نیز یارقند و افغانستان میں جو "قرونِ وسطیٰ" کے ختم ہونے سے پہلے پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ گئے تھے اُس وقت بودھ مت کا دَور دَورہ تھا۔ پھر ہندوکش کی "دیوار جیسی پہاڑیوں" سے اتر کر جن کی خطرناک بلندی دس ہزار ہاتھ تھی، فاہیان (۴۰۲ء کے قریب) وادئ سندھ کے راستے ہندوستان پہنچ گیا اور آیندہ دس برس اس نے "بودھ مت کی اسی مرکزی اقلیم" میں گزارے اور پشاور سے افغانستان (خاص کر کابل کے علاقے) تک اور دوسری طرف وادئ گنگا تک کئی سفر کیے۔ اُس کی خاص غرض یہ تھی کہ ان مقامات کی زیارت کرے جن میں گوتم بودھ نے اپنی زندگی بسر کی۔ مذہبی کتابوں کی نقل حاصل کرے اور اس مذہب کے اُن فقرا اور حکماء کی صحبت سے مستفید ہو جنھیں برہمن (دوبارہ زور پکڑ جانے کے باوجود) ابھی تک ملک سے دفع نہ کر سکے تھے × × × × × × لیکن مختلف مقامات کی سیر کے بعد اس کے سفرنامے میں مذہبی اور باطنی مسائل کی طویل بحث آجاتی ہے۔ یعنی کبھی کرامات اور خوارق کے قصے اور کبھی اخلاق کے مباحث، دنیاوی

باب ۳

کمار گپت

ساتویں صدی میں ہوئین چوینگ یا ہوئین تسانگ پر کئی مرتبہ پڑی، فاہیان ایک دفعہ بھی دو چار نہیں ہوا۔

اس درویش سیاح نے بودھ مت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ہم اگلی فصل میں کام لیں گے یہاں سلسلۂ واقعات درست رکھنے کے لیے کمار گپت کا ذکر کر دینا چاہیے جس کے زمانے سے گپت خاندان کی حکومت میں زوال آنے لگا۔ وہ اپنے باپ کے بعد ۴۱۳ء میں تخت نشین ہوا اور عرصۂ دراز تک اقبال و کامرانی کے ساتھ حکومت کرتا رہا بلکہ جشن "اشومیدھ" کے بپا کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اس نے کچھ اور علاقہ بھی فتح کیا تھا۔ لیکن آخری ایام حکومت میں اسے کسی ہمسایہ قوم سے سخت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مشاہدات کے لیے کوئی گنجایش نہیں چھوڑتے۔ حتیٰ کہ فاہیان گنگا کے دہانے سے تجارتی جہاز میں روانہ ہو جاتا ہے اور چودہ دن میں لنکا پہنچ کر دم لیتا ہے۔ یہیں اس نے اُن مذہبی کتابوں کی نقلیں لیں جن کا چین میں کوئی نام تک نہ جانتا تھا۔ وہ تہوار بھی اس نے یہاں دیکھا جس میں ہر سال گوتم بودھ کے دانت کی لوگ زیارت کرتے تھے۔

دین اسلام کے آغاز سے دو صدی پہلے اس جزیرے میں عربوں کی بحری تجارت کا بھی فاہیان نے ذکر کیا ہے۔ یہاں سے وہ سمندر کے راستے دریائے ینگ سی کیانگ کے دہانے تک پہنچ گیا۔ راستے میں جاوا پر جہاز بدلنے کی ضرورت پڑی اور ایک جگہ طوفان میں اس کا جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچا۔

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں ہند اور وسط ایشیا میں جو قوت اور اکثر مقامات پر جو غلبہ بودھ مت کو حاصل تھا، فاہیان کا سفرنامہ اس کی نہایت عمدہ شہادت ہے۔ کتاب کے سیاق سے ہر جگہ اس کے مذہبی شغف اور علمیت و فراست کا پتا چلتا ہے۔ گو کہیں کہیں شوق زیارت نے اسے حد اعتدال سے گزار دیا ہے لیکن جو کچھ اس نے لکھا وہ نہایت احتیاط و صحت کے ساتھ لکھا اور اس کے اکثر مقاماتِ سیاحت کا اس زمانے میں بہ آسانی پتا چل جاتا ہے۔ باقی اُس کے مذہبی جذبے کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن چین کو وہ محض "سرحدی زمین" بتاتا ہے اور بودھ مت کا "صدر" ہندوستان کو قرار دیتا ہے۔ جلد دہم صفحہ ۱۲۵۔

زک پہنچیں اوران لڑائیوں نے سلطنت کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ وہ کمارگپت کی زندگی میں پوری طرح نہ پنپ سکی۔ اور ادھر اس کے مرتے ہی (۴۵۵ء) ان تاتاریوں کے خوفناک حملے شروع ہو گئے جنھیں عام طور پر "گورے ہون" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

دوسری فصل :- مذہب اور علوم و فنون

تاتاریوں کی یورش اور گپت خاندان کے زوال و خاتمے کا ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔ مگر ان بادشاہوں کے عہد عروج سے گزرتے وقت مناسب ہے کہ ہم ایک نظر اس زمانے کے اندرونی حالات پر ڈال جائیں، یعنی ۳۲۰ء سے ۴۵۵ء تک اہل ہند کے مذہبی خیالات اور علوم و فنون کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہو سکی ہیں ان کا ضروری خلاصہ پیش کر دیں تاکہ ناظرین کو ایک حد تک اس عہد کی اصلی تہذیب کے سمجھنے کا موقع مل جائے۔

بودھ مت کا ظاہری حال

مذہب کے متعلق ہمارا سب سے اچھا ماخذ فاہیان چینی کا سفرنامہ ہے جس نے پانچویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان کے بہت سے مقامات کی سیاحت کی اور لوگوں کے مذہب خاص کر بودھ مت کے حالات تفصیل سے قلم بند کیے، اس نے اپنے پہلے ہی سفر میں دریائے سندھ سے جمنا تک بودھ مت والوں کی بہت سی خانقاہیں دیکھیں جن میں ہزاروں بھکشو اس مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ بودھ کے قوانین کی ہر جگہ پابندی کی جاتی تھی۔ جانداروں کو مارنا، مویشی کی فروخت حتیٰ کہ مرغ پالنا بھی نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قانون کے دائرے سے اگر کوئی باہر تھا تو وہ چنڈال قوم کے لوگ تھے جنھیں اُن کے دوسرے بنی نوع اس قدر نجس جانتے تھے کہ ذرا چھو جانا اُن کے تمام جسم کو ناپاک کر دیتا تھا۔ بودھ مت کے بھکشوؤں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ ہر صاحب استطاعت انھیں خیرات دینا موجب ثواب جانتا تھا اور سرکاری طور پر اُن کی خانقاہوں کے نام جو رقوم یا جاگیریں لگتی تھیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

باب ۵

برہمنی مت کا احیاء

لیکن یہ بودھ مت کے ایک پُرجوش زائر کے خیالات ہیں جسے اپنے مقدس مقامات کے دیکھنے کا شوق صدہا میل سے ہندوستان کھینچ لایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ہر شے کو عقیدت مندانہ دیکھتا ہے اور اس کی کمزوری یا خامی پر گہری نظر نہیں ڈالتا۔ اپنے مشاہدات بیان کرنے میں اس نے صداقت سے تجاوز نہیں کیا بایں ہمہ بودھ مت کے غلبے کی جو تصویر کھینچی وہ اس کی سادگی اور ظاہر بینی کی غماز ہے۔ جدید اہل تحقیق نے اس بات کے ثبوت فراہم کر لیے ہیں کہ جب فاہیان ہندوستان آیا تو اس وقت بودھ مت میں زوال شروع ہو گیا تھا۔ خانقاہوں کی دولت مندی یا رونق محض نمائشی چیز تھی ورنہ اس کی اصلی قوت تیسری صدی سے گھٹنے لگی تھی اور حریفِ قدیم (یعنی برہمنی مت) کا زور بڑھ رہا تھا۔

برہمنوں کے اس طرح دوبارہ فروغ پانے کے اندرونی اسباب خواہ کچھ ہی ہوں یہ امرِ واقعہ ہے کہ مالوے کے ست راپ اور گپت خاندان کے فرماں روا اُن کے پُرجوش حامی تھے۔ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ بودھ مت کے عینِ عروج کے زمانے میں بھی، ہندوستان کا قدیم مذہب فنا نہیں ہوا تھا بلکہ پہلی صدی عیسوی ہی میں بعض کشان بادشاہ شوجی کے پرستار یعنی برہمنوں کے معتقد تھے۔ خود مہاراجہ کنشک کے عہد میں بودھ مت کے جس فرقے (یعنی "مہایانی") نے فروغ پایا اس کے بعض عقاید میں برہمنوں سے اتفاق کر لیا گیا تھا اور بُت پرستی غالباً اس سے بھی پہلے ان کے ہاں جائز و رائج ہو گئی تھی۔ پس یہی دو باتیں اس بات کا کافی ثبوت ہو سکتی ہیں کہ بودھ مت اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا اور اس کے علما کو برہمنوں کے مقبولِ عام عقائد اختیار کرتے ہی بنی۔ ظاہر میں تو یہ اُس کی قبولیت کو بحال رکھنے کی بہت کارگر تدبیر تھی مگر درحقیقت اپنے مابہ الامتیاز اصول کو بدلنا، گویا بودھ مذہب کی جُداگانہ ہستی کو مٹا دینا تھا۔

سنسکرت کا احیاء

بودھ مت کے اس زوال کا برہمن اگر سبب نہ تھے تو سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے ضرور تھے۔ اور ان کو بڑی تقویت اپنی قدیم زبان کی بدولت پہنچی جس نے اسی زمانے میں دوبارہ سر ابھارا اور شاہانِ گپت کی قدردانی سے بہت جلد ہندوستان کی مروّجہ پراکرتوں پر غالب آگئی۔ منو کا دھرم شاستر، کالیداس کی شاعری، آریا بھٹ کی ہیئت و ہندسہ کی تصانیف، اسی زمانے کی

بانٹہ

شہرۂ آفاق یادگاریں ہیں جنہوں نے سنسکرت کو ہند کی سب سے مستند علمی زبان بنادیا، پرانوں کے پہلے مجموعے (وایو پران) کو بھی اسی زمانے سے منسوب کرتے ہیں اور ونسنٹ اسمتھ کے نزدیک وہ چوتھی صدی کے نصف اول میں مرتب ہوا۔ اسی مورخ کی رائے ہے کہ خاندانِ گپت کے زمانے میں اس علمی تحریک کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انھی ایام میں اہل ہند کو چین و رومۃ الکبریٰ کے تمدن سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔[1] ممالک غیر سے میل جول ہمیشہ قوموں کی علمی اور دماغی ترقی کا محرک ہوتا ہے اور گو ظاہری ثبوت میسر نہ آئیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن دنوں رومی مقبوضات سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور چین سے دینی اور دنیاوی تعلقات ہونے کی تو بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

عمارت سنگتراشی اور نقاشی

مگر اس عہد میں غالباً سب سے نمایاں ترقی عمارت و نقاشی کے فن میں ہوئی اور قدیم ایرانیوں کی تقلید سے ہندوستان کے معمار اسی زمانے میں آزاد ہوئے۔ کیونکہ تاریخ کی جہاں تک دسترس ہے، قدیم سے یہاں کی بڑی عمارات ایرانی محلات کے طرز پر بنائی جاتی تھیں۔ لیکن گپت خاندان کے ایام حکومت میں جہاں عمارتی نقش و نگار کے فن میں بڑی ترقی ہوئی وہاں خود عمارات کی بھی نئی نئی صورتیں نکالی جانے لگیں اور اسی زمانے کا خاص طرز عمارت مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے تک مقبول رہا۔[2]

---

[1] ۔ سواحلِ ہند اور جزائر شرق الہند میں اُن دنوں خوب آمد و رفت تھی اور بعض تحریروں میں رومی قیصروں کے ہاں ہندوستانی سفارتوں کے جانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ (آوکس ص - ۱۶۲)

[2] ۔ انسائیکلو پیڈیا جلد چہاردہم صفحہ ۱۲۹۔

ونسنٹ اسمتھ اپنی تازہ ترین کتاب میں لکھتا ہے کہ "عہد گپت کا سب سے مشہور اور قابل دید سنگی مندر دیوگڈھ ضلع جھانسی میں سلامت رہ گیا ہے اس کی تعمیر پانچویں صدی یا چھٹی صدی کے نصف اول سے منسوب کرسکتے ہیں اور اس کی دیواروں پر ہندی سنگ تراشی کے بعض بہترین نمونے موجود ہیں۔ گر یہ مندر زیادہ وسیع نہیں اور بھیتر گاؤں ضلع کانپور کا

فن عمارت کے ساتھ قدرتی طور پر سنگ تراشی نے فروغ پایا اور اس فن کے بہترین ہندی نمونے اسی زمانے سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اسی ضمن میں ونسنٹ اسمتھ نے نقاشی کی ترقی کو بھی اس عہد سے منسوب کیا ہے اور نظیر میں غارہائے اجنتہ کی لاجواب تصویریں پیش کی ہیں (آرلی ہسٹری صفحہ ۳۰۶) ان میں سے بعض تصویریں زیادہ قدیم ہیں اور بعض چھٹی ساتویں صدی عیسوی، یعنی اس زمانے کے بعد تیار ہوئیں جو ہمارے پیش نظر ہے[1]۔ لیکن یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اجنتہ کے دو غار اسی پانچویں صدی میں تراش کر آراستہ کیے گئے تھے[2]۔

تیسری فصل: ہونوں کی یورش اور گپت خاندان کا خاتمہ

سکند گپت

لیکن اب ہمیں پھر اپنے سلسلۂ تاریخ کی طرف عود کرنا چاہیے کہ جب راجہ کمار گپت نے ۴۵۵ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا سکند گپت جانشین ہوا تو سلطنت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ اس کا باپ اپنے آخری زمانے میں جس قوم ("پشیہ متر" نامی) سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خشتی مندر اس سے بڑا ہے جو غالباً چندر گپت ثانی کے عہد میں بنا تھا ۔۔۔۔ اس عہد کے صناع اور کاریگر دھاتوں کے کام میں بھی پوری طرح مہارت رکھتے تھے۔ دلی میں جو لوہے کی لاٹھ ہے وہ سمدر گپت کے زمانے میں ڈھالی گئی اور صنعت قلب معادن کا لاجواب نمونہ ہے۔ وسیع پیمانے پر تانبے کے بت ڈھالنے کا عمل بھی ان دنوں کامیابی سے کیا جاتا تھا چنانچہ گوتم بودھ کی ایک ڈھلی ہوئی مورت جو نالندا (بہار) میں چھٹی صدی کے اواخر میں نصب کی گئی تھی، ۲۶ گز کے قریب اونچی تھی۔ اس کی ایک اور پانچ ہاتھ اونچی مورت جو سلطان گنج سے دستیاب ہوئی، برمنگھم (انگلستان) کے عجائب خانہ میں موجود ہے، اور چندر گپت ثانی کے عہد میں تیار کی گئی تھی۔ (اوکس ہس۔ ۱۶۱)۔

[1] انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۴۵۱۔

[2] اکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۶۱ بحوالہ جرنل ایشیاٹک سوسائیٹی۔

باب ۲

مصروف جنگ رہا گو اس کے متعلق یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ شمالی ہند کی تھی تاہم وہ اتنی قوی ضرور تھی کہ کمار گپت کی فوجوں پر غالب آئی اور اگر ولی عہد (یعنی سکند گپت) ہمت وجفاکشی سے کام نہ لے تو سلطنت کی خیر نظر نہ آتی تھی لیکن سکند گپت نے رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا اور سخت کوشش کے بعد آخر کار غنیم پر فتح پائی۔ اس لڑائی سے نجات حاصل ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں کا سیلاب ہند پر اُمنڈ پڑا۔ اور سکند گپت کو بادشاہ ہوئے غالباً تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ اُسے سلطنت کو وحشیوں کے اس ٹڈی دل سے بچانے کی فکر پڑ گئی۔ مگر پہلی مرتبہ اس نے فتح پائی (قیاساً ۴۵۵ء) اور چند سال کے لیے اس بلائے سخت کو ٹال دیا۔

گورے ہون

یہ خوفناک حملہ آور نسلاً وسط ایشیا کی انھی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں جن کی یورشیں بار بار یورپ وایشیا کے امن میں خلل ڈال دیتی تھیں۔ مگر پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں اُن کے جو گروہ اپنے غیر آباد علاقوں سے نکل کر ایران و ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ان کے قومی نام میں اختلاف ہے۔ اسلامی مصنف انھیں "ہیتان" اور چینی "ییتھا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اصلی نام غالباً "ہپ تال" تھا اور مشرقی رومیوں نے اسی کو بدل کر "افتالوی" کر دیا جو تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یورپ کی زبانوں میں رایج ہے۔ (انگریزی میں (EPhtalite) کہتے ہیں) لیکن ہندوستان میں ان کو "ہون" (ہونڑ یا ہونا) کہتے تھے چونکہ یہ بہت عام نام ہے اس لیے رنگ کی مناسبت سے سفید یا گورے کی صفت بڑھا دی گئی کہ دوسرے تاتاریوں میں اور ان پانچویں صدی کے حملہ آوروں میں امتیاز کیا جا سکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشیوں نے پانچویں صدی کے آخر میں ماوراءالنہر پر قبضہ پا لیا تھا اور وہاں سے ایران وہندوستان کی جانب پاؤں پھیلا رہے تھے۔ ساسانی بادشاہوں سے ان کی (بہرام پنجم کے وقت سے خسرو نوشیرواں کے زمانے تک) بار بار لڑائیاں ہوتی رہیں اور سلطنت ایران کو اس خطرے سے نجات اُس وقت ملی جب کہ نوشیرواں کے تُرک حلیفوں نے ان کی حکومت کا

باب ۵

گپت خاندان کے آخری بادشاہ

تختہ الٹ دیا (۵۵۵ء) تاریخ میں ترکوں کا نام پہلی مرتبہ اسی ضمن میں آیا ہے۔

لیکن ہونوں کا جو سیلاب ہندوستان کی طرف بڑھا تھا وہ یہاں کے بادشاہوں کے روکے نہ رُکا۔ غالباً پہلی لڑائی جس میں سکند گپت نے فتح پائی اور بہت کچھ خوشیاں منائیں[1]، ہونوں کے پورے لشکر کے ساتھ نہیں ہوئی تھی اور وہ ان دنوں ایران پر قبضہ کرنے کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب ادھر سے کسی قدر فرصت ملی تو انھوں نے دوبارہ ہندوستان کا رُخ کیا اور شمال مغربی پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اب سلطنت گپت کا علاقہ قریب تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی سال میں اپنے پنجے پنجاب میں جمانے کے بعد انھوں نے پھر سکند گپت پر یورش کی۔ یہ باہمت راجہ اس مرتبہ ان خوفناک حملہ آوروں کے مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور مگدھ خاص کے سوا تمام سلطنت پر ہونوں کا تسلط ہو گیا۔

ان واقعات کی تفصیل اور سنین کا ٹھیک علم نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ سکند گپت کے بعد (۴۶۷ء) اس خاندان کے راجہ فقط مگدھ اور چند قریبی اضلاع کے حاکم رہ گئے تھے۔ ان میں پہلا شخص پورگپت ہے جس نے سکے کی اصلاح کی یعنی سکند گپت کے وقت میں خزانہ خالی ہوجانے کی وجہ سے جو کم عیار اشرفی رائج کرنی پڑی تھی اس کی بجائے طلائے خالص کی اتنی بڑی اشرفی ضرب کرائی کہ پہلے ہندوستان میں کبھی رائج نہ ہوئی تھی۔

۴۸۵ء میں پورگپت کا بیٹا نرسم گپت بالادت راجہ ہوا اور اس نے عرصۂ دراز تک حکومت کی جو ایشیائی ممالک میں اقبال مندی کی پہلی دلیل ہے۔ نرسم گپت کی دولت وحشمت کا دوسرا ثبوت وہ رفیع الشان مندر تھا جس کا ہیونین چونگ نے اپنے سفر نامے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ خشتی عمارت سو گز بلند تھی اور اس کی آراستگی میں بے شمار زر و جواہر صرف کیا گیا تھا۔ نرسم گپت نے یہ مندر بودھ مت والوں کے لیے

[1] فتح کی یادگار میں سکند گپت نے ایک مینار پر وشنو دیوتا کا بُت نصب کرایا تھا اُس معبد کا پتا نہیں لیکن وہ مینار ضلع غازی پور میں اب تک موجود ہے۔ اس پر جو کتبہ کندہ تھا وہ بھی اتفاق سے محفوظ رہ گیا۔ ۱۲

باب ۲

ان کے سب سے بڑے علمی مرکز نالندا[۱] میں بنایا اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ بودھ مت کا پیرو یا کم سے کم معتقد ضرور تھا۔

ہونوں کی دوسری شکست

لیکن نرسمہ گپت کی سب سے بڑی وجہ نام آوری یہ ہے کہ (ہوئین چوئنگ کے بقول) اسی نے وسط ہند کے راجہ جس دھرمن (یشو دھرمن) (Yasodharman) اور دوسرے رؤسا کے ساتھ مل کر ہونوں کو شکست دی[۲] اور ان کے بادشاہ مہرگل (Mihiragula) کو مالوے سے مار کر نکال دیا۔ ہونوں کے پہلے سردار کا نام ترامن یا ترمان (Toramana) تھا اور اسی کی سپہ سالاری میں ان وحشیوں نے پنجاب، دوآب اور وسط ہند کے ملک فتح کیے چنانچہ پانچویں صدی کے خاتمے کے قریب ہم اسے مالوے میں حکمراں پاتے ہیں۔ والبھی[۳] کے راجہ جنھوں نے مشرقی گجرات میں انھی دنوں اپنی علحدہ سلطنت بنالی تھی، ترمان کے خراجگزار تھے اور اس ہون سردار نے ہندوستان کی چند ہی روز ہوا تھا کہ "مہاراجہ" کا لقب اختیار کر لیا تھا، پھر جب وہ مرا (غالباً ۵۰۲ء میں) تو اس کے بیٹے مہرگل (Mihiragula) نے بھی لقب اور شیو پرستوں کا ہندی مذہب اختیار کیا۔ وہ نہایت سفاک اور جابر فرماں روا تھا اور بودھ مت کی کتابوں میں اس کے وحشیانہ مظالم کے بہت سے قصے محفوظ ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی تک ہونوں کی مرکزی قوت میں زوال نہیں آیا تھا اور اس لیے ترمان و مہرگل غالباً اپنی اُسی صدر حکومت کے ماتحت تھے جس کا پایۂ تخت

۱۔ اس مقام پر جو گاؤں کلکتے کے چند میل شمال میں آباد ہے اُسے "بڑگاؤں" کہتے ہیں۔ ۱۲

۲۔ رسالہ "ہندوستان ریویو" (ماہ جنوری ۱۹۱۸ء) میں مسٹر پنا لال نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ نرسمہ گپت کا اس فتح میں کوئی خاص حصہ نہ تھا بلکہ وہ زیادہ تر جس دھرمن ہی کی سعی سے حاصل ہوئی تھی۔ اس رائے کو ونسنٹ اسمتھ نے بھی تسلیم کر لیا ہے (آکسفرڈ "ایڈیشنز اینڈ کرکشنز")۔

۳۔ یہ شہر مشرقی گجرات میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب (بھاؤنگر سے چند میل شمال مغرب میں) قصبہ ولا آباد ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں بودھ مت والوں کی بہت مشہور درس گاہ تھی اور آٹھویں صدی تک یہاں کے راجہ خود مختارانہ حکومت کرتے رہے حتیٰ کہ عرب فاتحانِ سندھ نے ان کی بادشاہی کا چراغ گل کر دیا۔

باب ۵

ہرات کے قریب بامیان میں واقع تھا۔

بہرحال، اسی مہرگل کے ظلم و جور سے تنگ آکر ہندوستان کے بہت سے رئیسوں نے ایکا کیا اور غالباً جس دھرمن کی سپہ سالاری میں ہونوں کو شکست دی (قیاساً ۵۲۸ء) ادھر مہرگل کے چھوٹے بھائی نے بغاوت کی اور پایۂ تخت ساکل (Sakala) یعنی موجودہ سیالکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ ان وجوہ سے ہونوں کو مالوہ چھوڑنا پڑا اور خود شکست خوردہ مہرگل نے بھاگ کر کشمیر میں پناہ لی۔ کشمیر کے فرماں روا نے (جو غالباً اس کا ہم قوم تھا) مہربانی سے ایک جاگیر یا علاقہ عنایت کر دیا تھا مگر دو سال بعد مہرگل نے اپنے مربی سے بغاوت کی اور اسے دھوکے سے قتل کرا کے خود بادشاہِ کشمیر بن بیٹھا۔ پھر اس نے ہزارہا آدمیوں کو دریائے سندھ کے کنارے ذبح کرا دیا اور پہلے فرماں روا کے خاندان میں کسی فرد کو زندہ نہ چھوڑا۔ وہ شیو دیوتا کا پرستار تھا اور اس لیے بودھ مت والوں سے اس کو شدید نفرت تھی۔ چنانچہ اس مذہب کے درویشوں پر اس نے بڑے بڑے ظلم کیے اور ان کی بہت سی خانقاہیں تڑوا کر جو کچھ ہاتھ آیا لوٹ لیا۔

یہ خلاصہ ہے ان روایات کا جو ہوئین چونگ نے اپنے ہندی ہم مذہبوں سے سن کر تحریر کی ہیں۔ مہرگل کی موت کے متعلق اس چینی سیاح نے یہ روایت نقل کی ہے کہ "جب وہ مرا تو اولے اور بجلی کے طوفان آئے، آسمان تیرہ و تار ہو گیا، زمین ہل گئی اور مقدس ولیوں نے فرمایا کہ دیکھو ہزاروں بے گناہوں کو مارنے اور بودھ کا قانون توڑنے کی یہ سزا ہے کہ مہرگل کو دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں پھینک دیا گیا، جہاں وہ صدیوں تک انھی سخت عقوبتوں کے چکر میں رہے گا۔" اور یہی روایت غمازی کرتی ہے کہ مذکورۂ بالا تمام بیان میں مخالفانہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہوگا۔

ہونوں کا خاتمہ

مگر مہرگل دوزخ میں گیا ہو یا جنت میں، ہمیں اس مقام پر جو کچھ یاد رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ مہرگل کی وفات ۵۴۲ء یا اس کے قریب زمانے میں واقع ہوئی جب کہ ہونوں کی طاقت میں ہر طرف زوال کے آثار نمودار تھے۔ مذکورۂ بالا سن کے تقریباً پچیس برس بعد ترکوں نے ان کی صدر حکومت کا بھی قلع قمع کر دیا جس کا اوپر اشارۃً ذکر آچکا ہے۔ ہندوستان میں ان کی قوت غالباً مہرگل کے مالوے سے

باب ۲

فرار ہوتے وقت ہی کمزور ہوگئی تھی اور کچھ باقی تھی تو اس کے بعد اس قوم کے جو لوگ مختلف اقطاعِ ہند میں آباد ہو گئے تھے وہ بہت جلد اہلِ ہند کے ساتھ گھل مل کے اپنا نسلی امتیاز کھو بیٹھے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندوستان کی علمی زبان میں اس لفظ کا مفہوم تک بدل گیا۔

جس دھرمن اس ضمن میں باب ختم کرنے سے پہلے مالوے کے راجہ "یشو دھرمن" یا جس دھرمن کے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ مالوے میں اس کے تین کتبے ملے ہیں جس میں نہ صرف ہونوں پر مذکورۂ بالا فتح اس سے منسوب کی ہے بلکہ اسے تمام ہندوستان کا فرماں روا بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ جو علاقے گپت خاندان کے مہاراجہ اور ہون فتح نہ کر سکے تھے جس دھرمن راجہ نے انھیں بزورِ شمشیر فتح کیا۔ سوائے ان کتبات کے اور کہیں اس راجہ کا نام نہیں آتا اور ہیون چونگ نے مذکورۂ بالا جنگ کے حال میں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ نے اپنی ارلی ہسٹری (مطبوعہ ۱۹۱۴ء) میں ان کتبات کی صحت سے انکار کیا تھا لیکن تازہ ترین تحقیقات سے پایا جاتا ہے کہ جس دھرمن کم سے کم مالوے کا راجہ ہوگا اور مہرگل کی شکست میں غالباً سب سے زیادہ اسی کی سعی کو دخل تھا۔ (ادکس ص۔ ۱۶۳)۔

ضمیمہ باب ۱

کالی داس اور اس کی شاعری

سنسکرت زبان کے سب سے نامور شاعر کالیداس کے متعلق اہل تاریخ کو کوئی بات صحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ روایت عام کی رُو سے تو وہ پہلی صدی ق م میں ہوا ہے لیکن جدید تحقیقات اسے بہت بعد کا آدمی قرار دیتی ہے۔ لاسن اور ویبر جو کہ سنسکرت علم ادب کے مستند ماہر مانے جاتے ہیں، اس کا زمانہ تیسری صدی عیسوی بتاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ راجہ "بیر بکرماجیت" کے دربار کا ایک "رتن" تھا۔ مگر خود اس "بکرماجیت" کا زمانہ متعین کرنا دشوار ہے۔ اوپر ہم پڑھ آئے ہیں کہ چندر گپت ثانی نے اپنا لقب "بکرماجیت" رکھا تھا اور اگر کہانیوں میں جس "بکرماجیت" کا ذکر آیا ہے وہ یہی راجہ تھا اور کالیداس اس کے "نورتن" میں داخل تھا تو پھر اس شاعر کا زمانہ چوتھی صدی کا آخری حصہ ہوگا۔[1]

بہرحال، وہ کسی زمانے میں ہوا ہو اُس کے تخیل کی قوت، اس کے بیان کی قدرت، طبعیت کی پاکیزگی اور فطرت کی دل آویزیوں سے اس کا متاثر ہونا وہ اوصاف ہیں جو اُسے شعرائے عالم کی صف اول میں شمار ہونے کا مستحق بتاتے ہیں۔

---

[1] ونسنٹ اسمتھ اُسے پانچویں صدی کا آدمی بتاتا ہے (اوکس ہس ۱۶۱)۔

کم سے کم ہندوستان میں آج تک کوئی ناٹک اس کی "شکنتلا" اور "وکرم اروسی" کے پائے کا نہیں لکھا گیا۔ ان دونوں کے بہت سی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں مگر کالیداس کی تصانیف میں بہترین "شکنتلا" ہی کو مانا جاتا ہے۔ تیسرا ڈراما "مالوی کا گنامتر" اس درجے کی نظم نہیں۔ نہ اتنا مشہور و مقبول ہوا۔ "رگھ بنس" اور "کمار سمبھو" کی تصانیف بھی کالیداس سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دو طویل مثنویاں ہیں جن میں سے ایک راجہ رام چندر جی کے آبا و اجداد کا حال سناتی ہے اور دوسری میں خدائے جنگ "کمار دیو" کی ولادت کا سماں دکھایا گیا ہے۔ مگر غالباً ان سب سے زیادہ پُر کیف نظم "میگھ دُت" (یعنی "نامہ بر ابر") ہے: ایک دُور افتادہ شوہر عالمِ خیال میں بادلوں کو مخاطب کرتا ہے اور اُن کے ہاتھ اپنی محبوب بیوی کو اپنے حال کی اطلاع بھجواتا ہے۔ اور اسی کے بیان کرنے میں شاعر نے اپنی شاعری کا کمال دکھایا اور جذباتِ انسانی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ موسموں پر کالیداس نے جو چھوٹی سی نظم لکھی وہ معمولی "بارہ ماسے" کی قسم کی ہے باقی "نل دے" یا اور بہت سی مثنویاں ڈرامے وغیرہ جو اس کے نام سے مشہور ہیں طرزِ بیان کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں اور چونکہ "کالیداس" نام کے اور بھی دو تین شاعر ہو گزرے ہیں لہٰذا یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس کالیداس کی تصنیف ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر میکڈانل جن کی زبان سنسکرت پر کئی کتابیں مشہور ہیں، کالیداس کی شاعری کے بڑے مداح ہیں مگر اسی کے ساتھ ان کی رائے ہے کہ وہ بعض جگہ بہت تصنع سے کام لیتا ہے اور اس کے کلام میں وہ بے تکلفی نہیں پائی جاتی جیسی کہ وید کے قدیم اشلوکوں میں نظر آتی ہے۔ دوسرے اس کی نظم کے مختلف حصوں میں وہ تناسب نہیں جو "اجزا" کو "کل" کے ساتھ ہونا چاہیے اور قدیم یونانی اساتذہ کا خاص امتیاز تھا۔

باب ۱۱

پہلی فصل :- راجہ ہرش کا زمانہ

ونسنٹ اسمتھ نے اپنی قدیم ہندوستان کی تاریخ میں تین نقشے دیے ہیں اور سب سے اقبال مند راجاؤں کی حدودِ سلطنت دکھائی ہیں چنانچہ ایک اشوک میں راجہ کی سلطنت کا نقشہ ہے دوسرے میں سمدرگپت کے مقبوضات دکھائے ہیں اور تیسرے میں راجہ ہرش کے۔ یہ نقشے ایک حد تک ظنی ہیں بایں ہمہ تاریخ کے طالب علم کی سب سے پہلے جس شے پر نظر پڑے گی وہ یہ ہے کہ جو بادشاہ زیادہ قدیم ہے اُسی کی سلطنت زیادہ وسیع ہے :- افغانستان کی رودِ ہلمند سے دکن کی پینار ندی تک اشوک راجہ کی حکومت تھی۔ سمدرگپت صرف نربدا اور چناب کے درمیان کے علاقہ کا مالک تھا۔ ہرش کے زمانے میں وسط پنجاب کا رنگ بھی نقشے میں سادہ ہے کیونکہ ستلج سے اُوپر اس کی حکومت نہ تھی! کیا اس کے معنی یہ ہے کہ اہل ہند کے قوائے فطری میں زوال آگیا تھا۔

اس سوال کا بے تامل اثبات میں جواب دینے سے پہلے قیاس آرائی کے لیے چند قابل غور پہلو نظر آتے ہیں :-

(۱) اگر یہ مان لیا جائے کہ ہندوستان کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی تو

اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اُس کے مختلف حصوں کی جنگی قوت میں بھی ترقی ہوئی۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ اسی مناسبت سے ان سب کا فتح کرنا بھی دشوار تر ہوتا گیا۔

(۲) سکندر کے حملے نے ایران و ترکستان کے بادشاہوں کے سامنے گویا ایک نظیر قایم کردی تھی کہ پھر جو منچلا اُٹھتا وہ اس طرف ضرور یورش کرتا تھا اور گو ان کی فتوحات پائدار نہ تھیں مگر اس قسم کے حملوں نے غیر قوم والوں کا راستہ صاف کردیا تھا اور غالباً تیسری صدی قبل مسیح علیہ السلام سے تیسری صدی عیسوی تک اور دوبارہ چھٹی صدی میں ایران و ترکستان کے جتنے گروہ ہند میں آئے، نہ پہلے کبھی آئے تھے نہ (اسلامی فتوحات تک) بعد میں کبھی آکے بسے ہندوستان کے قدامت پسند باشندوں میں بار بار ان مختلف قوموں کی آمیزش اگرچہ فائدے سے خالی نہ تھی لیکن اس نے قومیت کے نہایت قوی عنصر یعنی اتحادِ نسل کا ناس کردیا، جس کے بغیر اس قدیم زمانے میں لوگوں کے خیالات[1] کا اتحاد محال تھا اور آج بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ اور خیالات کا متحد ہونا ہر قسم کی قومی یا سیاسی شیرازہ بندی کی پہلی شرط ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر کسی سلطنت یا حکومت میں استحکام آسکتا ہے نہ کوئی "قوم" بن سکتی ہے۔ اب اگر ہمارا پہلا نتیجہ صحیح ہے کہ موریا خاندان کے بعد، نو وارد قوموں کے آنے سے اہل ہند کے خیالات میں سخت انتشار و اختلاف پیدا ہوگیا تھا، تو دوسرا نتیجہ بھی صحیح ہوگا کہ پھر کوئی وسیع و مستحکم سلطنت ہندوستان میں قایم نہ ہوسکتی تھی۔ اس قول کی تائید میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تیسری صدی عیسوی میں سیدیوں یا سیتھیوں کی آمد بند ہوگئی اور ان کے آنے سے جو تلاطم پیدا ہوا تھا اُس کی موجیں ٹھیر گئیں، تو گپت خاندان کی سلطنت قایم ہوئی اور جب ہونوں کا سیلاب پھیل کر سوکھ گیا اور خیالات میں کسی قدر یکسوئی ہوئی، تو ہرش راجہ کو اپنی سلطنت قایم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ لیکن چونکہ اب اختلاطِ نسل و خون کی وجہ سے اہل ہند میں بے حد اختلافات پیدا ہوگئے تھے، لہٰذا یہ سیاسی نظام زیادہ عرصے تک نہ چلا اور ہرش کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

[1] اس جگہ لفظ "خیالات" میں محسوسات و جذبات دونوں داخل ہیں۔

باب ۱۱

ان قیاسات کے خلاف مغربی مصنفوں نے بالعموم ہندوستان کے اسباب طبیعی کو تمام خرابیوں کی علت گردانا ہے اور ڈریپر و بکل جیسے نامی انشا پردازوں نے اس بات کو ثابت کرنے میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں کہ ممالک ہند کی آب وہوا کا یہ فطری خاصہ ہے کہ جو قوم یہاں آ کے آباد ہو اُس کے دماغی اور جسمانی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو جائے اور وہ عیش دوست اور کاہل بن جائے۔ اور ظاہر ہے کہ پھر ایسی قوم کے افراد سے کسی خاص اولوالعزمی دکھانے کی یا وسیع سلطنت قایم کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اشوک و ہرش کی سلطنتوں کی وسعت میں جو فرق تھا اس کا سبب یہی سمجھنا چاہیے کہ اسباب طبیعی نے نووارد آریوں کو رفتہ رفتہ کم ہمت اور ضعیف کر دیا۔

عہد ہرش کے ماخذ

بہرحال، آب وہوا نے اہل ہند ہی کو ضعیف و کمزور کر دیا ہو یا آبادی کی افزونی اور اختلافِ نسل وخون کسی بڑی سلطنت بننے کے مانع ہوئے، اس معاملے میں تو ہرش اپنے نامور پیش رو سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس کے عہد کی دو کتابیں زمانے کی دست بُرد سے بچ گئیں اور اس کے متعلق بہت سے حالات محفوظ رہ گئے ورنہ ہندو قوم کو علم تاریخ سے جو فطری بیگانگی رہی ہے اس میں ہرش کے وقت تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی، ان میں ایک تو اُس کے درباری شاعر بان کی نظم "ہرش چرت" ہے اور دوسری، چینی فاضل ہیوئین چونگ کا (جو اسی عہد میں سیاحت و زیارت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا) سفرنامہ ہے۔ بان کی رزمیہ نظم کو اگر نصرتی کے "علی نامہ" سے تشبیہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دونوں شاعروں نے اپنے ممدوح بادشاہوں کے واقعات زندگی شاعرانہ مبالغے کے ساتھ نظم میں لکھے ہیں۔ اس قسم کی ہم عصر تحریریں بے اصل نہیں ہوتیں اور قدیم ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں تو وہ خاصکر بہت کارآمد سمجھی جاتی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس میں شاعر اپنے ممدوح کی صرف خوبیاں سراہتا ہے اور اس کے عیوب چھپا لیتا ہے اور چونکہ مکر وسازش سے کوئی کامیابی حاصل کرنا یا کسی کام میں ناکامی بادشاہ کا عیب مانی جاتی ہے، لہٰذا ان چیزوں کو وہ بیان نہیں کرتا۔ "ہرش چرت" کا بھی یہی حال ہے کہ اس میں جو

واقعات بیان کیے گئے ہیں اگرچہ وہ سراسر غلط نہیں بلکہ جس حد تک ہوئین چوئنگ کے سفرنامے سے ان کی تصدیق ممکن ہے، ان میں سے اکثر صحیح ہیں تاہم ان کے اصلی اسباب کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا اور بہت سے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خود ہرش کی تخت نشینی کا جائز ہونا ہی کسی قدر مشتبہ ہے۔

تخت نشینی

اس بارے میں ہم تک جو روایتیں پہنچی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تھانیسر کے بہادر و جنگجو راجہ پربھاکر کو مرض موت لاحق ہوا[1]، تو اس کے دونوں بیٹے پنجاب کی شمال مغربی سرحد پر ہونوں سے لڑنے گئے تھے۔ مگر سپہ سالاری اور جنگ کا اصلی انتظام بڑے بیٹے راج وردھن کے ہاتھ میں تھا، اور غالباً اس کا چھوٹا بھائی ہرش وردھن جس کی عمر اس وقت پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی صف جنگ سے بہت پیچھے سیر و شکار میں وقت گزارتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کی بیماری کی اطلاع پہلے اسی کو ہوئی اور وہ فوراً تھانیسر پہنچ گیا جہاں تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے باپ نے قضا کی اور اہل دربار میں ایک گروہ ہرش وردھن کو راجہ بنانے کی فکر کرنے لگا۔ لیکن راج وردھن کے پایۂ تخت پہنچنے میں دیر نہ لگی اور شاید اس کے پہنچتے ہی اہل سازش کے حوصلے پست ہو گئے تھے کہ اُسے اپنے بہنوئی کا انتقام لینے مالوے جانا پڑا جہاں کا راجہ اس کے بہنوئی کو مار کر بہن راج سری کو گرفتار کر لایا تھا۔ راج وردھن نے قاتل کو شکست دی لیکن دشمن کے فریب میں آکر خود مارا گیا اور تھانیسر کے درباریوں نے بہت کچھ تامل و تذبذب کے بعد بادشاہی کے لیے نوعمر ہرش کو منتخب کیا۔ ہرش کو اول اول اس جلیل القدر منصب کے قبول کرنے میں تردد تھا اور قبول کرنے کے بعد بھی اس نے کئی برس تک اپنا لقب راجہ کے بجائے "راج پتر" ہی رہنے دیا حالانکہ اس کا

[1] یہ ۶۰۵ء کا واقعہ ہے اور واضح رہے کہ مہرگل کی موت کے بعد سے چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر تک تاریخی واقعات بالکل تاریکی میں ہیں۔ یعنی اس پچاس ساٹھ برس کے زمانے میں ایک بات بھی ایسی نہیں معلوم ہو سکتی جو تاریخ میں قابل ذکر سمجھی جائے۔ ۱۲

باب ۱۱

سمّت اسی وقت سے شروع ہوتا ہے (اکتوبر ۶۰۶ء) تھانیسر کے درباریوں کو اس کے بادشاہ بنانے میں جو تامل تھا اس کا سبب تو ہرش کی کم سنی تھی لیکن ہرش کے تامل کی کوئی معقول وجہ شاعر نے بیان نہیں کی ممکن ہے کہ اس کی وجہ محض انکسار ہو اور یا یہ کہ وہ اتنی اہم ذمہ داری لیتے ہوئے جھجکتا ہو۔ مگر ایک امکان یہ بھی ہے کہ سلطنت کے دوسرے حق دار موجود ہوں اور ہرش ان کے مقابلے میں "راجہ" بننا جائز نہ جانتا ہو[1]؟

لڑائیاں اور فتوحات

بہر حال، تخت نشین ہوتے ہی اس کا پہلا کام یہ تھا کہ مصیبت زدہ بہن کی تلاش کرے جو قید سے نکل بھاگی اور بندھیاچل کے جنگلوں میں خودکشی پر آمادہ تھی کہ ہرش پہنچ گیا، اور اُن مصائب سے نجات پانے کے بعد راج سری کو جو عزت اور مرتبہ تھانیسر میں حاصل ہوا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک چینی مورخ نے اس کو ہرش کے ساتھ بادشاہی کا شریک بتایا ہے[2]۔ اسی سلسلے میں ہرش کو بنگالے کے راجہ سے لڑنا پڑا جو مالوے کے راجہ کی طرف سے لڑا اور راج وردھن کے قتل کا اصلی مجرم تھا۔ لڑائی کا نتیجہ معلوم نہیں مگر قرینہ کہتا ہے کہ اول اول ہرش کو چنداں کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے اپنی راج دھانی میں آکر از سر نو وہ فوج مرتب کی جس میں پچاس ہزار پیادہ بیس ہزار سوار اور پانچ ہزار جنگی ہاتھی تھے۔ اس فوج جرار سے وہ چھ سال تک شمالی ہند میں مسلسل جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ مشرقی بنگالے کے سوا یہ تمام ملک اس کے زیر نگیں آگئے اور اُس نے دکن پر فوج کشی کی تیاری کی۔

اب وہ تمام ہندوستان کو "ایک چھتر کے نیچے" لانے کا آرزومند تھا۔ اس غرض سے جنگی تیاریاں نہایت وسیع پیمانے پر کی تھیں۔ اور غالباً مفتوحہ ممالک کی ساری دولت اسی جذبۂ کشور کشائی پر نثار کر دی تھی۔ کیونکہ دوبارہ جب وہ میدان میں نکلا تو اس کے جھنڈے کے نیچے ساٹھ ہزار جنگی ہاتھی اور

۱۔ اسمتھ صفحہ ۳۳۸۔
۲۔ "یُو فانگ چی" مطبوعہ واٹرز۔ جلد اول صفحہ ۳۴۵۔

ایک لاکھ شتہ سوار جمع تھے کہ جس ملک پر بڑھے پامال کرتے نکل گئے۔ لیکن شمالی دکن میں اس لشکر عظیم نے سخت زک پائی۔ چالوکیہ خاندان کے سب سے نامور فرماں روا پُل کیسن ثانی نے نربدا ندی کے کنارے یہ سیلاب روک لیا اور ہرش کو طوعاً وکرہاً وہاں سے پسپا ہونا پڑا۔ مگر گجرات اور مغربی مالوے میں اس ناکامی کی تلافی ہوگئی جہاں کے راجاؤں نے شکستیں کھا کر فاتح کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا (۶۴۲ء) دوسرے سال اس نے گنجام (یعنی شمالی کلنگ) پر حملہ کیا اور غالباً یہ آخری فوج کشی تھی جس کے بعد اس نے تلوار ہاتھ سے رکھ دی۔

آخری زمانہ اور ذاتی اوصاف

اس پیہم جنگ وجدال کا ہی ثمرہ تھا کہ ہرش نے اپنی زندگی میں نہایت وسیع سلطنت قایم کرلی جس میں راجپوتانہ و پنجاب کے سوا، نربدا ندی کے اوپر ہندوستان کے تمام زرخیز ممالک شامل تھے۔ لیکن اتنی مشقت اور جفاکشی نے اگر اس کے قوائے جسمانی کو قبل از وقت مضمحل کر دیا ہو تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اور پچپن چھپن برس کی عمر میں اس کی وفات (واقعہ ۶۴۷ء) بھی اس بات کا ثبوت ہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ اس کے آخری چند سال صرف گیان دھیان اور امن امان کے کاموں میں صرف ہوئے اور اس نے اشوک راجہ کی طرح عبادت اور مذہبی خدمت پر کمر باندھی۔ عقاید کے اعتبار سے بھی عمر کے آخری زمانے میں وہ بودھ مت کی طرف مائل ہوگیا تھا گوشت خواری اور جانور کشی کی اُس نے سختی سے ممانعت کر دی تھی اور ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دیے بغیر نہ چھوڑتا تھا۔ اس کے دیگر قوانین اور مذہبی جذبات کا حال اس باب کی آخری فصل میں آئے گا، اس جگہ ہرش کے ذاتی اوصاف کے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ وہ جس طرح رزم کا مرد میداں تھا اسی طرح بزم علم وفضل میں بھی اسے امتیاز حاصل ہے۔ صرف ونحو کی ایک کتاب اور کئی نظموں کی تصنیف اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اور ایک کتبے میں اس کی خوش خطی کا نمونہ یعنی قلمی دستخط بھی رہ گئے ہیں۔ نظموں میں سب سے بہتر "ناگانند" نامی ڈراما ہے اور اسے قدیم ہندوستان کے سب سے اچھے ناٹکوں میں شمار کرتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا یہ تصانیف واقعی ہرش کی تھیں یا کسی اور شخص نے خوش کرنے کے لیے

اس کے نام سے منسوب کر دیں جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ بایں ہمہ اس کے ذوقِ علمی کی شہادت میں اتنا یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ اہل علم کا فیاض مربّی اور مذہبی مباحث کے سننے کا نہایت شوقین تھا۔ اپنے آخری زمانے کے پایۂ تخت قنوج میں اس نے ایک بڑا جلسہ بھی اسی غرض سے کیا تھا کہ وہاں چینی فاضل ہوئین چوئنگ یا ہیون تسانگ، بودھ مت کے محاسن بیان کرے۔ لیکن اس جلسے کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم ہوئین چوئنگ، اور اس کی سیاحت ہند کا کچھ حال بیان کر دیں۔

دوسری فصل: ہوئین چوئنگ اور اس کا سفرنامہ

سنہ ۶۶۶ء میں چین کے بادشاہ کاؤتسنگ نے ساٹھ جلدوں میں ایک کتاب شایع کی تھی جس میں ہندوستان کے متعلق چینی سیاحوں کی تمام تحریروں کو جمع کیا اور چالیس نقشے لگائے تھے۔ مقدمۂ کتاب اس علم دوست بادشاہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ زمانے کی دست بُرد سے یہ کتاب تلف ہوگئی اور اسی کے ساتھ کئی سیاحوں کے سفرنامے بھی ایسے گم ہوئے کہ اب اُن کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ تاہم اس واقعے سے ظاہر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں (جب کہ چین میں بودھ مت کا طراز ورتھا) چینیوں کو ہندوستان کی سیاحت اور یہاں کے حالات معلوم کرنے سے نہایت دلچسپی تھی۔ اُن کے زائرین میں سے کم از کم چھ ایسے ہیں جن کے پورے یا ادھورے سفرنامے اب تک محفوظ رہے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور ہوئین چوئنگ ہوا ہے جس کے سفرنامے سے راجہ ہرش کے زمانے کے بہت سے حالات ہمیں معلوم ہوئے۔

ولادت اور تعلیم

وہ غالباً سنہ ۶۰۰ء کے قریب چین خاص کے وسطی صوبے ہونان میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی کے پاس پائی جو بودھ مت کی کسی خانقاہ میں درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ سن بلوغ کو پہنچ کر ہوئین چوئنگ نے بھی

یہی طرز زندگی اختیار کر لیا اور بہت دن تک تعلیم کے لیے چین کی خانقاہوں میں پھرتا رہا۔ پھر وہ ہونان کے شمالی صوبے (شنسی) کی ایک بڑی خانقاہ میں کچھ عرصے تک مقیم رہا اور یہاں علم و فضل کی یہ دولت اتنی شہرت پائی کہ اب تک اپنے ہم وطنوں میں "مرشد" یا اُستادِ شریعت کے لقب سے مشہور ہے۔ لیکن وہ اپنے مذہبی علم کو ہندوستان کا سفر کیے بغیر ناقص جانتا تھا اور اسے بودھ مت کا مولد دیکھنے کا بہت ارمان تھا۔ حکومت کی طرف سے اُن دنوں چین کے باہر جانے کی رعایا کو ممانعت کردی گئی تھی۔ راستے کی دشواریوں سے بھی وہ بے خبر نہ تھا۔ بایں ہمہ زیارتِ ہند کا شوق تمام موانع پر غالب آیا اور ۶۲۹ء میں وہ تن تنہا ہندوستان روانہ ہوگیا۔

سیاحت ہند

ہوئین چوئنگ نے اپنے سفر کے حالات اس خوبی سے لکھے ہیں کہ یہ سفرنامہ چینی زبان کے علم ادب میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ نہ صرف تاریخی معلومات بلکہ ادبی خوبیوں کے لحاظ سے بھی بہت قابل قدر مانا جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے فاضل سیّاح نے اپنے مشاہدات کے ساتھ محض سنی سنائی یا معمولی روائتیں جمع نہیں کردی ہیں بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ کافی تحقیقات اور غائر نظر ڈال کے لکھا ہے، ہندوستان میں وہ ترکستان و کابل کے راستے ۶۳۰ء میں پرش پور (پشاور) پہنچ گیا تھا مگر وادیِ سندھ و کشمیر کی خانقاہوں میں تعلیم و زیارات نے دو برس لیے اور وہ ۶۳۳ء سے قبل ہندوستان خاص کے علاقے میں نہ پہنچ سکا یہاں اس نے سب سے پہلے متھرا اور تھانیسر کی سیر کی۔ پھر گنگا کے کنارے کنارے قنوج تک آیا جو اُن دنوں شمالی ہندوستان کا نہایت بارونق صدر مقام تھا۔ قنوج سے چل کر اُس نے بودھ مت کے مشہور مقامات کا اس طرح دورہ لگایا کہ اجُدھیا، پریاگ، کوسمبی، اور شمال میں سراوستی، کپل وستو، غرض کوئی ایسا شہر اس کی سیاحت سے نہ بچا جس میں گوتم بودھ کی کوئی یادگار موجود تھی۔ اور آخر میں گیا اور پٹنے ہوتا ہوا شہر نالندا پہنچ گیا جہاں اس زمانے میں بودھ مت کی بہت بڑی درس گاہ تھی۔ اس درس گاہ میں دو سال تک زبان سنسکرت اور اپنے مذہب کے دقیق مسائل کی

تعلیم حاصل کی پھر شمال میں آسام (کامروپ) اور جنوب میں ساحل کلنگ کے مشہور مقامات کی سیاحت کی پھر سنہ ۶۴۰ء کے قریب مہاراشٹر، کرناٹک، مالوے میں گھومتا ہوا غالباً دوبارہ بہار کے علاقے میں آیا اور یہاں اس کی ہرش راجہ سے ملاقات ہوئی جس کا حال آگے آتا ہے۔ اس کے بعد گجرات اور سندھ کے راستے وہ غزنی پہنچ گیا اور سنہ ۶۴۴ء میں اپنے وطن کو اسی راہ سے مراجعت کی جس سے ہندوستان آیا تھا۔

واپسی اور وفات

لیکن اب وہ تنہا یا گمنامی کی حالت میں نہ تھا بلکہ بہت سے شاگرد، کتابوں کا ذخیرہ، قیمتی تصاویر اور نادر تبرکات اس کے ساتھ تھے اور چین کے جس شہر میں پہنچتا تھا بڑی دھوم سے اس کا استقبال ہوتا تھا۔ خود بادشاہ نے اس کی بڑی عزت اور مدارات کی اور یہ بھی چاہا کہ خرقۂ درویشی اتار کر اب وہ خلعتِ امارت پہن لے اور سلطنت کی خدمت کرے۔ لیکن ہوئین چوسنگ نے یہ درخواست قبول نہیں کی بلکہ اپنی پہلی خانقاہ (واقعہ صوبہ شنسی) میں چلا آیا۔ البتہ بادشاہ کے کہنے سے اس نے اپنے سفر کے حالات قلم بند کر دیے اور یہ دلچسپ کتاب سنہ ۶۴۸ء میں تکمیل کو پہنچی۔ ہندوستان سے جو سنسکرت کتابیں ساتھ لایا تھا ان میں سے کئی کا چینی میں اس نے ترجمہ بھی کیا اور باقی تمام وقت اسی قسم کے علمی اور مذہبی مشاغل میں گزار کر سنہ ۶۶۴ء میں وفات پائی۔

راجہ ہرش سے ملاقات

ہندوستان میں اس کی ملاقات راجہ ہرش سے بھی ہوئی تھی اور سچ یہ ہے کہ اسی کی بدولت ہمیں اس زمانے کے بہت کچھ حالات معلوم ہو سکے ورنہ عہد ہرش کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ راجہ اُن دنوں اپنے جنگی مشاغل سے قریب قریب دست کش ہو گیا تھا اور ہوئین چوسنگ کی ملاقات کے بعد شاید ایک ہی لڑائی اور لڑا، کیونکہ یہ ملاقات سنہ ۶۴۳ء کے آغاز میں ہوئی تھی۔ غالباً وہ ان دنوں اپنے مشرقی صوبوں کا دورہ کر رہا تھا اور اسی سفر میں ہوئین چوسنگ کو باریابی کی عزت حاصل ہوئی۔ پھر جب اس کی عالمانہ تقریریں سنیں تو راجہ اس پردیسی سیاح کا گرویدہ ہو گیا اور اس نے کئی مرتبہ علمائے ہند کے ساتھ اس کے مناظرے کرائے۔ معلوم ہوتا ہے، ان مناظروں میں راجہ علانیہ اپنے

باب ۱۱

چینی مہمان کی طرفداری کرتا تھا اور اس کی انھی عنایتوں نے ہوئین چوئنگ کو اتنا محسود بنا دیا کہ بعض غیر مذہب والے اس کی جان لینے کے درپے ہوگئے۔ یہ سن کر راجہ نے یہ عتاب آمیز اعلان شایع کیا کہ اگر "استاد" کو کسی نے ضرر پہنچایا تو قتل کی سزا پائے گا اور اس کی شان میں کوئی بُرا لفظ بھی زبان سے نکالا تو زبان کٹوا دی جائے گی!

پھر ہرش نے اس غرض سے کہ اس چینی فاضل کی لاجواب تقریر سے اور لوگ بھی مستفید ہوں قنوج میں ایک بڑی مجلس منعقد کی جس میں کئی ہزار بودھ، برہمن اور چینی علماء مدعو تھے۔ چونکہ راجہ کے پنجسالہ جشن کا زمانہ قریب تھا اس لیے سب خراجگزار راجہ مہاراجہ بھی بلائے گئے اور اول قنوج میں ان کا مجمع ہوا۔ یہاں کوئی پچاس ہاتھ اُونچے مینار پر گوتم بودھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی۔ اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ والیِ کامروپ نے مگس رانی کی خدمت انجام دی۔ باقی راجہ مہاراجہ ہاتھیوں پر سوار جلو میں چل رہے تھے۔ چلتے میں راجہ ہرش دنیا کے تین انمول "جواہرات" (یعنی گوتم، اس کی شریعت اور اس کی ملت) کے نام پر موتی اور سونے کے پھول نچھاور کرتا جاتا تھا۔ ادر بودھ مت کا یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ اس شان وشوکت کو دیکھ کر برہمنوں کے دل میں نفرت وحسد کی آگ بھڑکنے لگی۔

جہاں گوتم کی بڑی مورت کے واسطے مینار بنایا گیا تھا وہیں صرفِ کثیر سے ایک ہنگامی خانقاہ بھی تیار کرا لی تھی۔ یہ جلسۂ عظیم ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ برہمنوں کی سازش سے اس خانقاہ میں آگ لگی اور بہ مشکل بجھائی جا سکی۔ پھر خود ہرش پر ایک شخص نے قاتلانہ حملہ کیا مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا اور گرفتار کر لیا گیا۔ اُس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا اور پانچ سو بڑے بڑے برہمن جو اس سازش میں شریک تھے حراست میں لے لیے گئے۔ ان میں سے بعض کو موت کی سزا ملی اور باقی جلاوطن کر دیے گئے۔

ہوئین چوئنگ رخصت

ان واقعات سے یہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس عظیم الشان جلسے کا

باب۱۱

خاتمہ بے لطفی کے ساتھ ہوا ہوگا۔ یوں بھی ہمارے چینی سیاح کو وطن چھوڑے تیرہ برس ہو گئے تھے اور اب وہ جلد سے جلد رخصت ہونا چاہتا تھا مگر اپنے قدرداں میزبان کی خاطر اسے چند روز اور ٹھیرنا پڑا کہ اُس پنج سالہ جشن میں شرکت کر سکے جو گنگا جمنا کے سنگم پر منعقد ہونے والا تھا۔ اس جشن میں ہرش نے ہر مذہب کے علما اور فقرا کو دل کھول کر دان دیا اور کئی ہفتہ تک یہ لوگ بادشاہ کے مہمان رہے آخر میں ایک مہینے تک ہر مذہب و ملت کے مساکین و یتامیٰ کو خیرات تقسیم ہوتی رہی حتیٰ کہ ہرش کا تمام خزانہ خالی ہوگیا، اُس نے اپنے زیورات و ملبوسات بھی محتاجوں کو دے دیے اور آخر میں اپنی بہن سے کپڑا مانگ کر پہنا اور "دیوتاؤں کے حضور میں سجدۂ شکر ادا کیا کہ جو کچھ میرے پاس تھا آج کے دن دین کی خدمت میں خرچ ہوگیا"۔

ان تمام مراسم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ہوئین چوئنگ کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ وہ اور اس کا حلیف راجہ کامروپ "اُستاد" کو بہت سے تحائف دینا چاہتے تھے مگر ہوئین چوئنگ نے زادِ راہ کے سوا کوئی چیز قبول نہ کی اور اپنا بڑا خزانہ یعنی تبرکات کے صندوق اور سنسکرت کتابوں کے ۶۵۷ قلمی نسخے لے کر وطن روانہ ہوگیا۔

تیسری فصل:- اس عہد کے عام حالات

ذاتی سوانح سے قطع نظر، ہوئین چوئنگ کا سفرنامہ ("فو کو ی کی") اس عہد کے نظم و نسق اور مذہب و تمدن کی اگرچہ مختصر مگر نہایت معتبر تاریخ ہے چونکہ ہرش کے بعد شمالی ہند میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ ہوگیا اور مسلمانوں کے آنے تک کوئی ایسی بڑی سلطنت قایم نہیں ہوئی جس کے مفصل یا دلچسپ حالات موجود ہوں لہٰذا ہندی تمدن کی اس آخری تصویر پر ایک نظر کرنا نہایت ضروری ہے اگرچہ اس کے خط و خال اتنے واضح نہ ہوں جتنے اس زمانے کے نقاد چاہتے ہیں۔

ملکی نظم و نسق

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے پرانے طریقوں میں کوئی

فرق نہ آیا تھا اور یہ امر محض قدامت پرستی کی دلیل نہیں بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ حکومت کے جو سیدھے سادے اصول موریا خاندان کے زمانے سے بندھ گئے تھے وہ ہزار برس بعد بھی راعی و رعایا دونوں کی ضروریات کے لیے مناسب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک کے تمدن ہی میں عرصۂ دراز تک کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اپنے گاؤں میں ہر شخص ذاتی محنت اور گاؤں والوں کی تھوڑی سی مدد سے معاش کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ اس کی دیہاتی ضروریات کے لیے زمین کی پیداوار اور دیہاتی دستکاری کی مصنوعات کافی ہو جاتی ہیں۔ اس کی دنیا بہت محدود ہے اور وہ اسی میں قناعت و استغنا کے ساتھ اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ گاؤں سے باہر جانے کی یا اپنی برادری کے سوا دوسرے لوگوں سے میل جول کی اسے بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے وضع قوانین کی مجلسوں اور نت نئے ضابطوں کی بھی حاجت نہیں۔

مختصر یہ کہ جہاں لوگوں کا تمدن نہ بدلے وہاں نظم و نسق کے پرانے آئین بدلنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ جہاں حکومت کی باگ مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھ میں ہو، وہاں بادشاہ کی ذاتی قابلیت یا نااہلی کا ملکی نظم و نسق پر بڑا اثر ہوگا۔ اور جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ہرش نہایت مستعد فرماں روا تھا اور اپنے دور دست صوبوں میں اکثر دورے کرتا رہتا تھا تو ہیوئین چوانگ نے ہندوستان کے نظم و نسق کی جو تعریفیں کی ہیں، اُن کے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ فاہیان چینی کے زمانۂ سیاحت میں راستے جس قدر محفوظ تھے، اب وہ بات نہ رہی تھی اور ہیوئین چوانگ کو کئی جگہ رہزنوں نے لوٹا۔ لیکن اس کی بڑی وجہ تو یہ ہوگی کہ ہرش سے پہلے مُلک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختار تھیں اور آپس میں جنگ و جدال کے باعث ضرور ہے کہ سخت بدنظمی اور بدامنی پھیلی ہوئی ہو۔ مگر دوسرا سبب آبادی کی کثرت اور وسائل معاش کی قلت کو قرار دے سکتے ہیں کیونکہ ہرش کی فوج میں لاکھوں آدمیوں کے بھرتی ہو جانے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید زراعت میں کمی اور اجناس میں گرانی ہو گئی ہو اور ادھر نو مفتوح ملکوں میں جو سپاہی اب

باب

بیکار ہو گئے تھے، انھوں نے رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا ہو۔ بایں ہمہ دیگر سنگین جرائم کی کمی تھی اور بعض اوقات چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ تحقیقاتِ جرائم کا یہ پرانا طریقہ ابھی تک رایج تھا کہ ملزم کو آگ میں ڈال دیتے یا زہر کھلا دیتے اور اگر اس پر کوئی اثر نہ ہو تو گویا اس کی بے گناہی ثابت ہو جاتی تھی۔

مداخلِ شاہی کا جزوِ اعظم مالگذاری کا روپیہ تھا اور اصولاً زمیندار یا کاشتکار سے پیداوار کا چھٹا حصہ سرکار وصول کر لیتی تھی۔ دیگر محصولات بہت کم تھے اور عمّالِ شاہی کو لوگوں کے تنگ کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا تھا۔ ان عمّال کو تنخواہوں کی بجائے سرکار کی طرف سے جاگیریں عطا ہو جاتی تھیں اور ہیوئین چونگ نے لکھا ہے کہ وقائع نویسوں کا بھی ایک محکمہ قایم تھا۔ یعنی ہر صوبے میں چند عہدہ دار اس کام پر مامور ہوتے تھے کہ "آفاتِ ارضی و سماوی اور واقعاتِ نیک و بد" اپنی کتاب میں درج کرتے رہیں۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی کتاب کا کوئی نمونہ محفوظ نہیں ورنہ اہلِ تاریخ کے لیے اُس عہد کی بہترین یادگار ہوتا۔

علوم و فنون

راجہ ہرش اور اسی کی طرح دوسرے رئیس و راجہ اہلِ علم کے بڑے قدر داں تھے اور علماء کی ہر جگہ عزت کی جاتی تھی، اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ برہمنوں میں اور بودھ مت کے فقراء میں تعلیم اور علم کا شوق عام تھا۔ بایں ہمہ اس عہد کی شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہو گی جسے سنسکرت کے علم ادب میں نمایاں جگہ دی جائے۔ ریاضی و ہیئت میں بھی جس کا ہندوؤں کو قدیم سے بہت شوق رہا، اس زمانے کی کوئی علمی یادگار نہیں اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو علوم کی حالت زوال پذیر نظر آتی ہے۔

فنون میں سوائے بُت تراشی کے کسی فن کی ترقی کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس زمانے کی تصاویر تو اب محفوظ نہیں کہ فنِ نقاشی کی ترقی یا تنزل کا صحیح اندازہ کیا جا سکے لیکن جو سکّے موجود ہیں اُن سے پایا جاتا ہے کہ کم سے کم یہ صنعت (ضربِ سکّہ) رُو بہ زوال تھی حتیٰ کہ "قرونِ وسطیٰ کا ایک سکّہ بھی خوبیِ صنعت کی بنا پر قابلِ ذکر نہیں"[1] البتہ

---

[1] وانسمتھ، صفحہ ۳۵۸۔

ایک بُت تراشی ایسی صنعت ہے جس کو اس زمانے میں بہت فروغ حاصل ہوا، اور چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں جس کثرت سے بُت بنے شاید پہلے کبھی نہ بنے تھے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ یہی زمانہ "بت پرستی" کے بڑے عروج کا زمانہ تھا۔ راجہ سے پرجا تک ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ مورتی پوجا کے گرویدہ تھے حتیٰ کہ بودھ مت اور جین مت کے پیشواؤں کو بھی اس طریقے کے اختیار کیے بغیر چارہ نہ رہا تھا اور عہدِ ہرش میں یہ صنم پرستی جس زور وشور اور شان کے ساتھ ہوتی تھی اس کی ایک مثال پچھلی فصل میں ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔

مذہب اور اختلافات

اس طرح ہر فرقے میں بُت پرستی پھیل جانے سے خیال ہوتا ہے کہ ان دنوں ہند کے مختلف مذاہب میں کم سے کم اتحاد کا ایک قوی عنصر پیدا ہو گیا ہوگا اور ان میں ایسا مذہبی اختلاف نہ ہوگا جو شدید عداوتِ باہمی کی صورت اختیار کرلے۔ کیونکہ بُت پرستی کا مشرب یقیناً نہایت وسیع ہوتا ہے اور ہوئین چوٹنگ نے ہرش کے خاندان یا دربار والوں کے مذہب کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں کوئی تو شِو کا پرستار تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا۔ بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے بعض وشنو کی۔ غرض ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لیے مخصوص کرلے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے، کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ لیکن اس رواداری کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جو اب پرانوںؔ کو اپنی کتبِ مقدسہ ماننے لگے تھے بودھ مت والوں سے شدید نفرت تھی اور اس کا کبھی کبھی اظہار کُشت وخون کی صورت میں ہوتا تھا۔ ہرش کے بڑے بھائی کو بنگالے کے جس راجہ نے دغا سے مارا اسی کی نسبت مشہور ہے کہ بودھ مت کا بڑا دشمن تھا اور اُن کی خانقاہیں منہدم کرا کے بھکشوؤں کو طرح طرح کے آزار پہنچاتا تھا۔ اس نے گیا میں اُس بڑ کے درخت کو بھی کھُدوا کے آگ میں جلا دیا تھا جس کے نیچے گوتم کو عرفان حاصل ہوا اور جو بودھ مت والوں کی سب سے

لہ۔ دیکھو ضمیمۂ باب ہذا۔۱۲

مقدس زیارت گاہ بن گیا تھا۔ بارے کچھ عرصے بعد ایک اور مگدھ کے راجہ نے از سر نو
اسے نصب کیا اور کہتے ہیں کہ وہی اشوک راجہ کی نسل میں مگدھ کا سب سے آخری
فرماں روا گزرا ہے۔

خود راجہ ہرش آخر میں بودھ مت کا سرگرم پیرو اور اس لیے برہمنوں کا
محسود بن گیا تھا۔ مگر اس نے اول اول جو مذہبی خدمات انجام دیں وہ عام تھیں
اور ان میں کسی خاص فرقے کا لحاظ نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ قصبات و دیہات میں
بہت سے دھرم سالے بنائے تھے جن میں ہر مذہب و ملت کا مسافر قیام کرسکتا تھا۔
سرکاری خرچ سے اس کی مہمانی اور بیمار ہو تو باقاعدہ علاج کیا جاتا تھا۔ اسی طرح
بادشاہ کی طرف سے متعدد مندر تعمیر کرا دیے گئے تھے جن میں سے بعض بودھ مت
والوں کے لیے تھے اور بعض میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔
گنگا جمنا کے سنگم پر پانچویں سال ایک عام جشن شاہی ہوتا تھا اور اس میں بھی
بلا تخصیص، ہر مذہب کے مساکین و فقرا کو دریا دلی سے خیرات تقسیم کی جاتی تھی۔
البتہ اپنے آخری عہد میں یہ بادشاہ علانیہ بودھ مت کا طرفدار ہو گیا تھا اور
خزانۂ شاہی کا بہت سا روپیہ اسی مذہب کی خانقاہیں اور "ستوپے" یعنی گنبد
بنانے میں صرف ہونے لگا تھا چنانچہ ایسی کئی ہزار عمارتوں کی تعمیر اسی سے منسوب ہے۔
اور ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ "گو ہوئین چوئنگ کی سیاحت اور ہرش کے زمانے میں
بودھ مت نمایاں طور پر رُو بہ زوال تھا بایں ہمہ اس کے بھکشو ابھی تک
تعداد کثیر میں موجود تھے۔ چنانچہ ہمارے سیاح نے ان خانقاہوں میں رہنے والے
درویشوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب بتائی ہے اور ظاہر ہے کہ اس تعداد کثیر کی
پرورش میں شاہانہ فیاضی اور دریا دلی دکھانے کا میدان بھی بہت وسیع تھا۔
ارلی ہسٹری (صفحہ ۳۴۵)۔

ضمیمہ باب ۱۱

ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابیں

پُرانوں کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ سنسکرت زبان کے مشہور ماہر جوکلیس اگلنگ (پروفسر اڈن برو یونیورسٹی) کی مستند تحریر پر اکتفا کی جائے جنھوں نے "سنسکرت" پر انسائی کلوپیڈیا (طبع جدید) میں نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے۔ (جلد ۲۴ صفحہ ۱۵۶ تا ۱۸۲)۔

پروفیسر موصوف ولسن کی کتاب "مذہب ہنود" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "پران کائنات کی فلسفیانہ مگر افسانہ آمیز تاریخیں ہیں اور ان کو برہمنوں کے مختلف اور خاص خاص مقامی عقائد کی تائید میں جمع کیا گیا ہے۔ بعض اوقات انھیں "پانچویں وید" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور درحقیقت ان کو ہندوستان کے برہمنوں کی کتب مقدسہ سمجھنا ایک حد تک بالکل صحیح ہوگا۔ یہ لفظ (پرانٹر) جس کے معنی پُرانے کے ہیں اول اول ایسے ماقبلِ تاریخ افسانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن میں خاصکر موجودات کے خلق ہونے کا بیان ہو۔ لیکن بعد میں ہر قسم کی پُرانی روایات کے مجموعے پر اس کا اطلاق کرنے لگے۔ ایسے مجموعوں میں جو اس وقت موجود ہیں، اگرچہ برہمنوں کے اصولی عقیدے "تری مورتی" یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی تین صورتیں (پیدا کرنے والا، برہما۔ پالنے والا، وشنو۔ فنا کرنے والا شو) تسلیم

کی گئی ہیں، لیکن در اصل تاریخی دلائل سے، خاص خاص فرقے یا مقام کے کسی دیوی دیوتا کی عظمت دل نشیں کرنا، ان کا مقصود ہے۔ اور اس غرض کو پورا کرنے کے لیے تالیف کرنے والوں نے ہر قسم کا تاریخی اور فلسفیانہ مسالا جمع کر دیا ہے جس کی بدولت یہ کتابیں عام معلومات کا نہایت عمدہ ذخیرہ بن گئی ہیں۔ مختلف شواہد سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ موجودہ پران قدیم نسخوں سے یا تو صرف ماخوذ ہیں یا بعد کے الحاقات سے اصلی کتابوں کو بہت بڑھا لیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ پرانوں میں سے کوئی بھی ایک ہزار سال سے زیادہ زمانے کا نہیں ہے گو ان کے بعض حصے نہایت قدیم بلکہ عجب نہیں کہ ولادت مسیح علیہ السلام سے بھی کئی صدی قبل کے ہوں۔

قصص و روایات کا جہاں تک تعلق ہے پرانوں کا مضمون سنسکرت کی رزمیہ نظموں خاصکر "مہابھارت" سے ملتا جلتا ہے۔ اور بظاہر احوال پرانوں اور ان نظموں کے اصلی مولفین اور بعد کے ناقلین دونوں گروہوں نے انھی کثیر روایتوں کی بنیاد پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں جو عام طور پر زبان زد اور کم و بیش ہوتی رہتی تھیں۔ دوسرے قریب قریب تمام پران انھی بحروں میں بیانیہ مثنوی کے طرز پر لکھے گئے ہیں، اگرچہ مجموعی طور پر شاعری کے لحاظ سے وہ ان رزمیہ نظموں سے بہت کم رتبہ ہیں"۔

روایت عام کی رو سے اٹھارہ مہاپران ہیں اور اٹھارہ اُپ پران (اُپ بمعنی ماتحت یا خرد) اور مہاپرانوں کے تین مجموعے کردیے ہیں۔ پہلے مجموعے کے چھ[۱] مہاپرانوں میں وشنو کے اور چھ[۲] کے دوسرے مجموعے میں شو جی کے بھجن ہیں۔ مگر تیسرے مجموعے میں برہما کی بجائے کرشن، گنیش، سورج یا وغیرہ اوتاروں کے قصے لکھے ہیں اور پروفیسر بنرجی کا خیال ہے کہ اس مجموعے میں زیادہ تر الحاقی کلام ہے۔ بہرحال ان سب مہاپرانوں میں کل چار لاکھ شعر ہیں اور اُپ پران یا استھل پران، جن میں دیوی دیوتاؤں کے استھانوں کی تاریخ بیان کی ہے، ان کے علاوہ ہیں گو یہ اتنے وسیع نہیں۔

---

[۱] ان پہلے چھ کے نام یہ ہیں:- وشنو[۱]، نارد[۲]، بھگوت[۳]، گارود[۴]، پدما[۵]، وراہا[۶]۔ مگر نہ صرف اس مجموعے میں بلکہ تمام پرانوں میں سب سے زیادہ مقبول بھگوت پران کو مانا جاتا ہے اور اسی کا عام عقائد پر بہت اثر پڑا ہے۔

[۲] ان چھ کے نام یہ ہیں:- متسی، کورما، سکندرا، لنگ، شو، اگنی۔

باب ۱۲

پہلی فصل: آزاد سرحدی ریاستیں

ہرش کی وفات کے بعد ہندوستان خاص میں جو آزاد ریاستیں قائم ہوئی تھیں ان کا اور بعض راجپوت قبائل کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم اُن ریاستوں کا کچھ حال تحریر کر دیں جو عہد ہرش سے پیشتر ہی خود مختار ہو گئی تھیں۔ پنجاب کی دو ایک چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر، سندھ و کشمیر، نیپال و کامروپ (یا آسام)، وہ علاقے ہیں جنھیں صحیح معنی میں اب تک ہندوستانی کہنا دشوار ہے۔ قدیم زمانے میں جب کہ آمد رفت کے جدید وسائل نہ تھے، ان بعید علاقوں کا ہندوستان خاص کی سلطنت سے علٰحدہ ہو جانا کچھ بھی تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ سلطنت مغلیہ کے استقلال سے پہلے ان میں صدیوں سے خود مختار حکومتیں قائم تھیں، سوائے سندھ کے جسے محمود غزنوی اور پھر شاہان دہلی نے کئی بار فتح کیا۔ بایں ہمہ اس پر بھی اکبر کے زمانے سے قبل ہندوستان کے بادشاہوں کو کامل تسلط حاصل نہ ہو سکا تھا۔

غرض ہوئین چوئنگ جب ہندوستان آیا تو سندھ میں ایک قوی اور خود مختار سلطنت قائم تھی۔ صوبۂ بلوچستان اس کا مقبوضہ تھا اور دریائے سندھ کی تمام وادیِ زیریں اُس میں داخل تھی۔ پنجاب اور ملکِ سندھ کے درمیان ان دنوں سندھ

ہکراندی حد فاصل تھی جو اب سوکھ گئی ہے مگر ساتویں صدی عیسوی تک سندھ کا صدر مقام اَروڑ یا اَلوَر اسی کے بائیں کنارے پر موجودہ شہر خیرپور سے چند میل شمال میں واقع تھا۔ اس آزاد سلطنت کے متعلق سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں شودر ذات کے راجہ حکومت کرتے تھے اور اُن کا مذہب بودھ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کا یہاں زور تھا اور ہیوئین چونگ آیا ہے تو بودھ مت کے تقریباً دس ہزار علما یا درویش سندھ میں رہتے تھے۔ لیکن ہمارے چینی سیاح نے اُن کے اخلاق و اطوار کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مذہبی پیشوا عام طور پر نکمّے اور عیش دوست ہیں۔

راجہ ہرش کا ہم عصر سندھ میں سہراس رائے تھا اور مسلمانوں نے اس مُلک پر سب سے اول اسی زمانے میں حملہ کیا۔ یہ نوخیز قوم جنوبی ایران کو فتح کرکے ادھر بڑھی تھی۔ سہراس رائے نے روکنا چاہا مگر لڑائی میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ پھر اس کے بیٹے ساہسی نے عرب فاتحین کے مقابلے کی تیاریاں کیں اور دو سال بعد اپنے باپ کی مثل شکست کھا کے میدان میں کام آیا۔ مکران پر جو بلوچستان کا جنوب مغربی صوبہ ہے مسلمانوں کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری ایّامِ خلافت یعنی ۶۴۴ء ہی میں مستقل قبضہ ہوگیا تھا لیکن سندھ خاص کی فتح عرصے کے بعد ہوئی جب کہ شودر خاندان کی بجائے وہاں برہمنوں کا ایک خاندان برسرِ حکومت تھا۔ اس خاندان کا مورث (چچ) اصل میں راجہ ساہسی کا وزیر تھا۔ جب وہ راجہ مارا گیا تو خود بادشاہ بن بیٹھا اور چالیس برس تک حکومت کی۔ اسی کا بیٹا راجہ داہر تھا جس کے عہد میں سندھ کو عربوں نے فتح کرلیا۔ (۷۱۲ء)

کشمیر

پروفیسر وِلسن کا قول ہے کہ سنسکرت زبان کی جس قدر کتابیں اب تک دستیاب ہوئی ہیں، ان میں صرف راج ترنگنی ایسی کتاب ہے جس کو تاریخ کہنا ایک حد تک جائز ہوگا۔[1] ہم

---

[1] انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۵ صفحہ ۶۸۸ و ۶۸۹۔

اپنی کتاب کے شروع میں اس کا حوالہ دے آئے ہیں کہ یہ کتاب شاہان کشمیر کے حالات میں لکھی گئی تھی۔ اس کا پہلا حصہ بارھویں صدی کے وسط میں کلہن نامی مصنف نے تحریر کیا پھر کشمیر کے اسلامی بادشاہوں کے عہد میں اس کی تکمیل (۱۴۸۶ء) میں ہوئی اور جب یہ ملک فتح ہوکر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تو اکبر بادشاہ کے حکم سے راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا گیا اور اسی کا خلاصہ ابوالفضل نے اپنی کتاب "آئین اکبری" میں درج کیا ہے۔

لیکن اس کتاب میں بھی ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے صحیح حالات نہیں ملتے جس پر اعتبار کیا جاسکے حالانکہ کشان خاندان میں زوال آنے کے بعد تیسری صدی عیسوی سے یہ ریاست غالباً خود مختار ہوگئی تھی۔ ہوئین چونگ جب یہاں آیا ہے تو اس میں کابل و گندھارا یعنی شمال مغربی پنجاب کا پہاڑی ملک بھی شامل تھا اور بودھ مت کی بہت سی خانقاہیں تھیں[1]۔ چنانچہ وہ دو سال تک اس ملک میں سیاحت کرتا رہا (۶۳۱ء تا ۶۳۳ء) بادشاہِ وقت نے ہوئین چونگ کا جو اعزاز و اکرام کیا اس کا وہ معترف ہے لیکن اپنے سفرنامے میں اس کے نام کا کہیں ذکر نہیں کرتا۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب کا خیال ہے کہ غالباً وہ "کرکوٹ" خاندان کا پہلا راجہ دُرلبھ وردھن (Durlabhavardhana) ہوگا جو ہرش کا ہمعصر گزرا ہے اور مدت دراز تک حکومت کرتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے اس راجہ کے تیسرے جانشین کے زمانے میں ریاست کشمیر سلطنت چین کی باجگزار ہوگئی تھی چنانچہ آٹھویں صدی کے کشمیری راجہ بادشاہ چین سے خلعت حکومت پاتے تھے۔ انھی راجاؤں میں للتادِت (Lalitaditya) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے ۷۴۰ء کے قریب قنوج کے راجہ کو شکست دی اور وادیِ سندھ کی کئی شمالی قوموں کو مغلوب کیا۔ للتادت کی ایک یادگار "مارتانڈ" (یعنی سورج دیوتا) کا مندر شہر اسلام آباد سے تین میل کے فاصلے پر اب تک سلامت ہے اور کشمیر کے فن تعمیر کی امتیازی خصوصیات دکھاتا ہے۔ واضح رہے کہ اسلام آباد جس کا قدیم نام

[1] انسائی کلوپیڈیا جلد ۱۵ صفحہ ۶۸۸ و ۶۸۹۔

باب ۱۳

انت ناگ ہے کشمیر کی آزاد ریاست کا پائے تخت تھا۔

شاہان کشمیر کے مظالم

اس راجہ کے پوتے **ونیادت** کی فتوحات کے بہت سے قصے راج ترنگنی میں نقل کیے ہیں۔ مگر ان میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انھی مشرقی اور ہندوستانی فتوحات نے اس راجہ کا دماغ اس قدر خراب کر دیا ہو کہ وہ اپنی رعایا پر سخت مظالم کرنے لگا جن کا راج ترنگنی کے مولف نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان مظالم کا سبب دولت کی طمع تھی اور کلہن لکھتا ہے کہ جب "بادشاہوں کو روپیے کی اور مچھلی کو گدلے پانی کی پیاس ہو جائے تو پھر وہ اپنے مرتبے اور مقام کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے اور جب تک موت کے مضبوط جال میں نہ پھنس جائیں، ان کی تشنگی کسی طرح نہیں کم ہوتی۔"

للتادت پر ہی منحصر نہیں، کشمیر کے راجہ بالعموم نہایت طامع، بے درد اور سخت ظالم ہوئے ہیں۔ راجہ پارتھ اپنی مفلوک الحال رعایا کو تازیانوں سے پٹواتا تھا۔ اس کا بیٹا جو "کہیں زیادہ بدذات" ہوا ہے، لوگوں کو بچھوؤں سے کٹواتا تھا۔ دسویں صدی کے آخری نصف میں دِدّا نامی رانی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ اس نے ملک کے نظم و نسق میں اور بھی ابتری پھیلا دی۔ دِدّا کے بھتیجے راجہ **سنگ رام** کے زمانے میں (۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۸ء) سلطان محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی لیکن اس شکست کے باوجود کشمیر کی آزادی میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہاں کے راجہ آخر تک اپنی رعایا پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے۔ بقول ونسنٹ اسمتھ "دنیا میں بہت کم ملک کشمیر کے ان راجہ رانیوں کی طویل فہرست کی برابری کر سکتے ہیں جن کا طرۂ امتیاز شرمناک طمع، وحشیانہ سفاکی اور بے دردانہ بدنظمی کے سوا کچھ نہ تھا۔"[1] (ارلی ہسٹری صفحۂ ۳۷۵)۔

نیپال

قدیم زمانے میں "نیپال" کا لفظ بہت چھوٹے علاقے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

---

[1] تیرھویں صدی کے اخیر میں کشمیری مسلمانوں کا ایک خاندان برسر حکومت ہو گیا تھا اور مغلوں کی فتح، یعنی قریب قریب تین سو برس تک، ملک کشمیر پر یہی اسلامی بادشاہ فرماں روائی کرتے رہے۔ ۱۲

لیکن یہ ریاست جو ہمالیہ کے دامن میں دوآب کے شمال سے بنگالے کے شمال تک قریب قریب پانچ سو میل طویل ہے، بہت قدیم سے خود مختار رہی اور دشوار گزار کوہستانی زمین ہونے کے علاوہ یہاں کے باشندوں کی قومی خصوصیات بھی ہندوستانیوں سے بالکل جداگانہ ہیں۔ عہد اشوک میں غالباً نیپال کا جنوبی حصہ سلطنت مگدھ میں داخل تھا لیکن اس کے بعد پھر سمدرگپت کے زمانے تک یہاں کے تاریخی حالات کا پتا نہیں چلتا۔ کشمیر کی طرح نیپال کے وقائع بھی قلم بند کئے گئے تھے اور اس مجموعے کا نام "وم کاولی" ہے مگر اس کی تحریر چنداں اعتبار کے لائق نہیں۔ البتہ سمدرگپت کے وقت میں دوبارہ اس ریاست کا ہندوستان کے ماتحت ہونا پایا جاتا ہے۔ بایں ہمہ یہ اطاعت و خراجگزاری شاید اسی طرح برائے نام ہوگی جس طرح آج کل ہے۔ یعنی گو نیپال کے راجہ سالانہ تحائف کی صورت میں سلطنت چین کو خراج ادا کرتے ہیں، دوسری طرف انگریز سفیر بھی ان کے پائے تخت میں مقرر ہے اور بیرونی معاملات میں وہ اس کی رائے کے پابند ہیں، لیکن ان کی اندرونی خود مختاری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور انگریزوں کو پائے تخت کھٹمنڈو کے سوا اندرون ملک میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہوئین چوئنگ آیا تو ٹھکوری خاندان کے راجہ نیپال پر حکومت کرتے تھے اور ان کی علمی قابلیت کی اس نے تعریف کی ہے۔

چودھویں صدی کے آغاز سے "وم کاولی" میں کسی قدر مفصل اور قابل اعتبار واقعات ملتے ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اَجُدّھیا خاندان کا ایک راجہ سمراؤں سے بھاگ کر نیپال آیا اور بغیر دقت یہاں کا حاکم بن گیا (۱۳۲۴ء) اس کے تین جانشینوں کے بعد یہ ریاست ایک راجپوت خاندان میں منتقل ہوگئی جس میں یکے بعد دیگرے آٹھ راجہ گزرے ہیں۔ پندرھویں صدی میں آٹھویں راجہ کی اولاد نے ریاست کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا تھا مگر ایک حصے کا حاکم لاولد مر گیا اور خاندان کی باقی تین شاخوں میں اٹھارویں صدی (یعنی گورکھوں کی فتح کے زمانے تک) حکومت رہی ۱۷۶۸ء میں گورکھوں نے اس ریاست کا تمام علاقہ فتح کر لیا اور اب تک

باب ۱۲

اسی نو وارد[1] قوم کے راجہ یہاں فرماں روائی کرتے ہیں۔

کامروپ

کامروپ کی قدیم ریاست میں قریب قریب وہ تمام علاقہ داخل تھا جو آج کل آسام، ریاست کوچ بہار اور ضلع رنگ پور میں داخل ہے۔ "مہابھارت" میں یہاں کے راجہ کا ذکر آیا ہے لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کے بارے میں سب سے پہلی مستند اور کار آمد معلومات راجہ سمدرگپت کے اُس کتبے میں درج ہے جو اُس نے اشوک کی لاٹھ کے ایک پہلو پر کندہ کرایا تھا (قیاساً ۳۶۰ء) اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سلطنت گپت کے ہمسائے میں کامروپ کی ریاست خود مختار تھی گو رسمی طور پر وہاں کا راجہ سمدرگپت کا باجگزار مانا جاتا تھا۔ اس کتبے کے کئی صدی بعد دوبارہ کامروپ کا ذکر ہیوئین چوئنگ کے سفرنامے میں آتا ہے۔ یہ چینی سیاح جن دنوں نالندا کی خانقاہ میں مقیم تھا تو اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر کامروپ کے راجہ نے بہ اصرار اسے اپنے ہاں بلوایا۔ اگرچہ وہ یا اس کی رعایا میں کوئی شخص بودھ مت کا پیرو نہ تھا۔ ہیوئین چوئنگ راجہ کی خاطر سے وہاں گیا لیکن چند ہی روز بعد راجہ ہرش نے سخت تقاضے کرکے اُسے اپنے پاس بلوالیا۔ بہرحال اس چند روزہ قیام کی بدولت (۶۴۳ء) کامروپ کے کچھ حالات تاریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں بھی یہ ریاست فرماں روائے قنوج کی باجگزار یا "حلیف" کی حیثیت رکھتی تھی۔ راجہ کا نام بھاسکر ورمن تھا مگر زیادہ تر کمار کے لقب سے مشہور ہے اور اسی سے قیاس ہوتا ہے کہ ذات کا چھتری یا راجپوت ہوگا۔

بارھویں صدی میں کامروپ یا آسام پر پال خاندان کے راجہ قابض ہوگئے تھے لیکن تیرھویں صدی کے آغاز ہی میں شمالی برما اور سرحدِ چین کی

---

[1] گورکھوں کا دعویٰ ہے کہ وہ نسلاً راجپوت ہیں اور مسلمان فاتحین کے سامنے سے مجبوراً ہٹ کر کماؤں کی پہاڑیوں میں آبسے تھے۔ یہاں سے وہ رفتہ رفتہ شمال میں پھیلے اور آخر اپنے راجہ پرتھوی نرائن کے ماتحت بڑھ کر نیپال خاص پر قابض ہوگئے۔

قوم آہوم اس ملک میں گھس آئی اور اسے اپنی مستقل ریاست بنالیا۔ یہ قوم زبان و معاشرت اور مذہب و نسل کے اعتبار سے "شانی" تھی لیکن رفتہ رفتہ اس نے ہندوؤں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد اختیار کر لیے اور ۱۶۵۵ء میں ان کا راجہ چچنگ فا باضابطہ ہندو مت کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ مسلمانوں نے اس ملک پر وقتاً فوقتاً جو حملے کیے اُن کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا لیکن یہ بالعموم تادیبی مہمیں تھیں اور ان کے بھیجنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اہلِ آسام کو ان کی قزاقانہ یورشوں کی سزا دی جائے۔ بڑی آب و ہوا کثرت باراں، دشوار گزار پہاڑی مقامات ہونے کی وجہ سے مسلمان اس دور دست حصۂ ملک پر مستقل طور پر قبضہ نہ رکھ سکے نہ اس کا انھوں نے کبھی پختہ ارادہ کیا۔

دوسری فصل
شمالی ہندوستان کی ریاستیں

قنوج

کتاب کے شروع میں ہی ہم پنچال یا پنکال قوم کا حال پڑھ چکے ہیں کہ دورِ قدیم میں یہ لوگ دریائے گنگا کے شمال و جنوب دونوں جانب پھیلے ہوئے تھے۔ غالباً اسی زمانے میں ان کا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور گنگا ان کی حدِ فاصل تھی شمالی ٹکڑے کا پائے تخت رہچھتر میں تھا جو اب رام نگر کے نام سے بریلی کے ضلع میں واقع ہے۔ جنوبی حصے کا صدر مقام کامپیلی تھا اور فرخ آباد کے ضلع میں قصبۂ کمپل کو اسی قدیم راج دھانی کی یادگار بتاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا شہر ہوئین چوانگ کی سیاحت کے زمانے تک خاصا آباد تھا لیکن کامپیلی کی جگہ قنوج نے چھین لی تھی جو اس کے قریب ہی دریائے گنگا کے کنارے آباد ہوا اور فاہیان کے وقت میں چھوٹا سا شہر بن گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گپت خاندان کے زمانے میں اس شہر نے بہت ترقی کی اور ہرش کو اپنی وسیع سلطنت کے لیے اس سے بہتر صدر مقام نہ ملا۔

لہٰذا ساتویں صدی گویا اس شہر کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور اس کی سب سے معتبر شہادت ہوئین چوئنگ کا سفرنامہ ہے۔ کیونکہ جب یہ چینی سیاح یہاں آیا تو اس شہر میں صرف بودھ مت والوں کی سَو سے زیادہ خانقاہیں تھیں جن میں دس ہزار سے زیادہ درویش رہتے تھے۔ اور ہندو مت کے مندروں کا شمار ان خانقاہوں سے بھی دُگنا تھا۔

لیکن ہرشن کے لاولد فوت ہوتے ہی جب سلطنت میں بدنظمی پھیلی تو قنوج پر اس کے وزیر ارجن نے غاصبانہ قبضہ کرلیا اور اسی کے حکم سے چینی سفیر پر جو ہرش کے دربار کا معزز مہمان تھا ہندی سپاہیوں نے حملہ کیا۔ اس حملے کی کوئی خاص وجہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اسی بدسلوکی کا بدلہ لینے کی غرض سے تبّت کے راجہ نے جسے چینی شہزادی بیاہی تھی، قنوج پر فوج بھیجی اور سفیر مذکور نے ارجن کو کئی شکستیں دے کر قید کیا اور اپنے ساتھ واپس لے گیا۔ یہ ۶۴۸ء یا ۶۴۹ء کا واقعہ ہے اور اس کے بعد راجہ جسو ورمن (Yasovarman) کے عہد تک قنوّج کا کہیں نام نہیں آتا۔

بھوبھوتی اور واک پتی

راج ترنگنی کی روایات کے مطابق جسو ورمن کو کشمیر کے راجہ للتادت نے شکست دے کر معزول کر دیا تھا جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ لیکن اس راجہ کا عہد اور کسی لحاظ سے قابل ذکر ہو یا نہ ہو اس اعتبار سے ضرور یادگار رہے گا کہ بھُوبھُوتی (Bhavabhuti) جیسا نامی شاعر اسی زمانے میں ہوا اور اس کی زندگی کا بڑا حصہ دربار قنوّج ہی میں گزرا۔ بھُوبھُوتی نے تین ناٹک لکھے ہیں اور پہلے دو (یعنی "مہابیر چرِت" اور "اُتّر رام چرت") میں گویا راماین کی مثنوی کو ڈراما کا لباس پہنا دیا ہے۔ ان دونوں کے سات سات پاٹ (یا ایکٹ) ہیں۔ مگر تیسرے یعنی "مالتی مادھو" کے دس پاٹ رکھے ہیں اور اس میں روزمرہ کی خانگی زندگی کو دکھایا ہے۔ مالتی اور مادھو جن کا یہ قصہ ہے دو ہمسایہ بادشاہوں کے وزیروں کی اولاد میں تھے اور ان کی بچپن ہی میں نسبت قرار پا گئی تھی۔ لیکن مالتی کے باپ کو اس کا آقا مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے ایک منظورِ نظر مصاحب سے کر دے جو بہت بدصورت اور بوڑھا تھا۔ چنانچہ

راجہ کے اصرار نے مالتی اور مادھو کو عرصے تک فراق دائمی کی فکر میں مبتلا رکھا۔ اس قصّے کے بیان کرنے میں شاعر نے سچے جذبات کی بہت پُراثر تصویر کھینچی ہے اور جا بہ جا نہایت جوش انگیز (اگرچہ کسی قدر محال) واقعات دکھائے ہیں۔ ہندوستان کے نقادانِ فن کے نزدیک یہ شاعر نہ صرف کالیداس کا ہم پلّہ ہے بلکہ "اُتر رام چرت" میں اس پر بھی سبقت لے گیا ہے × × × تغزل میں گو اس کا مرتبہ واقعی بلند ہے تاہم ناٹک نویس شاعر کی حیثیت سے وہ کالیداس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ان دونوں کی شاعری میں نہایت نمایاں فرق یہ ہے کہ کالیداس قلبِ انسانی کے نازک حسیّات اور خموش و پُرامن دہقانی زندگی کی مصوّری کا دلدادہ ہے اور بھوبھوتی انسانی طبیعت اور فطرت کے زیادہ پُرہیبت پہلو دکھانے پر مائل ہے۔ دوسرے شستہ اور پُرلطف ہونے کے باوجود اس کا کلام کالیداس کے مقابلے میں زیادہ تصنّع آمیز اور طویل معلوم ہوتا ہے اور اس میں اُن قیود و قواعد کی بے حد پابندی کی گئی ہے جو ناٹک نویسی کے نظری ماہروں نے گھڑ لیے تھے۔ (انسائکلو جلد ۲۴ ص ۱۷۳)۔

ایسے باکمال ہم عصر کے مقابلے میں واک پتی کو اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو اس بات میں کہ وہ پراکرت کا شاعر ہے اور اس زبان میں صرف دو ہی شاعروں نے رزمیہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں واک پتی کی "گودوہا" تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں جس دھرمن کی بنگالے پر فوج کشی اور فتوحات کا بیان ہے۔

بعد کے راجہ

جس دھرمن کے بعد آٹھویں صدی کے خاتمے تک اس کے دو جانشین یکے بعد دیگرے قنوج میں تخت نشین ہوئے لیکن پہلے کو کشمیر کے راجہ نے دوبارہ شکست دے کر معزول کر دیا اور دوسرے سے بنگالے کے راجہ دھرم پال نے حکومت چھین کر ایک اور شخص چکراجدھ کے سپرد کر دی۔ یہ غالباً قنوج کے شاہی خاندان سے تھا اور اس کی بادشاہی کو سب ہمسایہ راجاؤں نے باضابطہ تسلیم کر لیا تھا لیکن اس کی تقدیر میں بھی وہی تلخ کامی لکھی تھی کہ ۸۱۶ء میں راجپوتانے کے ایک راجہ ناگ بھٹ نے اس پر حملہ کیا اور سلطنت چھین لی۔

گُرجروں کی حکومت

ناگ بھٹ دراصل گُرجروں (یا گورجروں) کی قوم کا راجہ تھا اور یہ قوم جس کے بہت سے لوگ آج بھی ہندوستان میں موجود ہیں، غالباً باہر سے یہاں آئی اور

ہونوں کی ہم نسل نہیں تھی تو کم سے کم عرصے تک ان کے ساتھ ضرور رہی - اس کا ایک گروہ "پر یہار" یا "پر تیہار" (Prathihara) کہلاتا تھا اور شاید چھٹی صدی عیسوی میں انھوں نے مل کر راجپوتانے کے وسطی علاقے میں ایک خود مختار سلطنت قائم کی تھی جس کا پائے تخت بھیل مال (یا بھین مال) کوہ آبو سے کوئی پچاس میل شمال مغرب میں واقع تھا۔ اسی سلطنت کی ایک شاخ بڑوچ میں تھی اور بعد میں "پر یہار" نامی گروہ نے بندھیل کھنڈ میں اپنی ریاست الگ بنائی جس کا صدر مقام موسہنی موجودہ چھتر پور کے قریب تھا۔

بہر حال، فتحمند راجہ کو قنوج لینے کے بعد شاید اپنے پرانے پائے تخت میں رہنا پسند نہ آیا اور اس نے گنگا کے کنارے کو راجپوتانے کے ریگستان پر ترجیح دی۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے وقت تک اسی ناگ بھٹ کی اولاد قنوج میں حکومت کرتی تھی۔ مگر ناگ بھٹ اور اس کے بیٹے رام دیو (یا رام بھدر) کے متعلق سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ غالباً ۸۲۵ء سے ۸۴۰ء تک راج کرتے رہے۔ البتہ ان کے جانشین راجہ مہیر کو جو بھوج کے لقب سے مشہور ہے، بہت عروج حاصل ہوا اور اس نے قریب قریب پچاس برس تک اقبال و کامرانی کے ساتھ بادشاہی کی۔ اس کی حدود سلطنت معلوم کرنے کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں ہے لیکن قرائن کہتے ہیں اودھ سے جنوب مشرقی پنجاب تک اور مغرب میں راجپوتانہ و گجرات اس کی قلمرو میں داخل تھے۔ گویا شمال مغربی سرحد پر دریائے ستلج تھا تو جنوب مغربی سرحد نربدا تک وسیع تھی اگرچہ مالوے کے مشرقی علاقے اور بندھیل کھنڈ میں علٰحدہ آزاد ریاستیں موجود تھیں جن کا حال آگے آتا ہے مشرق کی طرف بنگال و بہار کے راجاؤں سے بھوج کی سرحد جا ملتی تھی۔ اور شاید کچھ عرصے کے لیے مگدھ کی ریاست بھی قنوج کی باجگزار ہو گئی تھی۔ اس طرح بھوج اپنے زمانے میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کا مالک تھا۔ اور اگر وہ سب سے بڑی نہ تھی تو کم سے کم سب سے زیادہ دولت مند اور طاقتور ضرور تھی۔ چنانچہ راجہ بھوج کی دولت اب تک شمالی ہندوستان میں ضرب المثل ہے اور اس کی جنگی قوت کے متعلق ایک عرب سیاح کا بیان ہے کہ رسالے اور شتر سواروں کی جیسی عمدہ اور جنگجو فوج بھوج کے پاس ہے، ایسی

ہندوستان کے کسی راجہ مہاراجہ کے پاس نہیں۔
سکوں سے یہ بات ثابت ہے کہ بھوج وشنو دیوتا کا پرستار تھا چنانچہ ان سب پر اسی دیوتا کے اوتار "ادی وراہہ" کا نام کندہ ہے۔ صورت میں یہ سکے ساسانی روپیے کی طرز پر ڈھالے جاتے تھے اور ان کا نام "درام" ہوتا تھا جو یونانی دراکمہ، (ایرانی دارک) کی یادگار ہے اور بعد میں "دام" رہ گیا تھا۔ ہماری زبان میں "دمڑی" اور "چھدام" اسی لفظ کی ذرّیات ہیں۔
پچاس برس کے قریب فرماں روائی کرنے کے بعد بھوج نے وفات پائی (۸۹۰ء) تو اس کا بیٹا مہندر پال وارث تخت و تاج ہوا۔ اس کی تخت نشینی اور وفات (۹۰۸ء؟) کے سنہ صحت کے ساتھ معلوم نہیں اور نہ کوئی تاریخی واقعہ محفوظ ہے۔ البتہ اُسے اتنا فخر ضرور حاصل ہے کہ پراکرت زبان کے دکنی شاعر راج سکھ کا شاگرد تھا جس نے چند ناٹک اور فن شعر پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جو حال میں طبع کر دی گئی ہے۔
مہندر پال کے بعد پرتیہار یا گوجروں کے خاندان شاہی میں کوئی ایسا راجہ نہیں ہوا جو اپنی آبائی ریاست کو کم سے کم اغیار کے حملوں سے بچا لیتا۔ ۹۰۶ء میں راشٹر کوٹ خاندان کے دکنی راجہ اندر (ثالث) نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور مہندر کے پوتے مہی پال کو شکست دی۔ فاتح کا خاص پائے تخت قنوج پر قبضہ ہوگیا تھا۔ لیکن گو وہ زیادہ عرصے یہاں نہ ٹھیرا اور اس کے واپس جاتے ہی مفرور مہی پال دوبارہ قنوج میں آگیا، تاہم اس شکست نے ریاست کی مرکزی قوت کمزور کر دی اور غالباً اسی وقت سے گجرات وغیرہ کے صوبے راجگانِ قنوج کے ہاتھ سے نکلنے لگے، اور آخر میں بندھیل کھنڈ کے (چندلوں یا) چندیلوں نے انھیں حملے کرکے اور بھی کمزور کر دیا۔ بایں ہمہ پنجاب کے راجہ جے پال نے جب غزنی کی نوخیز سلطنت سے لڑائی مول لی تو اس کے حلیفوں میں قنوج کے راجہ بجے پال (Vijayapala) کی فوج بھی شریک تھی (۹۹۱ء) اس کے اٹھائیس انتیس برس بعد سلطان محمود غزنوی نے خاص قنوج پر حملہ کیا تو اس وقت بجے پال کا بیٹا بھوج کا جانشین اور یہاں کا راجہ تھا۔ مسلمان مورخوں نے

باب ۱۲

اس کا نام رآے جے پال لکھا ہے لیکن حال میں بعض کتبات سے معلوم ہوا کہ وہ دراصل "راجے پال" تھا۔ سلطان محمود کی اس راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی اور بعد میں اسی الزام پر اپنے ہمسایوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

گہرواڑوں کی حکومت

ان گورجروں (یا گوجروں) کے خاندان کا خاتمہ گہرواڑوں کے ہاتھ سے ہوا۔ تفصیلی حالات و اسباب کا ہمیں علم نہیں لیکن ۱۰۹۰ء میں ہم اس نئے خاندان کے راجہ چندر دیو کو قنوج کا فرماں روا پاتے ہیں۔ یہ خاندان جس کا اصلی نام "گہدوال" ہے غالباً چندیلوں کی برادری میں داخل تھا مگر قنوج کی ریاست ملنے کے بعد اسے بہت عروج حاصل ہوا۔ خاصکر بانیِ خاندان کے تیسرے جانشین گوبند چندر نے بڑی قوت پائی اور تقریباً پچاس برس تک حکومت کرتا رہا (قیاساً ۱۱۱۴ء تا ۱۱۶۰ء) اسی راجہ کا پوتا جے چند یا جے چندر ہوا ہے جس کی پرتھی راج سے عداوت کے قصے مشہور ہیں۔ پرتھی راج کی شکست اور مسلمانوں کے دلّی پر قابض ہونے کے بعد جے چند نے بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کی تھی اور اسے دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی حدودِ مملکت میں قدم نہ رکھنے دیگا لیکن جب دریائے جمنا کے کنارے چندراوڑ (ضلع اٹاوہ) کے میدان میں مقابلے کی نوبت آئی تو جے چند کے لشکرِ عظیم کو سخت شکست ہوئی وہ خود مارا گیا اور اس کی ریاست مسلمانوں کے قبضے میں آگئی۔ (۱۱۹۴ء) گہرواڑ خاندان کے بہت سے راجپوت سردار قنوج سے نکل کے راجپوتانے کے بیابانوں میں پناہ گزیں ہوئے اور یہاں انھوں نے جودھپور کی ریاست قائم کی جو اب تک موجود ہے۔ مگر جودھپور پہنچ کر اُن کے خاندان کا اصلی نام بدل گیا اور وہ "راٹھور" کہلانے لگے۔

بندیل کھنڈ

جمنا اور نربدا ندی کے درمیان کا وہ علاقہ جو اب بندیل کھنڈ کہلاتا ہے پہلے جھوتی (یا "ججاک بھوکتی") کے نام سے موسوم تھا اور نویں صدی عیسوی میں غالباً یہاں گوجر (یا پریہار) قوم کے سردار حکومت کرتے تھے۔ ۸۳۱ء میں نانک چندیل نے انھی کے کسی رئیس کو شکست دے کر چھترپور کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی اور بندیل کھنڈ کے چندیل راجہ اسی شخص کی اولاد میں تھے۔ قومیت کے اعتبار سے یہ راجہ گونڈ سمجھے جاتے ہیں مگر انھوں نے

برہمنوں کا مذہب اور وہی تمدن اختیار کر لیا تھا[۱]۔ اور قرینہ کہتا ہے کہ اول اول وہ راجگان قنوج کے باجگزار ہوں گے۔ لیکن دسویں صدی کے آغاز میں جب اُن کا قلعۂ کالنجر پر قبضہ ہوا (۹۱۶ء) تو پھر اُن کی قوت بڑھ گئی اور خود قنوج پر دست تصرف دراز کرنے لگے۔ اب ان کی حدود ریاست جمنا کے کنارے تک وسیع ہو گئی تھیں اور اس میں تین بڑے شہر تھے، مہوبا، کھجوراہو، اور کالنجر جہاں اس خاندان کے راجاؤں نے بہت سی عمارتیں اور تالاب بنوائے تھے۔ خاصکر کھجوراہو کے عظیم الشان مندر، بنانے والے کی دولت اور شوقِ تعمیر کی سب سے اچھی یادگار ہیں اور ان کی تعمیر دھنگ راجہ سے منسوب کی جاتی ہے جو چندیل خاندان کا سب سے اقبال مند فرماں روا تھا۔ پنجاب کے راجہ جے پال نے جب امیر سبکتگین کے سفیوں کو لاہور میں قید کیا اور امیر موصوف نے فوج کشی کی تو جے پال کی مدد کے واسطے جو راجہ مہاراجہ فوجیں لے کے پنجاب گئے تھے، انھی میں دھنگ بھی شامل تھا۔ بعد میں بھی اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی کی مخالفت میں حصہ لیتے رہے جس کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں آئے گا۔ مگر بندھیل کھنڈ کے چندیل ہوں یا مالوے کے پرمار (یا پوار) اور یا وسط ہند (چیدی) کے کلچوری، یہ سب ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رئیس تھے اور اول تو ان کی مفصل و معتبر تاریخ موجود نہیں دوسرے جو کچھ واقعات محفوظ ہیں، اُن کا ضروری خلاصہ ہم اپنی پہلی تاریخ (برائے میٹریکولیشن) میں لکھ چکے ہیں۔ انھیں دہرانے کی بجائے بہتر ہوگا کہ اس جگہ راجپوتی انساب کے متعلق اجمالی بحث کی جائے اور آخر میں بنگالے کے دو حکمراں خاندانوں کا ذکر کر دیا جائے جنھوں نے فی الجملہ شاہانہ اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

تیسری فصل :- راجپوتوں کا نسب، بنگالے کے راجہ

"راجپوت" کے لفظی معنی ہیں راجہ کا بیٹا یا امیر زادہ۔ لیکن جس طرح "امیر زادہ" کا

۱۔ اوکس ہس صفحہ ۱۸۶۔

باب ۱۲

مخفف "میرزا" آج کل ہندوستان میں قومیت کی علامت بن گیا ہے، اسی طرح "راجپوت" بھی ایک خاص قوم کے معنی میں مستعمل ہوا اور پھر یہ لوگ دعویٰ کرنے لگے کہ ہم سب کشتری یا چھتریوں کی ایک ہی نسل سے ہیں۔ حالانکہ اس بات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ جو لوگ اس زمانے میں اپنے تئیں راجپوت کہتے ہیں[۱] وہ بالکل مختلف قوموں کی اولاد ہیں جن میں سے بعض قدیم سے ہندوستان میں آباد تھیں، بعض نسلاً آریا ہیں اور بعض بہت بعد میں ہندوستان آئیں۔

واضح رہے کہ خود "کشتری" کا لفظ کسی خاص قوم کے لیے مخصوص نہیں تھا اور گو اس قدر قدیم ہے کہ اب اس کی اصلیت نگاہ سے مخفی ہو گئی تاہم ونسنٹ اسمتھ کے نزدیک سوائے برہمنوں کے ہر ذات کا آدمی جو تخت حکومت حاصل کر لیتا تھا اس نام سے موسوم ہو جاتا تھا۔[۲] پھر جب بہت سے خاندان جنھیں قسمت نے دولت و حکومت سے

۱۔ کثرت تعداد کے اعتبار سے آج کل راجپوتوں کے آٹھ بڑے بڑے قبیلے یا گوت ہیں:۔

(۱) راٹھور۔ ان کی تعداد سوا لاکھ کے قریب ہے۔ مارواڑ (جودھپور) بیکانیر اور کشن گڑھ کے راجہ اسی قبیلے سے ہیں۔

(۲) کچھواہہ۔ جے پور و الور میں برسر اقتدار ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔

(۳) چوہان۔ اس قبیلے کے افراد ریاست ہائے بوندی، کوٹہ اور سر دہی کے رئیس ہیں۔ کل تعداد نوّے ہزار سے بھی کم ہے۔

(۴) سسودھیا۔ اس قبیلے کی تعداد پچاس پچپن ہزار سے زیادہ نہیں۔ مگر اودے پور میواڑ کے نامی راجہ مہاراجہ اسی قبیلے سے ہیں۔

(۵) جادو۔ (۶) پنوار (۷) سولنکی اور (۸) پریہار بھی مشہور قبائل ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے اور کوئی بڑی ریاست ان کے زیر حکومت نہیں۔ ان کے علاوہ راجپوتوں کے اور بہت سے قدیم قبائل راجپوتانے میں اور اس کے باہر آباد ہیں اور ایک معقول تعداد نے دین اسلام اختیار کر لیا ہے۔ ۱۲۔

۲۔ ارلی ہسٹری صفحہ ۴۰۸۔

محروم کر دیا، بزرگوں کی یادگار میں اسی نام سے کشتری یا چھتری کہلاتے رہے تو قیاس چاہتا ہے کہ نئے حکمرانوں نے اپنے لیے ایک اور لقب (راجپوت) اختیار کر لیا تاکہ عام چھتریوں میں اور اُن میں امتیاز رہے۔ لیکن دولت و حکومت آنی جانی چیز ہے۔ دورِ وسطیٰ کے انقلابات نے ہندوستان کے بیسیوں خاندانوں کو تختِ شاہی سے محروم کر دیا اور جب مسلمان یہاں آئے تو وہ ہندو حکمراں جو "راجپوت" کہلاتے تھے یا تو اُن کے باجگزار بن گئے اور یا شکستیں کھا کر انھوں نے مغربی ریگستان کی راہ لی جہاں دشمنوں کی رسائی دشوار تھی۔ انھی پناہ گزینوں کی بدولت یہ صحرائی ملک راجستان یا راجپوتانہ کے نام سے مفتخر ہوا۔

سیتھی عناصر

بہرکیف اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ راجپوتوں کے تمام قبائل کسی ایک نسل سے نہیں ہیں بلکہ اُن میں مختلف قوموں کے خون کی آمیزش ہے۔ اس قدر تو کپتان ٹاڈ نے بھی تحریر کیا ہے کہ راجپوت قبائل کی بعض "عادات اور اوہام" اُن کے سیتھی یا سِیدی ہونے کا پتا دیتے ہیں[۱]۔ اور ٹاڈ وہ شخص ہے جس نے تقریباً سو برس پہلے (۱۸۲۹ء میں) اپنی مشہور کتاب "اینلز اینڈ اینٹی کوی ٹیز اوف راجستان" مرتب کی تھی۔ اور بھاٹوں کے گیت اور افسانے تک اپنے "وقائع" میں داخل کر لیے تھے۔ تحقیقات جدید سے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے اور گو کوئی تحریری سند میسر نہ آئے تاہم سیتھیوں کے بعد جو قومیں ہندوستان میں آئیں اُن کے حالات کا مطالعہ کرنے سے اس قول کے باور کرنے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ پہلے آنے والوں نے بھی اسی طرح ہندوستان کی قدیم آبادی میں اپنے واسطے جگہ نکال لی ہو گی جس طرح کہ پانچویں صدی عیسوی کے بیرونی حملہ آوروں نے رفتہ رفتہ حاصل کر لی ہے کہ اب ان میں اور دوسرے راجپوت قبائل میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ بلکہ ان نووارد گروہوں کو بھی اسی قدیم نسل میں مان لیا گیا جس کی تین شاخیں چندر بنسی، سورج بنسی، اور اگنی کُل کے نام سے موسوم ہیں۔

ہون

ان پانچویں صدی کے آنے والوں سے ہماری مراد "ہون" قوم کے لوگ ہیں۔

---

[۱] دیکھو اس کی کتاب جلد اول صفحہ ۳۱۔

باب ۱۱

مغربی ہند پر اُن کی یورش کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ گورجر یا گوجر قوم کے لوگ۔ ان کے ہم نسل تھے یا کم سے کم ان کے ہمراہ باہر سے ہندوستان میں آئے اور چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں راجپوتانے اور پنجاب میں اُن کی متعدد ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان میں سب سے مشہور ریاست بھیل مال یا بھینمال تھی اور یہیں کا راجہ ناگ بھٹ آخر میں قنوج پر قابض ہوگیا تھا (صفحہ ۲۰۶) اُس امر کا اب قطعی ثبوت مل گیا ہے کہ راجہ بھوج اور اس کے اسلاف و اخلاف گوجروں کی ایک شاخ میں تھے جو پرتی ہار یا پریہار کہلاتی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ راجپوتوں کا مشہور قبیلہ پریہار گوجروں ہی کی نسل سے ہے[1]" حالانکہ خود "گوجروں" کو کوئی ہندو کشتری یا راجپوت نہیں مانتا[2]۔

چندیل اور راٹھور

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ "پریہار" حقیقت میں گوجر ہیں اور اپنی اصلی قوم سے الگ کرکے انھیں راجپوتوں میں شامل کر لیا گیا ہے تو پھر قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے وہ قبیلے جو پریہاروں کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح غیر آریا ہوں گے۔ لیکن چونکہ اُن کے گوجر ہونے کی کوئی بلاواسطہ شہادت موجود نہیں لہٰذا اس بحث کو یہاں چھیڑنا بے محل ہوگا۔ البتہ اس امر کی عمدہ شہادتیں موجود ہیں کہ چندیل (راجپوتوں) کا ہندوستان کے قدیم گونڈوں سے قریبی تعلق تھا اور اُسی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ

[1] - ارلی ہس صفحہ ۳۱۱۔

[2] - اس جگہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنجاب کے بہت سے جاٹ اپنے تئیں "راجپوت" یا چھتری بتاتے ہیں (رپورٹ مردم شماری ۱۹۰۱ء) اور جدید اہل تحقیق کے نزدیک یہ جاٹ اور گوجر ایک ہی نسل سے ہیں۔ مگر برہمن لوگ جاٹوں کے اس دعوے کو نہیں مانتے اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین چار صدی پہلے اس قوم کے لوگوں میں حکومت نہ تھی۔ "راج" حاصل ہونے کے بعد اس کے بعض خاندانوں نے "راجپوت" ہونے کا دعویٰ کیا ہوگا اور چونکہ یہ حال کا واقعہ ہے غالباً اسی لیے برہمنوں نے انھیں چھتریوں کی ذیل میں داخل نہیں کیا۔

باب ۱۲

چندیل راجپوت درحقیقت بہار یا گونڈ قوم کے لوگ ہیں جو ہندو مذہب اور تمدن کے رنگ میں رنگ گئے اور حکومت و بادشاہی حاصل کرنے کے بعد کشتری یا راجپوت سمجھے جانے لگے ....." (ارلی ہسٹری۔ صفحہ ۴۱۳)۔

اسی طرح راٹھور قوم کے راجپوت جو کہ "گھرواڑوں" کی شاخ ہیں، چندیلوں کے ہم نسل تھے جو دوآب سے نقل مکان کر کے راجپوتانے میں آبسے اور اب خالص آریا نژاد راجپوت مانے جاتے ہیں۔

پال خاندان

جس وقت ہندوستان خاص کے علاقوں میں یہ ہل چل مچی ہوئی تھی اور بعد میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے رہے سہے امن و اطمینان میں خلل ڈال رکھا تھا، مشرقی صوبوں کی حالت نسبتاً اچھی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں وہاں کی حکومت مستقل طور پر گوپال راجہ کے خاندان میں منتقل ہو گئی اور چونکہ اس کے جانشینوں کے نام کا جزو آخر "پال" (Pala) ہے اس لیے یہ سب پال خاندان کے راجہ کہلاتے ہیں۔

قرائن سے پایا جاتا ہے کہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کو ۷۴۳ء میں بادشاہی کے لیے "منتخب" کیا گیا تھا مگر اس کا پتا چلانا محال ہے کہ آیا یہ انتخاب کسی خاص شہر کے اعیان و اشراف نے کیا تھا یا اس میں تمام صوبے کے سر برآوردہ رئیس و راجہ شریک تھے۔ بہرحال خاص طور پر ذکر کے قابل یہ بات ہے کہ راجہ گوپال بودھ مت کا پیرو تھا اور اس نے اُدندپور میں اس مذہب کے درویشوں کے واسطے بہت بڑی خانقاہ تعمیر کی تھی۔ (اُودندپور جو بعد میں اس خاندان کے راجاؤں کا صدر مقام ہو گیا تھا آج کل قصبۂ "بہار" کے نام سے موسوم ہے) اور اس کے معنی یہ ہیں کہ گوتم کا مذہب ہندوستان کے اور کسی حصے میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اصلی وطن میں ابھی تک اس کے نام لیوا موجود تھے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اب اس مذہب کی صورت بالکل بدل گئی تھی اور کنشک راجہ کے زمانے میں جو دو گروہ ہو گئے تھے ان کے اصولی عقائد میں بھی اب فرق آگیا تھا۔

گوپال کے بعد دھرمپال بنگالے کا راجہ ہوا اور گوسیین کا پتا نہیں چلتا

تاہم اتنا ثابت ہے کہ اُس نے کم از کم بتیس برس حکومت کی اور ہندوستان خاص کے تمام علاقے غالباً اُس کے زیر نگیں ہو گئے تھے۔ موجودہ بھاگلپور کے علاقے میں اُس نے نہایت وسیع خانقاہ بنائی تھی اور بیان کرتے ہیں کہ اس کے اندر سو سے زیادہ معبد اور کچھ بڑی بڑی درس گاہیں تھیں۔ مگر زمانے کی دست بُرد نے انھیں ایسا بے نشان کیا کہ اب یقینی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ عمارت کس مقام پر تھی۔

دھرمپال کا بیٹا دیوپال اس خاندان کا سب سے بڑا فرماں روا مانا جاتا ہے کیونکہ اس کے عہدِ حکومت میں کلنگ اور آسام تک تمام مشرقی ہندوستان فتح ہو کر سلطنت بنگالہ میں داخل ہوا اور ایک حد تک گپت اور موریا خاندان کی یاد تازہ ہو گئی۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح دیوپال بودھ مت کا پُرجوش پیرو تھا اور اس مذہب کے سب سے نامور فرماں روا اشوک کی مثل اسے بھی "دھرم کا ڈنکا بجانے" کی آرزو تھی۔ بلکہ مشہور ہے کہ اسی کی خاطر اُس نے غیر مذہب والوں پر فوج کشی کی اور اُن کی بہت سی بستیاں (یا قلعے) تاراج و برباد کریں۔ روایتِ عام کی بہ موجب وہ اڑتالیس برس تک حکمراں رہا اور چند بڑے بڑے تالاب اس کی یادگار ہیں۔

دیوپال کے بعد پہاڑی قبیلوں نے جنھیں کام بوج[1] کہتے ہیں بنگالے پر یورش کی اور بہت دن تک ملک پر ان کا قبضہ رہا۔ آخر ۹۷۸ء یا اس کے قریب راجہ مہی پال نے ان کو دفع کر کے بزرگوں کا ورثہ دوبارہ حاصل کر لیا اور شاید اسی واقعے کی بہ دولت اپنے ہم وطنوں میں آج تک محبوب و محترم سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے عہد کا یہ عجیب واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ چولا خاندان کے راجہ راجندر نے ۱۰۲۳ء میں شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی اور جنوبی دکن سے گنگا کے کنارے تک بڑھ آیا۔ معلوم ہوتا ہے کام بوجوں کی یورش اور اس دکنی راجہ کے حملے ہی نے پال خاندان کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ تھوڑے عرصے بعد بعض جنوبی اور مشرقی صوبے

[1] جناب غلام یزدانی صاحب ایم، اے ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد تحریر فرماتے ہیں کہ "کمبو" مسلمان یا کھتری وغیرہ انھی کام بوجوں کی اولاد ہیں۔

اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ بایں ہمہ بارھویں صدی میں مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے وقت مغربی بنگال یا بہار پر اسی خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے اور اُن کا خاص امتیاز یہ ہے کہ غالباً سب کے سب بودھ مت کے پیرو تھے۔[1]

سین خاندان

گیارھویں صدی کے اواخر میں کلنگ یا اڑیسے کے راجہ **چورگنگ** نے بڑی قوت حاصل کی تھی اور غالباً اسی کا ایک فوجی سردار سمنت دیو اڑیسے کے شمال میں (موجودہ ریاست میور بھنج کے علاقے میں) ایک چھوٹی سی جاگیر **کاسی پوری** کا مالک بن گیا تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ شاید اس کی اور اُس کے دو جانشینوں کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی اور وہ اپنے آقا چورگنگ کے خراجگزار سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ پال خاندان کے راجہ والیِ کلنگ کے حریف تھے لہٰذا عجب نہیں کہ اسی کلنگ کے راجہ کے اشارے سے کاسی پوری کے یہ جاگیردار بنگالے پر تاخت تاراج کرتے ہوں۔ پھر پال خاندان کی قوت میں ضعف آیا تو سمنت دیو کے پوتے **بلال سین** نے مشرقی بنگالے کا بہت سا حصہ دبالیا اور وہاں خود مختار ریاست قایم کی۔ یہ ۱۱۵۸ء یا اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے اور گو اس خاندان کو کچھ زیادہ عرصے تک حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی تاہم بلال سین اور اس کے بیٹے لکشمن سین کا زمانہ بنگالے کی تاریخ میں اس لیے یادگار ہے کہ یہ برہمنوں کے حامی اور بودھ مت کے سخت دشمن تھے خاصکر بلال سین کے عہد حکومت میں مشہور ہے کہ بنگالے کے ہندوؤں کی از سر نو ذات بندی عمل میں آئی اور برہمنوں کو نیپال، اراکان وغیرہ مختلف صوبوں میں بھیجا گیا کہ وہاں اپنے مذہب کی اشاعت کریں۔ ۱۱۷۰ء میں جب بلال سین مرا تو اس کا بیٹا

[1] ان کی مذہبی خدمات میں سب سے مشہور وہ سفارتیں ہیں جو مہی پال اور اس کے بیٹے نے پال کے زمانے میں تبت بھیجی گئیں۔ ان میں اس مذہب کے بعض نامور عالم بھی گئے تھے جن کی محنت اور سعی کی بدولت بودھ مت تبت میں پھیلا اور آخر میں اُسے وہ قوت حاصل ہوئی جو رومن کیتھولک مذہب کو یورپ میں حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب تک تبت کا مذہبی پیشوا جسے "لاما" کہتے ہیں، ایک حد تک وہاں کا مُلکی فرماں روا مانا جاتا ہے۔

لکشمن سین وارثِ تاج ہوا۔ مسلمان مورخوں نے اس کا نام رائے لکھمنی لکھا ہے اور اس کی نیک دلی کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ ملک داری کی قابلیت نہ رکھتا تھا اور جب اسلامی سپہ سالار محمد بن بختیار خلجی صرف چند سواروں سے اچانک اُس کے محل میں گھس آیا تو وہ ننگے سر اپنے محل سے بھاگا اور ملک پر بلا دقت مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

باب ۱۳

مسلمانوں کا تسلّط سندھ پر

پہلی فصل حکومت عرب کے اثرات

ونسنٹ اسمتھ نے اپنی قدیم تاریخ ہند میں چینی درویش ہوئین چوئنگ کی سیاحت سندھ کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "معلومات کے دوسرے ذرایع سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ اُن دنوں سندھ کی سلطنت جس کے مقبوضات میں بلوچستان بھی داخل تھا خوش حال قوی اور موجودہ زمانے کی نسبت کہیں زیادہ آباد و سرسبز تھی"[1] مصنّف نے ان "دوسرے ذرایع معلومات" کی کوئی وضاحت نہیں کی لیکن اگر ان ذرایع معلومات سے اُس کی مُراد سندھ کے متعلق وہ عربی یا بعد کی فارسی کتابیں ہیں جو مسلمان جغرافیہ نویسوں یا مؤرخوں نے لکھیں اور جن میں سے بعض کے ترجمے یورپ میں شایع ہو چکے ہیں اور

[1] - ارلی ہسٹری - مطبوعہ ۱۹۱۴ء - صفحہ ۳۵۵ -

باب ۱۳

جو فتوحاتِ عرب کے قریبی زمانے میں تاریخ سندھ کا ماخذ ہوسکتی ہیں تو ان کا مطالعہ کرنے والے کو ونسنٹ اسمتھ کا مذکورۂ بالا قول خلافِ صحت نظر آئے گا۔ ممالک سندھ یا ثُغر الہند" کے متعلق سب سے پہلی مستند اطلاع وہ ہے جو حکیم بن جَبلہ نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کو دی تھی اور حکیم بن جبلہ کو خاص طور پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ ثُغر الہند" کے حالات دریافت کریں۔ ثغر الہند یا سرحد ہند سے اس زمانے میں سندھ ہی مراد ہوگا کیونکہ مکران خلیفۂ ثانیؓ کے زمانے میں فتح ہو چکا تھا غرض حکیم نے یہاں آکر دیکھ بھال کی اور والیِ عراق نے انھی کو دربار خلافت میں بھیج دیا کہ جو کچھ دیکھا ہے وہ جاکے زبانی عرض کر دیں چنانچہ سندھ کے متعلق ان کا یہ قول محفوظ ہے کہ "مائُھا وشَل وثمرھا دقل ولصُّھا بطل۔ اِن قل الجیش فیھا ضاعوا وان کثر واجاعوا" یعنی وہاں گہرا پانی نہیں ملتا۔ وہاں کے پھل بدمزہ ہیں چور نہایت دلیر ہیں۔ اگر فوج کم ہو تو وہاں ضایع ہو جائے اگر زیادہ ہو تو بھوکی رہ جائے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم حال بیان کرتے ہو یا قافیہ بندی؟ انھوں نے کہا نہیں اصلی حال عرض کرتا ہوں۔ پس ہند پر فوج کشی کرنے کا خیال چھوڑ دیا گیا۔[لہ]

اس روایت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مملکت سندھ کی کم سے کم مغربی اضلاع کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور گو سنہ کا ہمیں پتا نہیں چلا مگر قرائن سے ظاہر ہے کہ حکیم بن جَبلہ خلافتِ عثمانی کے اوائل یعنی ۲۴ھ یا ۲۵ھ میں ادھر بھیجے گئے تھے۔

چچ نامہ اور اس کی شہادت

اس کے بعد مسلمانوں کی فتح سے پہلے کے حالات کی کچھ جھلک ہمیں مل سکتی ہے تو چچ نامہ سے جو فتح سندھ کے قریبی زمانے کی سب سے پہلی عربی تاریخ کا فارسی ترجمہ ہے گو فارسی مترجم نے اپنی طرف سے بعض روایتیں بڑھا دی اور بعض حصے چھوڑ دیے ہیں لیکن مجموعی طور پر اصلی (عرب) مورّخ کی تحریر میں زیادہ تحریف نہیں ہوئی ہے اور اُس کے ثقہ اور معزز ہونے میں کوئی شبہہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ اس کی اولاد نے یہ مسودہ اپنے جد امجد کی عزیز یادگار سمجھ کر کئی سو برس تک محفوظ رکھا۔

لہ۔ فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ صفحہ ۴۳۲۔ طبری نے یہ واقعہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد سے منسوب کیا ہے۔ ۱۲

یہاں تک کہ **علی بن حامد بن ابی بکر** نامی فارسی ادیب جو اپنا وطن **عراق** چھوڑ کر شمالی سندھ میں آبسا تھا، قدیم تاریخ کی تلاش میں **بھکر** آیا اور وہاں کے قاضی مولانا **اسمٰعیل بن علی** سے یہ مسودہ اسے ملا۔ ترجمے کا زمانہ جیسا کہ مترجم خود بیان کرتا ہے ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء ہے اور یہی فارسی ترجمہ ہے جو "تاریخ ہند و سندھ" "منہاج المسالک" اور سب سے زیادہ "چچ نامہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ جس وقت علافی قبیلے کے عربوں نے ۸۴ھ/۷۰۳ء میں **سعید بن اسلم** کلابی والیِ مکران کو اور پھر اس کے جانشین **مجاعہ** کو قتل کیا[1] اور حکومت کے خوف سے بھاگ کر سندھ کے راجہ داہر کی پناہ لی تو **حجاج بن یوسف** نے **محمد ابن ہارون** کو مکران کا والی مقرر کیا کیونکہ مکران اور ممالک ایران اُن دنوں عراقِ عرب کے اسی خونخوار حاکم یا گورنر جنرل کے ماتحت تھے۔ نئے والی کو تاکید کردی گئی تھی کہ وہ جس طرح بن پڑے باغی علافیوں کو گرفتار کر کے سعید بن اسلم کا انتقام لے۔ چنانچہ محمد نے ایک علافی کو گرفتار کر کے قتل کیا اور حجاج کو لکھا کہ اگر زندگی باقی ہے تو ایک ایک کر کے ان سب مفرور باغیوں کو گرفتار کرلوں گا چنانچہ وہ ان کے تعاقب میں پانچ سال تک ندیوں اور جنگلوں کی "تسخیر" کرتا پھرا۔[2]

آخری فقرے سے ظاہر ہے کہ مملکت سندھ کے (ان مغربی) اضلاع کی کیا حالت تھی۔ اور یہ گویا اس اطلاع کی تصدیق ہے جو ساٹھ برس پہلے حکیم بن جبلہ نے دربار خلافت میں عرض کی تھی۔ پھر اسی زمانے میں یہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ لنکا سے عراق آنے والے مسلمانوں کی چند کشتیاں سندھ کے قریب بحری قزاقوں نے لوٹ لیں یہ قزاق **دیبل** و حوالیِ دیبل کے رہنے والے تھے اور اس شہر کے متعلق سر ہنری الیٹ بڑی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ موجودہ کراچی کے متصل اس پہاڑی پر آباد تھا جہاں آج کل قلعہ منوڑا واقع ہے[3] اکثر جدید اہلِ تحقیق ان سے متفق ہیں اگرچہ بعض کا

۱؎ ۔ الیٹ جلد اول صفحہ ۲۰۱-۴۴ بحوالہ چچ نامہ۔ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۹۔ مگر فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ مجاعہ اپنی موت سے مرا۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۳۵۔ ۲؎ ۔ الیٹ صفحہ ۴۲۹۔
۳؎ ۔ الیٹ صفحہ ۳۷۶ نیز ملاحظہ ہو امپی رئیل گزیٹیر جلد ۲۲ صفحہ ۳۱۵۔

باب ۱۱

خیال ہے کہ وہ موجودہ ٹھٹھے یا اس کے جنوب میں اس جگہ پر تھا جہاں اب موضع کاکر بکیرا آباد ہے۔ بہر صورت وہ ملک سندھ کے ساحل پر واقع تھا اور اس قزاقی کا یہاں ذکر کرنے سے یہ یاد دلانا منظور ہے کہ جب حجاج نے سندھ کے راجہ سے مطالبہ کیا کہ ان قزاقوں کو سزا اور ہمیں نقصان کا تاوان دلایا جائے تو راجہ نے معذرت کی کہ میرا اُن پر کچھ زور نہیں چلتا اور اُن کے افعال کا میں ذمہ دار نہیں۔ تمام قرائن تائید کرتے ہیں کہ راجہ کا یہ عذر غلط نہ تھا اور سندھ کے سواحل بلکہ سارے جنوبی علاقے میں ہر چھوٹے بڑے شہر کی ریاست الگ اور قریب قریب آزاد تھی۔ ان واقعات سے نہ صرف حکومتِ سندھ کی کمزوری ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ممالک سندھ کی بحری تجارت کے قدرتی راستے بند تھے۔ کم سے کم مسلمانوں کی فتح کے قریب یہاں کی قدرتی بندرگاہیں قزاقوں کے مامن بن گئی تھیں، اور تجارت ایک طرف، بحری آمد و رفت بھی مخدوش ہو گئی تھی۔ آگے ہم پڑھیں گے کہ دیبل کی تسخیر کے بعد دُور تک محمد بن قاسم کو کوئی بڑا قلعہ یا شہر نہیں ملا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جنوب کی وہ قابلِ زراعت زمینیں بھی جنھیں دریائے سندھ سیراب کرتا ہے، بہت کم آباد تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب حجاج نے ان قزاقوں کی سرکوبی اور داہر کو (جس نے خلافت کے مفرور باغیوں کو پناہ دی تھی) سزا دینے کے لیے خلیفہ ولید (۸۶ھ/۷۰۵ء تا ۹۶ھ/۷۱۵ء) سے فوج کشی کی اجازت مانگی تو وہاں سے جواب آیا کہ "ملکِ دُور دست، کم حاصل، خرچ طلب، چند لشکر ہا برود و تلف شود۔ باید ازاں سُو تغافل ورزید"۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ملک سندھ کی یہ حالت تھی اور لشکر کے ضایع ہونے کا بھی اندیشہ زیادہ تر اسی لیے تھا کہ ان صحرائی اور ویران علاقوں میں شاید رسد میسر نہ آئے!

اسلامی فتح کے بعد

لیکن اب ہمیں فتوحات اسلامی کے بعد کی حالت پر نظر ڈالنی چاہیے اور

لہ۔ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۲۔ الیٹ نے بھی قریب قریب یہی الفاظ چچ نامہ اور ابو الفدا کے حوالے سے نقل کیے ہیں:۔ جلد اول صفحہ ۴۳۱۔ خود مولّف تحفۃ الکرام کا خاص ماخذ بھی، جیسا کہ وہ بیان کرتا ہے (جلد سوم صفحہ ۵) چچ نامہ ہے۔

مختلف زمانوں کے متعلق جو شہادتیں ملتی ہیں اُن کا مقابلہ کرنا چاہیے تاکہ سندھ کے تدریجی تغیر کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ اس ضمن میں پہلے یہ توضیح ضروری ہے کہ گو محمد بن قاسم نے سنہ ۹۳ھ [۷۱۲ء] میں ریاست سندھ کو فتح کر لیا تھا اور بڑے بڑے شہروں پر مسلمان قابض ہو گئے تھے، بایں ہمہ ان فتوحات کی تکمیل اور اسلامی قوت کے استحکام میں بہت عرصہ لگا۔ اول تو بڑے بڑے زمیندار جو بجائے خود موروثی راجہ اور سندھ کی صدر حکومت کے برائے نام ماتحت تھے، مسلمان فاتحین سے مدتوں لڑتے جھگڑتے رہے اور آخر تک جب موقع ملا خود مختار ہو گئے۔ دوسرے کچھ فاصلۂ دراز اور کچھ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے اور حکومت اموّیہ کے زوال کی وجہ سے عرب خلفا کو اس طرف توجہ کرنے کا پورا موقع نہ ملا اور بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہشام بن عمر تغلبی کے والیِ سندھ مقرر ہونے (یعنی دوسری صدی ہجری کے وسط) سے پہلے مسلمان ان اقطاع پر جم کر حکومت نہ کر سکے تھے کم سے کم ان کی حکومت اور شائستگی کا اب تک کوئی اثر نمایاں نہ تھا اور ابن خرداد بہ کی کتاب "المسالک والممالک" سے بھی اس قول کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے۔

ابن خرداد بہ کا جغرافیہ

یہ شخص جس کا پورا نام "ابو القاسم عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن خرداد بہ"[1] ہے پارسی نو مسلم تھا خلفائے عباسیہ کے عہد میں ترقی کر کے وزارت کے درجے تک پہنچا اور پہلا جغرافیہ نویس ہے جس نے سندھ میں مسلمانوں کی حکومت قایم ہونے کے بعد ممالک اسلامیہ کے حالات جمع کیے اور اسی سلسلے میں سندھ کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہاں سے "عود ہندی، بید اور بانس (بطور دساور) آتے ہیں"[2]۔ اس مختصر اطلاع سے بھی اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ اب (تیسری صدی ہجری میں) ممالک اسلامیہ سے سندھ کی تجارت شروع ہو گئی تھی۔ آگے چل کر

۱۔ احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم صفحہ ۳۶۲۔ مقدسی کی اس روایت کی اور کسی تاریخ سے تائید نہیں ہوتی لیکن یہ مسلّم ہے کہ ابن خرداد بہ نہایت معزز عہدوں پر مامور ہوتا رہا۔

۲۔ کتاب المسالک والممالک صفحہ ۶۲۔

ابن خرداذبہ نے یہودی اور رُوسی سوداگروں کے راستوں میں سندھ کا بھی ذکر کیا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چین و روس اور یورپ و افریقہ کے قافلے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور برّی اور بحری دونوں قسم کی تجارت کا بازار گرم ہو چلا تھا۔[1]

اصطخری اور ابن حوقل

لیکن ابن خرداذبہ نے اول تو اپنے مختصر جغرافیہ میں زیادہ تر مختلف شاہ راہوں اور شہروں کی مسافت کا حال لکھا ہے دوسرے اتنے مجمل حالات سے جن میں مسلمانوں کے نئے شہروں کا بھی ذکر نہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک سندھ کو یا وہاں کے نئے شہروں کو وہ وقعت حاصل نہ ہوئی تھی جس کا بعد کے جغرافیوں سے ثبوت ملتا ہے۔ ان میں بھی جو جغرافیہ سب سے بعد کا ہے اُسی میں سب سے زیادہ اور کار آمد معلومات موجود ہیں، مگر ہم تقدّم زمانی کے لحاظ سے اول ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد الاصطخری کے جغرافیے سے شروع کریں گے جو چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت کو نکلا تھا اور ابن خرداذبہ سے قریب قریب ایک صدی بعد کے حالات بیان کرتا ہے۔ بلاد سندھ کے ذکر میں وہ لکھتا ہے کہ "شہر منصورہ جسے سندھی میں برہمن آباد کہتے ہیں، ایک میل[2] کے قریب لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے اور مہران (دریائے سندھ) کی ایک کھاڑی میں ٹاپو پر آباد ہے۔ یہاں کے رہنے والے مسلمان ہیں

۱۔ کتاب المسالک والممالک صفحہ ۱۵۳ و ۱۵۴۔

۲۔ اس جگہ عربی میل و فرسخ کا حساب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ میل آج کل کے انگریزی میل سے کوئی چار سو گز زیادہ ہوتا تھا۔ اور ایسے تین میل کا ایک فرسخ ہوتا تھا جو اس زمانے کے حساب سے کوئی پونے چار میل کے برابر ہوا۔ (عربی ذرع اور میل و فرسخ کے لیے دیکھو تقویم البلدان عن ابی الفداء فصل تحقیق الامرالمساحۃ) فرسخ کا لفظ آج کل بھی ایران میں استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ انگریزی حساب سے ۳ ۴/۵ میل کے قریب لمبا ہوتا ہے (انسائی کلو برٹ۔ جلد ۲۸ صفحہ ۴۹۳)۔

اہل عراق کی مثل لباس پہنتے ہیں۔ ان کی اور اہل مضافات کی زبان عربی اور سندھی ہے اور یہی حال شہر **ملتان** اور نواح ملتان کا ہے کہ وہاں کے لوگ عراق عرب کے باشندوں کا سا لباس یعنی کرتے اور شلواریں یا تہمد استعمال کرتے ہیں۔ ملتان رقبے کے اعتبار سے منصورہ سے نصف اور شہر **ال رور** (الور) کے برابر ہے۔"

دیبل کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شہر مہران کے مغرب میں ساحل بحر پر واقع اور بہت بڑا تجارتی شہر ہے اور اس کے مضافات میں غلّہ کی کاشت ہوتی ہے۔[1]

قریب قریب یہی حالات، جو اصطخری نے لکھے ہیں، ابوالقاسم **ابن حوقل** کے جغرافیے میں مذکور ہیں اور ان دونوں جغرافیوں کے پڑھنے سے ثابت ہے کہ دو صدی کی عربی حکومت نے سندھ کی حالت بدل دی تھی، اسلام اور اسلامی تمدن کا رنگ اس پر چھا گیا تھا۔ بہت سے بارونق شہر و قصبات آباد تھے جہاں کے رہنے والے مرفہ الحال زمیندار یا دولت مند سوداگر تھے۔ اور گو سیاسی طور پر یہی (چوتھی صدی ہجری) وہ زمانہ ہے جس میں خلافت بغداد کو زوال آ رہا تھا۔ یمنی اور نزاری قبائل کی خونریز خانہ جنگی اور فرقۂ اسمٰعیلیہ وغیرہ کی شورشیں عربوں کی حکومت کو پارہ پارہ کیے دیتی تھیں۔ سندھ بھی اب دو ریاستوں میں منقسم ہو گیا تھا جہاں کے عربی النسل حاکم برائے نام خلیفۂ بغداد کے ماتحت تھے۔ بایں ہمہ مدنیت کا قدم برابر آگے بڑھ رہا تھا اور جیسا کہ ایک بعد کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے سندھ میں نہ صرف زراعت و تجارت بلکہ اس کے ساتھ ساتھ صنعت و فنون

---

[1] مسالک والممالک۔ لابی الاسحٰق الاصطخری۔ از صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۸۔ ان صفحات کا راقم الحروف نے اپنے طور پر خلاصہ اوپر نقل کیا ہے: الیٹ کے انگریزی ترجمے میں کئی نقص اور غلطیاں ہیں خاص کر ملتان و منصورہ کے متعلق اس کا یہ لکھنا کہ وہاں فارسی اور سندھی زبان رائج ہے (جلد اول صفحہ ۲۹)۔ اصل عبارت کے بالکل خلاف ہے۔ مکران کے بعض شہروں میں البتہ اصطخری نے لکھا ہے کہ) فارسی اور مکرانی زبان بولی جاتی تھی صفحہ ۱۷۷۔

باب۳

جغرافیۂ ادریسی

اور علم و فضل کی بھی گرم بازاری تھی۔[۱]

لیکن اب ہمیں اپنے سب سے آخری ماخذ یعنی ابو عبداللہ محمد ادریسی کی کتاب پر نظر ڈالنی چاہیے جس نے چھٹی صدی ہجری میں سب سے زیادہ تحقیق و تفصیل کے ساتھ سندھ کے حالات لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کی پوری کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی اور قلمی نسخہ ہندوستان میں غالباً نایاب ہے۔ لاطینی اور فرانسیسی میں جو ترجمے شایع ہوئے ہیں وہ بھی صحیح اور قابل اطمینان نہیں سمجھے جاتے۔ مگر سر ہنری الیٹ نے ان ترجموں کا اصل عربی سے مقابلہ کیا تھا اور انھی کا انگریزی ترجمہ ہمارے پیش نظر ہے۔[۲] بلاد سندھ کے ذکر میں ادریسی نے پہلے دیبل کے متعلق بیان کیا ہے کہ گو اس کی زمین اچھی اور قابل زراعت نہیں مگر یہ شہر خوب آباد اور سندھ کی بحری تجارت کا مرکزی مقام ہے۔ یہاں قسم قسم کی اشیا کی تجارت ہوتی ہے۔ اور بیوپاری یہاں کے لوگ نہایت ہوشیار ہیں۔ ایک طرف چین و ہندوستان اور دوسری طرف عمان کی اجناس کے لدے ہوئے جہاز دیبل پہنچتے ہیں۔ یہاں کے لوگ جو عام طور پر مالدار ہیں ان کو مقدار کثیر میں خرید کر بھر لیتے ہیں اور نرخ کے گراں ہونے پر اندرونِ ملک میں لے جاکر فروخت کرتے ہیں۔

دیبل سے تین دن کے راستے پر نیرون معمولی شہر ہے۔ مگر یہاں جنگی قلعہ موجود ہے اور باشندے مالدار ہیں۔

نیرون سے تین دن یا کچھ زیادہ کے راستے پر شہر منصورہ واقع ہے۔ عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں چار نئے شہر اس نام سے موسوم کئے گئے تھے۔ انھی میں سندھ کا یہ منصورہ بہت وسیع، مرفہ الحال تجارتی اور بارونق شہر ہے۔[۳] اس کی نواح سرسبز و شاداب ہے۔ کھپریل، اینٹ اور راستہ کاری کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ مقام سیر و تفریح کے لایق ہے تجارت کو یہاں ترقی ہے۔

۱۔ احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم (مولفۂ علامہ شمس الدین المقدسی البشاری صفحہ ۴۷۴ و ۴۷۹)۔

۲۔ الیٹ۔ جلد اول صفحہ ۷۴ تا ۹۲۔

۳۔ یہ ادریسی کی غلطی ہے اس شہر کی بنیاد کچھ عرصے پہلے پڑی تھی (دیکھو اس باب کی آخری فصل)۔

بازار آدمیوں سے اور گودام اسباب تجارت سے بھرے رہتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے لوگ ایرانی لباس اور رُوسا ململ کے کُرتے پہنتے اور بڑے بڑے بال رکھتے ہیں۔ چاندی اور تانبے کا سکہ رائج ہے...... مچھلی بہ افراط اور گوشت ارزاں ملتا ہے[1]۔ دیسی اور غیر ولایت کے پھلوں کی کمی نہیں۔

دیبل سے دو دن اور منصورہ سے تین دن کے راستے پر ایک اور شہر **بانیہ** ہے جہاں مخلوط نسل کے باشندے آباد ہیں۔ بسر اوقات کے لیے یہاں بہت آسائشیں اور اجناس ارزاں ہیں.....

منصورہ سے ایک دن میں **کالری** پہنچ جاتے ہیں۔ مگر منزل ذرا کڑی یعنی چالیس میل (عربی) کی مسافت ہے۔ یہ مہران (یعنی دریائے سندھ) کے مغربی کنارے پر ایک خوب صورت قلعہ بند شہر ہے جہاں تجارت کی بڑی گرم بازاری ہے اور اسی وجہ سے شارع عام سے دُور ہونے کے باوجود یہاں لوگوں کی خوب آمد و رفت رہتی ہے۔

الور[2] یہ دلکش مقام دریا کے دونوں طرف آباد ہے اور رقبے میں ملتان کا مقابلہ کرتا ہے۔

شروسان کالری سے تین دن کے راستے پر واقع ہے۔ یہ شہر نہ صرف وسعت کے اعتبار سے قابل ذکر ہے بلکہ اس کی وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ بہت سی نہریں اور فوّارے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہاں نہایت عمدہ پیداوار اور بہت نفع رساں تجارت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں بہت آمد و رفت رہتی ہے۔ اسی طرح **منجابری** نہایت خوش سواد شہر ہے جس کے گرد بہت سے باغ لگے ہوئے ہیں اور ان میں نہریں جاری ہیں۔

---

[1] یہ لطیفہ لکھنے کے قابل ہے کہ آج کل سندھ کے ان علاقوں میں گوشت کا قحط رہتا ہے۔ یوں بھی لوگ مفلس ہیں اور بہت ادنیٰ درجے کی خوراک پر ان کا گزارہ ہے (ملاحظہ ہو گزیٹیر جلد ۲۲ ص ۴۰۹)۔

[2] آلور کو ادریسی یا اس کے کاتب نے "دور" لکھا ہے۔

ملتان وسیع شہر ہے اور یہاں ہر قسم کی اجناس بہ کثرت ملتی ہیں۔ سرکاری محصولات بہت کم ہیں اس لیے باشندے عام طور پر خوش حال ہیں بضافات شہر میں ایک ندی سے آب پاشی کی جاتی ہے[1] جو مہران میں جا ملی ہے۔ ملتان میں جنگی قلعہ بنا ہوا ہے مگر اس سے ایک میل کے فاصلے پر **جندور** میں نہایت مستحکم قلعوں کا سلسلہ موجود ہے اور ان سب میں آب رسانی کے ذرایع مہیا ہیں ملتان کا حاکم تعطیل کا زمانہ اور بہار کا موسم یہیں گزارتا ہے۔

سندور ملتان سے تین دن کے راستے پر واقع ہے اور اپنی تجارت و دولت اور باشندوں کے تزک و احتشام کی وجہ سے مشہور ہے ...[2]"

اسی طرح **ادریسی** نے اور بیس پچیس مشہور تجارتی شہروں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض گجرات کے ساحل پر آباد تھے۔ اور بعض مکران کے علاقے میں مسلمانوں کی عملداری میں داخل تھے۔ ان سب شہروں کے محل وقوع اور بعد کی تاریخ کا پتا چلانا دشوار ہے اور ادریسی کے پورے بیان کو نقل کرنا بھی طوالت سے خالی نہیں مگر اس **جغرافیے** کو پڑھ کر، جو تاریخوں سے زیادہ کار آمد و معتبر ہے، اسلامی سندھ کا نہایت دلکش مرقع تصور کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس بات کے یقین کرنے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ تین صدی کی حکومت میں مسلمانوں نے ان ملکوں کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ سندھ کے شہروں کا مختصر ذکر ہم نے اوپر پڑھا۔ مکران کے ویران صحرائی اضلاع میں بھی انھوں نے **کیروسی**، **فیروز**، **ارمابیل**، **راسک** اور **دارک** جیسے بیسیوں شہر آباد کر دیے تھے، جہاں تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں تھیں۔ ہر قسم کا سامان تمدن افراط سے ملتا تھا مناسب

---

[1] اس جگہ یہ لکھنا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ نہریں بنانے کے علاوہ غالباً سب سے پہلے مسلمانوں نے پون چکی سے پانی کھینچنے اور آبپاشی کرنے کا طریقہ نکالا تھا (ملاحظہ ہو الیٹ جلد اول صفحہ ۴۶۷ فٹ نوٹ۔ بحوالۂ پرائس وغیرہ)۔

[2] بلاد سندھ کا حال ہم نے الیٹ کے انگریزی ترجمے سے اپنے الفاظ میں ملخصاً پیش کیا ہے (الیٹ جلد اول صفحہ ۷۷ تا ۸۴)۔

مقامات میں اجناس کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی تھی۔ لوگ دولت مند، خوش حال دُنیا کے معاملات سے باخبر، خلیق و مہماں نواز تھے اور انھوں نے خاص ممالک اسلامی کا تمدن اور جماعت کثیر نے وہی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

دوسری فصل عربوں کا نظام حکومت اور ملکی آئین

عرب والی

سندھ خلافت دمشق کا اور بعد میں خلافت بغداد کا ایک صوبہ تھا اور اس کو چار یا پانچ بڑے بڑے ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مگر وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ تقسیم اکثر بدلتی رہتی تھی۔ اور گو مکران کو مستقل طور پر ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا تھا لیکن کبھی کبھی اسے بھی حاکم سندھ کے تحت میں دے دیا جاتا عربی میں صوبے کو ولایت اور وہاں کے حاکم کو والی کہتے ہیں مگر اس کی حیثیتیں کسی قدر مختلف ہوتی تھیں چنانچہ والئ سندھ کا بالادست عہدہ دار بھی والی کہلاتا تھا اور سندھ جیسے کئی صوبے اس کے ماتحت تھے۔ بایں ہمہ والی کی نامزدگی خاص خلیفہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ اسی کے دربار سے وہ سات پارچے کا خلعت، دو تلواریں، دو کڑے، پرچم، طوق اور تاج ولایت لے کے روانہ ہوتا تھا۔[لہ]

سرکاری محاصل بھی غالباً براہ راست دارالخلافت کو بھیجے جاتے تھے اور اسی طرح اہم معاملات میں خلیفۂ وقت کی منظوری لینی ضروری ہوتی تھی۔ اسلامی حکومت کے اصول، فتح سندھ سے بہت پہلے منضبط ہو چکے تھے اور ہر جگہ اُن کی پابندی کی جاتی تھی۔ البتہ اندرونی معاملات اور جزئیات میں ہر والی قریب قریب خود مختار اور صوبے کے امن و انتظام کا ذمہ دار تھا۔ بلکہ سندھ جیسے دُور دست سرحدی صوبوں میں بعض اوقات صلح و جنگ کے اختیارات بھی اُن کے تفویض

لہ۔ صناجۃ الطرب صفحہ ۱۷۴۔

ہو جاتے تھے۔ فصلوں کی حالت کے لحاظ سے زمین کی مالگزاری میں کمی بیشی کرنا آب پاشی کے وسائل میں ترقی دینا، راستے بنانا اور ان کی حفاظت کے لیے پولیس مقرر کرنا، مناسب مقامات پر عدالتوں کا قیام اور چھاؤنیوں یا نئے شہروں کی تعمیر وغیرہ اس قبیل کے تمام انتظامات انھی کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔

فوجی نوآبادیاں

اندرونی امن اور بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنا والی کا سب سے مقدم فرض تھا اور اس غرض کے لیے مناسب مقامات پر بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں بنادی جاتی تھیں۔ بعید علاقوں میں عرب فاتحین کا مسکن بھی چھاؤنیاں تھیں اور یہی رفتہ رفتہ شہروں کی صورت اختیار کرلیتی تھیں۔ سندھ میں عرب سپاہی اول اول اپنی عورتوں کو لیکر نہیں آئے تھے۔ انھوں نے یہیں شادی بیاہ کیا اور اس لیے یہاں ان کی فوجی چھاؤنیاں بہت جلد مستقل نوآبادیاں اور ان کی اولاد کا وطن بن گئیں۔ **منصورہ، قصدار، قندابیل، بیضا، محفوظہ** اور ملتان کے قریب **جندور** (یا جندادر) اسی قسم کے لشکری مقام تھے جہاں تھوڑے عرصے میں وسیع شہر آباد ہو گئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ان شہروں کی اصلی رونق اور آبادی سپاہیوں کی بدولت تھی اور اسی وجہ سے جب عربی حکومت کا شیرازہ بکھرا اور اسی کے ساتھ پرانا فوجی نظام درہم برہم ہوا تو یہاں کے سپاہی پیشہ باشندے وجہ معاش سے محروم ہو گئے اور انھیں یا تو نئے حکمرانوں کی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ترک وطن کرنا پڑا، کیونکہ ان حکام کے جنگی مستقر بھی دوسرے تھے اور یا مجبوراً وہ قریب کے دیہاتوں میں منتشر ہو گئے کیونکہ سپاہ گری کے عادی کو زراعت کے سوا بالعموم اور کوئی پیشہ پسند نہیں آتا۔ ان لوگوں کے وطن چھوڑ دینے سے اہل صنعت وحرفت اور آخر میں سوداگروں نے بھی ان شہروں کو چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح جلد یہ چھاؤنیاں آباد ہوئی تھیں اسی طرح تھوڑے عرصے میں اجڑ گئیں اور وہاں بڑی بڑی عمارات کے کھنڈر یا صرف چھوٹے چھوٹے گاؤں باقی رہ گئے۔

مگر یہ زوال حکومت کے بعد کی باتیں ہیں، یہاں ہمیں سرسری طور پر

عربوں کے فوجی نظام پر ایک نظر ڈال جانی چاہیے کہ ان چھاؤنیوں میں سپاہیوں کے مکانات کے علاوہ بعض سرکاری دفاتر، شفاخانہ، عدالت قضا، رسدخانہ اور اصطبل بھی ضرور ہوتا تھا چھاؤنیاں عمدہ آب و ہوا کے خوش منظر مقامات پر بنائی جاتی تھیں اور سپاہیوں کے مکانات میں بھی حفظان صحت کے اصول مدِنظر رکھے جاتے تھے۔ قریب ہی چراگاہوں کے واسطے وسیع میدان چھوڑ دیے جاتے اور گھوڑوں کی افزائشِ نسل اور پرورش کا خاص اہتمام تھا کیونکہ گھوڑا عرب سپاہی کی ہمیشہ سے نہایت محبوب سواری ہے اور ان کی فوجوں میں زیادہ تر سوار ہی ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ پیادہ اور شتر سوار فوج کی معقول جمعیت رہتی تھی اور اس زمانے کے آلات قلعہ شکن یعنی منجنیق و دبابہ کے استعمال کے واسطے بھی غالباً سپاہیوں کی ایک جماعت مخصوص کر دی جاتی تھی۔ جنگ کے اسلحہ اور لباس میں عربوں نے بعض مفید ایجادیں کی تھیں لیکن لڑائی کا انحصار ابھی تک تیر و شمشیر پر تھا اور انھی اسلحہ سے کام لینے کی مہارت سپاہی کا کمال سمجھی جاتی تھی۔ اس قسم کی فوجی مشق یا مصنوعی لڑائیاں جن سے آج کل فوجوں کو سدھاتے ہیں اُس زمانے میں رائج نہ تھیں اور سچ یہ ہے کہ ایک جنگجو قوم کو، جسے آئے دن دشمنوں سے لڑنا پڑتا ہو، ان تیاریوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ مگر عرب سپاہی اپنی چھاؤنیوں میں بے کار نہ رہتے تھے بلکہ گھڑ دوڑ، کشتی، بھاگ دوڑ، پیراکی یا اسی قسم کے سپاہیانہ کھیل اُن کا عام مشغلہ تھے۔

سپاہیوں کو بیش قرار تنخواہوں کے علاوہ مالِ غنیمت سے حصہ ملتا تھا۔ اور غالباً وہ ہر قسم کے محاصل سے مستثنیٰ تھے۔ البتہ وہ عرب سردار جنھیں بڑی بڑی زمینیں معافی کے طریقے پر مل جاتی تھیں، صدقہ و زکوٰۃ کی مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔

سرکاری محاصل — ایسے تمام سرکاری محاصل درحقیقت مذہبی نوعیت رکھتے تھے اور مسلمانوں سے صدقہ و زکوٰۃ اور غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ کے سوا کوئی محصول نہ لیا جاتا تھا لیکن بعد میں مقامی ضروریات یا جابر حکام کی زبردستی سے بعض اور ایسے ابواب بڑھ گئے جن کی اسلامی قانون میں کوئی ہدایت نہیں۔ مگر اس جگہ خاص طور پر

باب ۱۳

یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ خوش حال مسلمانوں کو ذمیوں کی نسبت زیادہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا کیونکہ مسلمان اپنی آمدنی کا کم سے کم ڈھائی فی صدی (یعنی چالیسواں حصہ) اور بعض اوقات ۱۲½ فی صدی (یعنی آٹھواں حصہ) بیت المال میں داخل کرتے تھے اور ذمی غیر مسلم کو سالانہ پانچ دینار جزیہ دینا پڑتا تھا جو ہمارے حساب سے تیس روپیہ کلدار سے بھی کم ہوا۔ اس میں بھی معذور و غیر مستطیع اشخاص بالکل مستثنیٰ تھے اور کم استطاعت والوں کو مذکورہ شرح سے کمتر دینا ہوتا تھا اور خواہ وہ کتنے ہی مالدار ہوں، زیادہ سے زیادہ پانچ دینار سالانہ ادا کرتے تھے حالانکہ دولتمند مسلمانوں کو مذکورۂ بالاحساب سے جو رقم زکوٰۃ کی دینی پڑتی تھی وہ جزیہ سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھی۔[۱]

جزیہ ادا کرنے والوں کی جان و مال کی حفاظت کا مسلمان ذمہ لیتے تھے اور تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ اگر جزیہ وصول کرنے کے بعد کسی شہر سے مسلمانوں کو ہٹنا پڑا تو انھوں نے ذمیوں کا تمام وصول کیا ہوا روپیہ واپس کر دیا۔[۲] اسی طرح جو غیر مسلم اسلامی فوجوں میں بھرتی ہو جاتے تھے اُن کو جزیہ دینا نہیں پڑتا تھا۔

مالگزاری

مزارعین سے زمین کی حیثیت کے مطابق مالگزاری لیجاتی تھی اور زمین کی پیمائش اور پیداوار و جنس کاشت کے لحاظ سے اُس کی حیثیت قایم کرنے میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ مورخ گبن کے الفاظ میں، اس قسم کی پیمائش اور مردم و مویشی شماری کے جو قاعدے عربوں نے بنائے وہ ہر عہد کے اہل الرائے کے لیے

۱۔ ہم نے یہ شرح محاصل آلیٹ کی تاریخ سے لی ہے۔ (جلد اول صفحہ ۷۷۔) مولوی شبلی مرحوم کی تحقیقات یہ ہے کہ جزیہ کی سالانہ رقم زیادہ سے زیادہ بیس روپیے ہوتی تھی۔ (رسائل شبلی صفحہ ۱۰۵)۔

۲۔ رسائل شبلی۔ صفحہ ۲۰۱ بحوالۂ کتاب الخراج وغیرہ۔ فتوح البلدان (صفحہ ۱۳۷) میں "خراج" کا لفظ لکھا ہے اور اس میں جزیہ کے علاوہ شاید دیگر محاصل بھی آگئے جنھیں مسلمانوں نے واپس کر دیا۔

سبق آموز ہیں۔[1] بڑی بات یہ ہے کہ ان دنوں عام طور پر سرکار اپنا مقررہ حق جنس کی صورت میں وصول کرتی تھی، اور یہ حق بارانی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کُل پیداوار کا ایک چوتھائی ہوتا تھا۔ فصل تیار ہونے کے بعد ہر گاؤں میں سرکاری عہدہ دار یا ٹھیکے والے پہنچ جاتے تھے اور ہر کھیت کی پیداوار کو اپنے سامنے تلوا کر ایک چوتھائی یا کم و بیش خود لے لیتے اور باقی کاشتکار یا زمیندار کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ اگرچہ سرکار کو یہ اجناس پھر اپنے طور پر فروخت کرنی پڑتی ہوں گی لیکن ظاہر ہے کہ اس طریقے میں کسان کو سرکاری زیادہ ستانی کا خوف نہیں رہتا اور جو کچھ پیداوار ہوتی ہے اُس کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم ہو جاتا ہے۔[2]

باغات یا نہری زمینوں کی قیمتی پیداوار پر مالگزاری کی شرح زیادہ تھی[3] مگر آبپاشی کا غالباً علیحدہ کوئی آبیانہ نہیں لیا جاتا تھا۔

اس طرح ولایت سندھ کی کل مالگزاری تقریباً ایک کروڑ پندرہ لاکھ درہم ہوتی تھی جس کے ہمارے حساب سے کوئی ۴۰ ½ لاکھ روپیے (کلدار) ہوئے۔ اس میں علاقۂ مکران شامل نہیں مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اس زمانے میں ولایت سندھ کا رقبہ موجودہ سندھ سے تقریباً سہ گنا زیادہ تھا اور اس میں موجودہ ملتان اور جنوبی پنجاب تک کے اضلاع داخل تھے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان دنوں بہت سی زمین مذہبی اوقاف یا "معافیات" میں شمار ہوتی تھی اور ان کے مزارعین سے کوئی محصول نہ لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی معافیوں کا مجمل حال آگے ہماری نظر سے گزرے گا۔

مسلمانوں کے باہمی تنازعے اور دیوانی مقدمات قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ ہر بڑے شہر اور چھاؤنی میں اس قسم کی عدالتیں سرکار کی

---

[1] "رومی سلطنت کا زوال اور خاتمہ" باب ۵۱ فٹ نوٹ ۳۲۔

[2] جنس کی صورت میں مالگزاری کا یہ طریقہ سندھ میں انگریزوں کے قبضے تک جاری تھا اور ۱۸۶۳ء سے اس کی بجائے سرکار نے مالگزاری میں روپیہ لینے کا قانون جاری کیا گزیٹیر جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔

[3] ایلیٹ صفحہ ۴۷۴۔

جانب سے قایم تھیں اور ان میں شرع شریف کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا فقہ اسلامی اُس وقت تک ایسی مرتب اور مروج نہ ہوئی تھی کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید پر انحصار کر لیا جاتا۔ پس ہر قاضی اول اول ایک حد تک مجتہد کی حیثیت رکھتا تھا اور قرآن و احادیث سے احکام کا استخراج کرنا اس کا فریضہ سمجھا جاتا تھا پھر کچھ عرصے بعد اکثر مقامات میں فقہ حنفی پر عملدرآمد ہونے لگا تھا۔

تعزیری جرائم کی نوعیت اور سزا بھی شرع اسلامی کی رو سے مقرر کی جاتی تھی اور اس میں قتل و سرقہ کے علاوہ قمار بازی، شراب خواری و بدکاری وغیرہ وہ اخلاقی جرائم بھی قابل تعزیر مانے گئے ہیں جو نہ صرف موجب فتنہ و فساد ہیں بلکہ قوموں کی غیرت اور بعض اوقات نسل کو غارت کر دیتے ہیں۔ بایں ہمہ ان قوانین کا نفاذ صرف مسلمانوں پر ہوتا تھا اور بعض شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو رعایا کو ان کا پابند نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ ان کے بعض گروہوں میں یہ خرابیاں اس قدر بُری اور قابلِ تعزیر نہیں سمجھی جاتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ استثنا محض مذہبی رواداری پر مبنی تھا اور اسلامی حکومت اپنی رعایا کے عقائد و رواج کے خلاف اُسے کسی قانون کا پابند بنانا نہ چاہتی تھی۔ جمہوری حکومت میں "قانون" کی تعریف ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ جماعت یا جمہور کی منشا (Will of the community) کے مطابق ہو۔ ارباب حکومت اسی پر قوم کو چلانے کی خدمت انجام دیں اور ان کی ذاتی پسند یا ناپسند کا قانون میں دخل نہ ہو۔

ہندوؤں کے ساتھ رعایات

سیاسی طور پر دیکھئے تو ہندو رعایا کے ساتھ یہ بڑی رعایت تھی اور اس کے معنی یہ تھے کہ نہ صرف اپنے مقدمات کا فیصلہ کرنا بلکہ اپنے لیے قانون وضع کرنا بھی انھی کے ہاتھ میں تھا، اور انقلاب حکومت نے بجز اس کے کہ نظم و نسق میں تازہ قوت پیدا کر دی، نہ ان کی اندرونی آزادی میں کسی قسم کا فرق ڈالا نہ غیر حکومت کا کوئی ایسا بوجھ اُن پر رکھا جس کا برداشت کرنا ناگوار ہوتا۔ مذہبی معاملات میں بھی وہ بالکل آزاد تھے۔ ہر شخص کو اپنے عقائد اور عبادات کا اختیار تھا اور شروع ہی میں محمد بن قاسم نے علمائے دمشق سے فتویٰ منگوا لیا تھا کہ اُن کے

مندروں کے ساتھ وہی مراعات کی جائیں گی جو اسلام نے مسیحی اور یہودی معابد کو دی ہیں[1]۔ مگر اس سے کہیں بڑھ کر یہ رعایت تھی کہ ان کے مذہبی پیشواؤں کے قدیم امتیازات کو بحال رکھا اور مالگزاری میں تین فیصدی لینے کا جو حق پہلے ان کو حاصل تھا اس میں اب بھی کوئی کمی نہیں کی گئی اور یہ وہ رعایتِ خاص تھی جو پہلے سندھ کے برہمن راجہ ہی کے وقت میں ان کے ہم قوموں کو دی گئی تھی[2]۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب فاتحین مفتوحوں کے دل میں گھر کرنے کی تدابیر کو خوب سمجھتے تھے اور ان پر خلوص کے ساتھ عمل کرنے کی قابلیت رکھتے تھے کیونکہ گو یہ سب جانتے ہیں کہ رعایا کے ساتھ نرمی، محبت اور کامل اعتماد و مساوات کا سلوک ملک کے امن و رفاہ کی بہترین ضمانت ہے مگر عمل کے وقت ان شریفانہ اصول کو عام طور پر بھلا دیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہمیں خوشی ہوتی ہے جبکہ تاریخ سندھ میں جا بہ جا ہم ایسے ضوابط و آئین کا حال پڑھتے ہیں جو عربوں نے اپنی ہندو رعایا کی اجنبیت دُور کرنے کی غرض سے جاری کیے تھے۔ حجاج بن یوسف کے ہر خط میں تاکید ہوتی تھی کہ جو لوگ اطاعت قبول کریں اور جزیہ دیں، اُن کو ہر قسم کی آزادی دی جائے اور اُن کے ساتھ نرمی اور برابری کا سلوک مرعی رکھا جائے۔ خود محمد بن قاسم جہاں جاتا وہاں مفتوحین کو یہی پیغام سناتا اور اُن کے دل بڑھاتا تھا۔ رعایا کے دینی اور دُنیاوی سرگروہوں کو اس کی بار بار یہی تاکید تھی کہ "بے خوف و خطر رہو اور مسلمانوں سے جس قدر چاہو میل جول رکھو۔ اپنی فلاح و بہبود کی جو تدابیر مناسب سمجھتے ہو انھیں اختیار کرو تمھیں کوئی روکنے والا نہیں۔ اپنے مندر تعمیر کرو، اور جو تمھارے بزرگوں کی رسمیں ہیں ان کو برابر ادا کرتے رہو۔ اپنے غریب برہمنوں کے ساتھ مہربانی اور عزت سے پیش آؤ اور قدیم رواج کے موافق خیرات و زکوٰۃ میں اُن کا جو کچھ حق ہے وہ اُن کو دو[3]۔"

---

[1] - چچ نامہ مترجمہ الیٹ، جلد اول صفحہ ۱۸۶، فتوح البلدان ۴۳۹ھ۔

[2] - چچ نامہ صفحہ ۱۸۲ و ۱۸۳ و ۴۶۹ھ۔ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۰۔

[3] - چچ نامہ الیٹ جلد اول صفحہ ۱۸۶۔

رعایا کو خوش رکھنے کی سب سے کارگر تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ اُن کے محاصل کی تشخیص و تعیین اور وصول کا کام خود اُن کے مذہبی پیشواؤں (یعنی برہمنوں) پر چھوڑ دیا تھا۔ بعض بڑے اور تجارتی شہروں میں چند نامی سوداگروں کو منتخب کر لیا جاتا تھا کہ شہر کا مسلمان حاکم اُن سے مشورہ لیے بغیر کوئی کام نہ کرے۔ اہم ملکی مسائل میں رائے لینے کی غرض سے محمد بن قاسم نے راجہ داہر کے وزیر کو اپنے عہدے پر بحال رکھا تھا اور ہر معاملے میں اسی کی تجویز کے مطابق کام کرتا تھا۔[1]

محمد بن قاسم کے سبق آموز اقوال و ضوابط سے مذکورۂ بالا بیان کو اور طول دیا جا سکتا ہے مگر یہاں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور ہندوؤں کے ساتھ یہ مراعات جس بلند نظری اور فیاضی کی دلیل تھیں، اس کے دوسرے مظہر پر ایک نظر ڈالتے ہیں:۔

اسلامی اوقاف

اس سے ہماری مراد وہ فیاضی ہے جو حکومت عرب نے مساجد و مدارس یا اسی قسم کے دوسرے اوقاف قایم کرنے میں صرف کی تھی۔ ہر شہر یا چھاؤنی میں جہاں مسلمانوں کی کوئی جمعیت متعین کی جاتی تھی ایک مسجدِ جامع سرکار کی طرف سے تعمیر کر دی جاتی۔ موقع بہ موقع اُمرائے عرب بھی مسجدیں بنوا دیتے اور اُن کے مصارف کے واسطے بڑی بڑی جاگیریں وقف کر دی جاتی تھیں۔ یہ جاگیریں سرکاری محاصل سے بالکل مستثنیٰ تھیں اور ان کی آمدنی سے نہ صرف مساجد کی مرمت اور عام نگہداشت کا کام لیا جاتا تھا بلکہ اس کا زیادہ حصہ علماء اور طلبہ کے وظائف یا مسافروں کی مہمانی میں خرچ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ہر مسجد مستقل طور پر درس گاہ کا کام دیتی تھی اور اس میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔ ان اوقاف کی ٹھیک تعداد بتانی محال ہے لیکن اس بارے میں اسلامی حکومت کی فیاضی کا کچھ اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب انگریزوں نے ریاست سندھ پر قبضہ کیا تو وہاں کی کل مالگزاری کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی قسم کے مذہبی اوقاف میں

[1] چچ نامہ۔ الیٹ جلد اول صفحہ ۱۸۹ و ۴۶۹۔

صرف ہوتا تھا۔[1]

علم دفن

"علم الادیان" مسلمانوں کی نظر میں سب سے محبوب اور ضروری علم ہے اور عربی حکومت کے زمانے میں سندھ میں بھی دیگر ممالک اسلامی کی مثل اس تعلیم کو نہایت فروغ تھا۔ شام و عراق کے نامور اساتذہ یا وہاں کے سندیافتہ علماء یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے اور اسی ضمن میں فقہ، منطق، فلسفہ یا علم کلام اور صرف و نحو کی تعلیم دی جانے لگی تھی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخری سیاح علامہ **مقدسی** نے یہاں کے محدثین اور بعض صاحب تصنیف علماء کا اپنے جغرافیے میں ذکر کیا ہے۔ اور اس سے پہلے کے چند مشہور سندھی اساتذہ کا حال بھی مختلف کتابوں میں ملتا ہے مگر طوالت کے خوف سے ہم اس تفصیل کو قلم انداز کرتے ہیں۔ تاہم خاص طور پر توجہ دلانے کی بات یہ ہے کہ اس تعلیم میں اخلاقی تربیت کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں جا بہ جا عمل صالح کی تاکید کی گئی ہے اور اس زمانے میں جس قدر نامور علماء اور ائمہ دین گزرے وہ بھی مسائل الٰہی میں فلسفیانہ موشگافی یا منطق کے دقیق مباحث کو زیادہ وقعت نہ دیتے تھے بلکہ عمدہ اخلاق اور اچھے اعمال ان کے نزدیک تحصیل علم کا صحیح معیار تھے۔ دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے لیے تقویٰ اور سنتِ نبوی (علیٰ صاحبہا صلوٰۃ) کی عملی پابندی مقدم شرط سمجھی جاتی تھی۔

اس طرح، اگر عربوں کی جنگی قوت نے سندھ کے بڑے بڑے قلعے سر کیے تو ان کے عمدہ اخلاق و اوضاع نے اہل سندھ کے دلوں کو مسخر کر لیا چندہی روز میں یہاں کے لوگ اُن سے ایسے گھل مِل گئے کہ سندھ کے اصلی اور عربی باشندوں میں تمیز نہ ہوتی تھی۔ مذہبی طور پر بھی اگرچہ بُت پرستی کا ان میں رواج تھا مگر یہ لوگ بودھ مت کے نام لیوا تھے اور اس کی اخلاقی تعلیم اسلام سے ایک قسم کی مناسبت رکھتی ہے۔ لہٰذا ان کے رئیس و راجہ یا مذہبی پیشواؤں کو توحید کا

[1] ۔ الیٹ جلد اول صفحہ ۴۶۲۔

مذہب قبول کرنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ اور سندھ کے لوگ جوق جوق مسلمان ہونے لگے۔ بلکہ مولف عجائب الہند کی روایت صحیح ہو تو ہندوستان کی زبان میں ایک کشمیری راجہ ہی کی فرمائش سے قرآن مجید کی سب سے پہلی تفسیر کی گئی[1] جس کے معنی یہ ہوئے کہ (تیسری صدی ہجری میں) سندھ سے باہر اسلام کا اثر پھیلنے لگا تھا۔ سرحد کابل کے ایک خود مختار راجہ کے بطور خود اسلام لانے کی روایت بھی اس قول کی تائید کرتی ہے۔ اس راجہ کا بیٹا بہت بیمار ہو گیا تھا اور برہمنوں نے اپنے دیوتا کی طرف سے حکم لگایا تھا کہ وہ اچھا ہو جائے گا۔ لیکن یہ پیشین گوئی غلط نکلی۔ لڑکا مرگیا۔ راجہ نے بعض مسلمان سوداگروں کو بلا کر اسلام کے عقائد دریافت کیے اور مسلمان ہو گیا[2]۔

اسلامی مذہب و معاشرت کے اختیار کرنے سے اہلِ سندھ پر جو اثر پڑا اس کا مختلف زمانوں کے حالات پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے محمد بن قاسم نے جس وقت یہ ملک فتح کیا تو اس میں قومیں کی قومیں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ لوٹ مار پر اُن کا گزارہ تھا اور درندوں سے بدتر ان کی خصلت تھی چنانچہ سندھ کے برہمن راجہ نے بعض کے متعلق نہایت شدید قوانین جاری کیے تھے اور ادنیٰ چوری کے جرم پر ملزم کے زن و بچہ تک کو جلوا دیتا تھا[3]۔ مگر دو تین صدی کے بعد یہی جاہل وحشی ہمیں نہایت شائستہ شہری نظر آتے ہیں جو مقدسی اور ادریسی کے بقول صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت میں ہنرمند پیشہ ور اور اپنے حاکموں کی خوش اطوار و متمدن رعایا بن گئے تھے۔ آج بھی جبکہ اِدھر جہل و افلاس اور اُدھر مغربی تمدن اُن کے سادہ اخلاق کو بگاڑنے کے اسباب مہیا کر رہا ہے، سندھ کے لوگ جن میں ۷۶ فیصدی مسلمان ہیں

---

[1] ۔ عجائب الہند صفحہ ۳۔

[2] ۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۴۴۔

[3] ۔ چچ نامہ الیٹ جلد اول صفحہ ۱۸۶۔

باب ۱۳

اپنی دیانت و راست گفتاری میں مشہور ہیں۔[1]

تیسری فصل فتوحات عرب اور تاریخی واقعات کا خلاصہ

فتوحات مکران

قدیم مکران کی حدود جو خلیفۂ ثانیؓ کے عہد میں فتح ہوا[2] قریب قریب وہی تھیں جو موجودہ مکران کی ہیں۔ اور مختلف تاریخوں کو غور و احتیاط سے پڑھنے کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ موجودہ ریاست قلات و بلوچستان کا مشرقی ثلث اُن دنوں ریاست سندھ میں داخل تھا اور ابتدائی فتح کے بیس برس بعد یہی مشرقی ٹکڑا مسلمانوں نے تسخیر کر کے صوبۂ مکران میں جو پہلے فتح ہو چکا تھا شامل کر لیا اور اس وقت سے یہ نیا شامل کیا ہوا حصہ بھی جو پہلے "سندھ" کہلاتا تھا "مکران" کہلانے لگا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی قدیم اسلامی مورخوں نے صراحت نہیں کی اور جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ایلیٹ کو بہت پریشانی پیش آئی اور اُس نے کئی جگہ غلط قیاس کیا۔ ونسنٹ اسمتھ نے بھی جس مکران کو (بلوچستان کے نام سے) سندھ کی برہمن سلطنت کا صوبہ بتایا ہے، وہ حقیقت میں موجودہ بلوچستان کا یہی مشرقی ٹکڑا ہے جو عربوں نے سندھ کے راجہ سے چھین کر اپنے مفتوحہ مکران میں ملا لیا تھا۔

یہ فتح **امیر معاویہؓ** کے زمانے میں ہوئی۔ اس سے پہلے وہ عربی سیلاب جس نے ساسانی تاجدار کو اپنے آبائی مُلک سے باہر دھکیل دیا، کوہستان مکران کی

---

[1] ۔ گزیٹیر جلد ۲۲، صفحہ ۴۰۸۔

[2] ۔ اسی فاروقی عہد اور نیز بعد میں سواحل ہند اور سندھ پر جو تاختیں عربوں نے کی تھیں اُن کا اجمالی حال ہم اپنی پہلی تاریخ ہند (برائے میٹرک ایس) بیان کر چکے ہیں (صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۴)۔

باب ۱۲

وادی کیچ (عربی: کوج) تک آکر رک گیا تھا کیونکہ یزدجرد کے خیر خواہ ایران میں جا بہ جا بغاوتیں کر رہے تھے اور عربوں کی نئی حکومت کو انھیں فرو کرنے میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ فتح ایران کی تکمیل خلیفۂ ثالث‌ؓ کے عہد میں ہوئی اور اسی وقت مسلمانوں کو آگے بڑھنے کی فرصت ملی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کے تھوڑے دن بعد مسلمانوں میں باہمی نزاع پیدا ہو گئی اور اس فرقہ بندی نے کئی سال اُن کو غیر متحد رکھا۔ حتیٰ کہ ۴۱ھ ۶۶۱ء میں قریب قریب تمام اسلامی ممالک دوبارہ ایک فرماں روا کی اطاعت پر متفق ہو گئے۔

اس شیرازہ بندی کے بعد اسلامی فوجوں نے پھر ہر طرف پیش قدمی شروع کی اور اسی سلسلے میں بلوچستان کی مذکورۂ بالا فتح، اور قندھار و کابل کے کوہستانی علاقوں پر جو ان دنوں ہندوستان ہی میں داخل سمجھے جاتے تھے، فوج کشی عمل میں آئی۔ ان لڑائیوں کے لیے سیستان و مکران گویا فوجی مرکز بنا دیے گئے تھے جہاں سے عربی فوجیں مشرق کی جانب بڑھائی جاتی تھیں۔ عربی تاریخوں میں انھی ”ہندوستان کی مہمات“ کے حالات ہیں جن کے پڑھنے سے بعض اوقات طرح طرح کے مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی زمانے کا عرب شاعر (ابن مفرّغ) کہتا ہے:—

کم بالجروم و ارض الھند من قدم
و من سرائنک[1] قتلی لا ھم قبروا

یعنی سرزمین ہند اور ممالک گرم میں ہمارے بہت سے نقش قدم اور بہت سے وہ دلیر شہید پڑے ہیں جن کی قبریں تک نہ بنیں۔ ”ہند“ اور ”ممالک گرم“ سے شاعر کی

[1] فتوح البلدان مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں، جو مشہور مستشرق ڈی گیژی کے زیر اہتمام یورپ میں چھپی ہے یہ لفظ اسی طرح درج ہے اور ذیلی حاشیے میں صراحت کی گئی ہے کہ قلمی نسخے میں ”سرائل“ تحریر تھا جسے فارسی لفظ ”سرہنگ“ کی معرب جمع ”سرائنک“ سمجھا گیا۔ (فتوح البلدان صفحہ ۴۳۴)۔

مُراد بظاہر وہی کابل و بلوچستان کے علاقے ہیں جہاں امیر معاویہؓ کے عہد میں بار بار فوج کشی اور بعض فتوحات ہوئیں۔

ان چھوٹی چھوٹی مہمات کے حالات لکھنے یہاں ناموزوں ہوں گے۔ دوسرے سچ پوچھیے تو یہ بیرون ہند کی لڑائیاں تھیں۔ ہندوستان کی حدود میں خاص ریاست سندھ پر کوئی حملہ نہ ہوا تھا۔ کرنل ٹاڈ جس نے غیر معتبر افسانوں کو "وقایع راجستان" کا پُرشکوہ لقب دیا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے کہ ۶۵ھ (۶۸۴ء) میں مسلمانوں نے سندھ کے راستے راجپوتانے پر بھی حملہ کیا تھا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں خلافت اموی اندرونی لڑائیوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ اور مروان یا عبدالملک کو اپنی تخت نشینی کے وقت (۶۵ھ / ۶۸۴ء) اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ کسی بیرونی ملک پر فوج کشی کا خیال کرتے۔ غرض ٹاڈ کی روایت الیٹ کے الفاظ میں محض "لایعنی اور مصنوعی ہے"۔[1]

سندھ پر فوج کشی

جب عبدالملک نے اپنے مخالفوں پر غلبہ پایا اور عراق و ایران کی حکومت حجاج بن یوسف ثقفی کو تفویض ہوئی تو اُس وقت بھی خود مسلمانوں کو ریاست سندھ پر حملہ کرنے کا خیال نہ تھا لیکن دو اتفاقی واقعات نے جن کا پہلی فصل میں ذکر آچکا ہے حجاج کی توجہ ادھر منعطف کر دی اور اس نے دیبل کے بحری قزاقوں کی سرکوبی کے لیے خلیفہ ولید بن عبدالملک (۸۶ھ / ۷۰۵ء تا ۹۶ھ / ۷۱۵ء) سے ملک سندھ پر فوج کشی کی اجازت طلب کی۔

ولید کو ایسے بعید و غیر آباد ملک پر حملہ کرنا پسند نہ تھا، مگر حجاج کے اصرار اور المضاعف خراج ادا کرنے کے اقرار پر اس نے بادل ناخواستہ منظوری دے دی اور حجاج نے عبیداللہ بن نبہان کو، اور جب وہ ناکام ہوا تو پھر بُدیل بجلی کو بھیجا کہ دیبل اور جنوبی سندھ کو فتح کرے۔ مگر لڑائی میں بدیل کام آیا اور بہت سے مسلمان سپاہی گرفتار ہو گئے، حجاج نے قسم کھائی کہ اس ہزیمت کا سخت انتقام لیے بغیر

---

[1] الیٹ۔ جلد اول صفحہ ۴۲۶۔

باب ۱۳

نہ رہوں گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس پچھلی جنگ میں نیرون[ل] کے لوگ بھی شریک تھے اور گو انھیں فتح حاصل ہوئی لیکن عربوں کی فوجی قوت کا انھیں اندازہ تھا۔ یہ اتفاقی کامیابی ان کے آیندہ خوف کو زائل نہ کر سکی اور انھوں نے اپنے شہر کی طرف سے حجاج کو صلح کا پیام دیا اور اقرار کیا کہ اگر عرب نیرون کو اماں دینے کا معاہدہ کریں تو یہاں کے لوگ باقاعدہ خراج ادا کرتے رہیں گے۔ حجاج نے یہ شرط منظور کر لی اور اسی کے ساتھ ایلچی کو جتا دیا کہ اگر مسلمان قیدیوں کو صحیح سالم نہ چھوڑ دیا گیا تو اہل سندھ سے کہہ دینا کہ سرحد چین تک کسی غیر مسلم کو امان نہ دی جائے گی۔ لیکن دیبل کے لوگوں کو اس غضبناک ارادے کی اطلاع ہوئی بھی تو بظاہر انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور قلعہ بند ہو کر جنگ کرنے کا انتظام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ محمد بن قاسم اپنی تازہ مہم لے کے سندھ میں داخل ہوا اور چند ماہ کے محاصرے کے بعد یہ مستحکم شہر فتح ہو گیا (رجب؟ ۹۳ھ ۱۲/۶ء)۔

پچھلی قزاقی اور لڑائیوں کا غصہ سمجھیے یا اتنے دن تک محاصرے کی جھنجلاہٹ، غرض اسلامی فوجیں سیڑھیاں لگا کے جب شہر میں گھسیں تو انھوں نے کسی لڑنے والے کو امان نہ دی اور تین دن تک دیبل کے کوچہ و بازار میں شدید خوں ریزی ہوتی رہی۔ چچ نامے میں اس کشت و خون کا حال تفصیل سے لکھا ہے مگر بعض روایتیں متناقض اور ضعیف الاعتبار

[ل]۔ اکثر فارسی اور بعد کے انگریز مصنف اور جغرافیہ نویس متفق ہیں کہ نیرون موجودہ حیدر آباد سندھ کا قدیم نام ہے اور اس شہر میں اب تک اس نام کا قلعہ موجود ہے۔ مگر سر ہنری الیٹ کو گویا ضد ہو گئی ہے کہ اس قول کو غلط ثابت کیا جائے۔ ان کے نزدیک یہ "نیرون" موجودہ حیدر آباد سندھ سے پینتیس ۳۵ میل جنوب میں قصبۂ جرک کے قریب وہاں آباد تھا جہاں اب قصبۂ ہلائی واقع ہے۔ خود حیدر آباد کو وہ قدیم منصورہ کا قایم مقام سمجھتے ہیں۔ (الیٹ، جلد اول صفحہ ۴۰۰ وغیرہ)۔

نظر آتی ہیں۔ بہرحال، اگر دیبل میں فاتح نے حجاج کے انتقام کی قسم پوری کی تو اور جس جگہ وہ گیا مہربانی اور امن کا پیام لے کر گیا اور جس قوم یا شہر یا سردار نے امان مانگی اور اطاعت قبول کی اس کے ساتھ محمد بن قاسم نے بلا استثنیٰ نہایت نرم شرطوں پر مصالحت کر لی۔

غالباً اسی سال رمضان کے مہینے میں داہر والی سندھ سے بہت بڑی لڑائی ہوئی۔ اس راجہ کی طاقتوری اور شجاعت کے قصے فارسی تاریخوں میں لکھے ہیں لیکن لڑائی میں اُس کی فوجوں کو شکست ہوئی اور وہ خود مارا گیا۔ اس کا پائے تخت اروڑ یا الرور (الور) فتح ہو گیا اور مسلمانوں کو آیندہ بھی قریب قریب ہر لڑائی میں کامیابی حاصل ہوئی۔

محمد بن قاسم کی فتوحات

اُن تمام لڑائیوں کے حالات لکھنا، جو راجہ کے پس ماندوں یا مختلف نیم آزاد رئیسوں سے ہوتی رہیں، بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔ دوسرے اُن کے مقامات کا اب پتا چلانا کوہ کندن و کاہ بر آوردن سے کم نہیں۔ عربی تاریخوں نے اس بارے میں نہایت اجمال سے کام لیا ہے اور فارسی تاریخوں کو پڑھ کر سخت اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے اور صاف صاف کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محمد بن قاسم کس راستے سے کہاں کہاں گیا۔ چچ نامہ کی تحریر کے بموجب، اُس نے ایک طرف کشمیر کی کوہستانی سرحد تک اور دوسری طرف قنوج تک تمام علاقے فتح کر لیے تھے۔ اور سر ہنری الیٹ بھی ان فتوحات کو ماننے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ قنوج سے ریاست قنوج کا علاقہ مراد لیا جائے جو اُن دنوں اجمیر کے قریب تک پھیلا ہوا تھا۔[۱] مگر بلاذری نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم ملتان فتح کر چکا تھا کہ اس کو حجاج کے وفات پانے کی اطلاع ملی اور وہ ملتان سے واپس الرور چلا آیا۔[۲]

---

[۱] ۔ الیٹ۔ جلد اول صفحہ ۴۳۴ تحفۃ الکرام کے مؤلف نے بھی سرحد قنوج ہی لکھا ہے۔ (جلد سوم صفحہ ۲۲)۔

[۲] ۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۴۔

باب ۱۱

راقم الحروف کے نزدیک زیادہ صحیح یہی آخری قول ہے لیکن فتح ملتان کے معنی یہ ہیں کہ مشرق میں دِپالپور اور شمال میں شہرِ جہلم تک وہ تمام علاقہ جو اُن دنوں سلطنتِ سندھ میں داخل تھا اور اب کل پنجاب کا تقریباً نصف مغربی حصہ ہے، محمد بن قاسم یا اُس کے نائبین فتح کر چکے تھے اور جنوب مشرق کی طرف بھی موجودہ ریاست بہاولپور اور راجپوتانے کا کچھ شمالی ٹکڑا اُن کے قبضے میں آگیا تھا۔ کیونکہ اس بارے میں تمام قرائن چچ نامے کے مؤید نظر آتے ہیں کہ راجہ داہر کی قلمرو کی حدود یہی تھیں[1]۔

اوصافِ ذاتی

اِن فتوحات کے وقت محمد بن قاسم کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ جب وہ شیراز سے فوج لے کر سندھ پر بڑھا تو سترہ سال یا اس سے بھی کچھ کم عمر کا لڑکا تھا۔ شاعر کہتا ہے:۔

ساس الرجال لسبع عشرۃ حجۃ
ولداتہ عن ذاک فی اشغال

(اس کے ساتھ کے لڑکے کھیلنے میں رہے اور اُس نے سترہ برس کی عمر میں مردانِ جنگ پر حکومت و سرداری کی) اور اُس سرداری کے زمانے میں کئی بڑی بڑی لڑائیاں جیتیں، قلعے سر کیے اور جدھر گیا اپنی جنگی قابلیت اور شجاعت سے فتح پائی۔ اس کے ان سپاہیانہ اوصاف کے سامنے سکندر اعظم کی سپہ سالاری بے وقعت ہوئی جاتی ہے جس نے ایک ہزار برس پہلے انہی ممالک پر کہیں زیادہ فوج اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ فوج کشی کی تھی۔ مگر یہاں اس کی سپاہیانہ صفات اور سہ سالہ سندھی فتوحات کا صرف اُن فتوحات سے مقابلہ کرنا منظور ہے جو سکندر اعظم نے ہندوستان میں پائی تھیں۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کو اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملا ورنہ الیٹ کو اعتراف ہے کہ حجاج کے حکم کی تعمیل میں ممالک ہند کو فتح کرتے ہوئے چین تک اس کا پہنچ جانا کوئی ناممکن بات نہ تھی[2]۔

---

[1] تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۸۔ نیز دیکھو الیٹ جلد اول صفحہ ۱۴۰ بحوالۂ چچ نامہ، تاریخ سندھ وغیرہ۔
[2] الیٹ۔ صفحہ ۴۳۴۔

اس کی جوانی، ہردلعزیزی اور مسلسل فتوحات اس کی اولوالعزمی کو تقویت پہنچا رہی تھیں اور ممالک مفتوحہ کا جس خوبی سے اُس نے انتظام کیا وہ نہ صرف بجائے خود تعجب انگیز ہے بلکہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ درحقیقت محمد بن قاسم کو خدا نے بڑے بڑے مُلک فتح کرنے کی قابلیت عطا فرمائی تھی۔ اس بارے میں ہماری تمام تاریخیں متفق ہیں کہ اس نے اہل سندھ کے ساتھ نہایت نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کیا۔ اُن کے پہلے رسم و رواج اور آئین میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جو اُنھیں ناگوار، یا فاتحین کی زبردستی معلوم ہوتی۔ قلعوں اور شہروں میں عربوں کی فوجیں اس قدر باموقع متعین کی گئی تھیں کہ تین سال کے اندر ہی اندر مُلک میں امن و امان قایم ہو گیا۔ رعایا کی رفاہ و خوش حالی کے آئین جاری ہوئے اور یہ نوجوان سندھ کے لوگوں میں نہایت محبوب و محترم سمجھا جانے لگا۔ مورخ بلاذری، جس کا محققانہ اختصار اس قسم کے واقعات بیان کرنے کی بہت کم اجازت دیتا ہے، لکھتا ہے کہ جس وقت محمدؔ بن قاسم معزول و گرفتار ہو کر ایران بھیجا گیا تو "اہل ہند اُس کے لیے روئے اور کیرج کے باشندوں نے اس کی مُورت بنائی"[۱]۔ حمزہ بن بیض دو شعروں میں اس کی خوبیوں کا احاطہ کرنا چاہتا ہے:-

ان المروۃ والسماحۃ والندیٰ ۔۔۔ لمحمد بن القاسم بن محمد

ساس الجیوش لسبع عشرۃ حجۃ ۔۔۔ یا قرب ذلک سودداً من مولد

مگر اس کی بے تعصبی، ہردلعزیزی اور انتظامی قابلیت کا شاید سب سے عمدہ ثبوت یہ ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں اُس نے خود سندھ کے باشندوں کی ایک فوج کثیر فراہم کر لی تھی اور ان فوجوں کے علاوہ جو چھاؤنیوں میں جابجا مقیم تھیں پچاس ہزار تازہ دم سپاہی ملتان میں جمع ہو گئے تھے کہ حکم ملتے ہی شمال و مشرق کی طرف کوچ کریں[۲]۔

---

[۱] - فتوح البلدان صفحہ ۴۴۴۔

[۲] - تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۲۔ الیٹ۔ صفحہ ۴۳۵۔

باب ۱۳

گرفتاری اور قتل

اس نئی مُہم کی تیاریاں غالباً مکمل ہو چکی تھیں کہ محمد بن قاسم کو پہلے حجاج اور پھر خلیفہ ولید بن عبد الملک کے انتقال کی خبر ملی۔ سلیمان بن عبد الملک جو حجاج کے خاندان کا مخالف تھا، تخت نشیں ہوا (۹۶ھ تا ۹۹ھ ۷۱۷ء) اور اُس نے عمداً صالح بن عبد الرحمٰن کو والیِ عراق مقرر کیا۔ اس شخص کے بعض رشتہ داروں کو حجاج نے مروا دیا تھا، اور اسی کے انتقام میں اس نے "آلِ ابی عقیل" یعنی حجاج کے کنبے کے افراد کو چُن چُن کے قتل کیا اور اسی سلسلے میں یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو والی سندھ بنا کر حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو قید کر کے بھیجا جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور سندھ کے نوجوان فاتح نے خاموشی سے اپنی گردن جھکا دی اور اسی حلم و اطاعت گزاری میں اپنی حیرت انگیز جواں مردی کا وہ نقشہ چھوڑ گیا جو اہلِ بصیرت کے نزدیک اس کی تمام فتوحات کی یاد سے زیادہ پائیدار ہے۔ مورخ بلاذری نے اُس کے چند شعر نقل کیے ہیں جن میں محمد بن قاسم دعویٰ کرتا ہے کہ اگر میں جنگ و مدافعت پر آمادہ ہوتا تو ایک فوج کثیر میرے لیے اپنا خون بہانے پر تیار ہو جاتی اور کسی "سکسکی" کی مجال نہ ہوتی کہ مجھے اس طرح گرفتار کر لیتا[1]۔

محمد بن قاسم عراق عجم کے شہر واسط میں قید کیا گیا تھا اور وہیں قتل ہوا۔ خود کہتا ہے:۔

"فلئن ثویتُ بواسط وبارضها رَهن الحدید مکبلاً مغلولا" الخ

اور یوں بھی معزولی و قتل کی مذکورۂ بالا روایت میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں نظر آتی لیکن چچ نامہ نے اس کے متعلق عجیب افسانہ لکھا ہے جسے میر معصوم نے اور بھی رنگین بنا دیا۔ بعد کے فارسی مورخ بھی اسی کو نقل کرتے رہے اور گو سر ہنری الیٹ پہلی روایت ہی کو قرینِ صحت جانتے ہیں[2]۔ لیکن ہمارے زمانے کے اکثر انگریز مصنف اس معاملے میں ان کی پیروی کرنی نہیں چاہتے

[1] ۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۴۱۔

[2] ۔ الیٹ صفحہ ۴۳۷۔

باب ۱۳

بلکہ اسی افسانے کو طرح طرح سے لکھتے ہیں جس میں عرب تاجدار کی بدنامی کا پہلو نکلتا ہے۔[۱]

آیندہ فتوحات جنید

بہرحال محمد بن قاسم کا جانشین یزید سکسکی ولایت سندھ کو اس کے فاتح سے لینے کے بعد کچھ زیادہ دن نہ جیا اور آیندہ نو سال تک جو عرب والی مقرر ہوئے وہ بھی یا تو سندھ کے

لہ۔ اس افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ "سندھ کی غنیمت میں راجہ داہر کی دو ناکتخدا لڑکیاں بھی گرفتار ہو کر خلیفہ ولید کی خدمت میں روانہ کی گئی تھیں اور جب خلیفہ نے انھیں حرم میں داخل کرنا چاہا تو انھوں نے بیان کیا کہ محمد بن قاسم ان کی عصمت دری کر چکا ہے۔ خلیفہ نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو زندہ بیل کی کھال میں سی کر دمشق لایا جائے اور جب اس حالت میں اس کی لاش پہنچی اور ان لڑکیوں کو دکھائی گئی تو انھوں نے خلیفہ کی جلد بازی پر اسے تنبیہ کی اور کہا کہ ہم نے اپنے باپ کے قتل کا محمد بن قاسم سے انتقام لینے کی غرض سے یہ بات بالکل جھوٹ بنالی تھی۔ یہ سن کر خلیفہ نے بہت پیچ و تاب کھایا اور ان لڑکیوں کو سخت عقوبتوں سے قتل کرا دیا۔" مگر (لین پول صاحب لکھتے ہیں) کہ یہ دوسرا جرم پہلے کی کوئی تلافی نہ کر سکتا تھا" (مڈیویل انڈیا صفحہ ۱۱) عجیب بات یہ ہے کہ لین پول صاحب اس واقعے کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ محمد بن قاسم کی موت ولید کے جانشین کے زمانے میں ہوئی! اور یہی امر اس تمام افسانے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ میر معصوم و بچ نامے کے مؤلف یا مترجم اس بات کا صاف صاف ذکر ہی نہیں کرتے کہ محمد بن قاسم کو کس سنہ میں اور کس خلیفہ کے حکم سے یہ سزا دی گئی تھی کیونکہ اگر وہ اس قدر غور اور تحقیقات کو گوارا کرتے تو پھر اس کہانی کا بے سر و پا ہونا خود بہ خود ظاہر ہو جاتا۔ باقی دیگر فرسی یا انگریز مصنفوں کے متعلق جنھوں نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اس واقعے پر مفصل بحث کی ہے اور متعدد عربی تاریخوں کے حوالے سے اس کا فرضی ہونا ثابت کیا ہے۔ (دیکھو ان کی تاریخ سندھ حصہ اول)۔

باب

بعض سرکش رئیسوں کی بغاوتیں فرو کرنے میں مصروف رہے اور یا قومی تنازعات نے اُن کو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ سندھ و ہند کے معاملات پر زیادہ توجہ کر سکتے۔ البتہ جب جنید بن عبد الرحمٰن المری اس عہدے پر مامور ہوا (۱۰۵ھ/۷۲۴ء) تو محمد بن قاسم کی کشور کشائی کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس کی فتوحات کا اثر گو زیادہ پایدار نہ ثابت ہوا، لیکن ان کا دائرہ محمد بن قاسم کی فتوحات سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ سندھ کی اندرونی شورشوں کو فرو کرنے کے بعد سب سے پہلے اُس نے کیرج پر فوج کشی کی۔ اس مقام کو سر ہنری الیٹ کچھ کا کوئی قدیم شہر قرار دیتے ہیں لیکن جیسا کہ خود اُن کا قیاس ہے وہ منڈل کے قریب ہوگا، جس پر جنید نے کچھ روز بعد حملہ کیا تھا۔ اور یہ منڈل ان کے نزدیک راجپوتانے کا قدیم "منڈور" یا علاقہ جھالاوار کا شہر ہے[1]۔ اسی آخری قیاس کی بنا پر راقم الحروف کا خیال ہے کہ عجب نہیں "کیرج" سے مراد وہ علاقہ ہو جسے آج کل "کان کرج" کہتے ہیں اور جس کی پرانی راجدھانی کے کھنڈر آج بھی اُس کی گزشتہ وسعت کی شہادت دیتے ہیں[2]۔ دوسرے یہی علاقہ جو موجودہ ریاست پالن پور کے متصل، سندھ و گجرات کے درمیان ہے، قدرتی طور پر سب سے پہلے سندھ کے عرب والی کی زد میں آیا ہوگا۔ اور اسی فتح کے بعد اس کی فوجیں "مرمد" "مندل" "دھنج" اور "بروص" کی طرف بڑھی ہوں گی۔ ان مقامات پر بظاہر مستقل قبضہ کر کے، اُس نے حبیب بن مرہ کی سرداری میں ایک فوج مالوے پر بھیجی جس نے اجین تک تمام ملک پامال کر دیا، اور خود "جندر" اور "بیلمان" کو فتح کیا[3]۔

ان عربی ناموں میں صرف "دھنج" ایسا مقام ہے جس کا ٹھیک پتا نہیں چلتا اور "بیلمان" کو سر ہنری الیٹ، چچ نامہ اور بیگ لار نامہ کے حوالے سے "بیلما"

---

[1] ۔ الیٹ، جلد اول صفحہ ۳۹۱۔

[2] ۔ گزے ٹیر، جلد ۱۴ صفحہ ۳۰۳۔

[3] ۔ فتوح البلدان ۴۴۲۔ الیٹ ۴۴۲۔ تاریخ سندھ مولانا ندوی جلد دوم صفحہ ۲۹ (بحوالۂ یعقوبی)۔

بتاتے ہیں جو سندھ و جیسلمیر کے درمیان کے علاقے کا نام تھا۔ "مرید" سے مارواڑ مراد ہے اور "بروص" موجودہ بھڑوچ ہے باقی "جذر" (یا جرز) کو گجرات کا معرب سمجھنے میں کوئی دقت نہیں نظر آتی اور الیٹ کی تاریخ کے فاضل اڈیٹر پروفیسر ڈوسن کا بھی نتیجۂ تحقیقات یہی ہے[1]۔ جنید کی یہ فتوحات اگرچہ عارضی تھیں لیکن اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے مختصر عہد میں (۱۰۵ھ/۷۲۴ء تا ۱۰۷ھ/۷۲۶ء) تمام شمال مغربی ہندوستان پر عرب چھا گئے تھے۔ افسوس ہے کہ عربی تاریخوں میں ان ہندی فتوحات کا بہت مجمل ذکر ملتا ہے کیونکہ ان میں خود سندھ اور یہاں کے والیوں کے حالات ضمناً آجاتے ہیں ورنہ وہ سب خلفائے دمشق و بغداد یا بعد کے خود مختار اسلامی سلاطین کا حال سناتی ہیں۔ یہی کیفیت اُن فارسی تاریخوں کی ہے جو بعد میں سلاطین غزنی یا شاہانِ دہلی کے حالات میں لکھی گئیں کہ ان میں سندھ کے عرب والیوں کے متعلق بہت سرسری معلومات جمع کرنے پر اکتفا کردی گئی ہے بلکہ اس بارے میں ابوالقاسم فرشتہ اور ابوالفضل جیسے سلیقہ مند مؤلفین نے بھی سخت بے پروائی سے کام لیا ہے اور جابجا غلطیاں کی ہیں۔

مگر اسے محض تائید غیبی سمجھنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا فتوحات عرب کی شہادت ہمیں خود راجپوتوں کے گیتوں اور قصوں سے ملتی ہے۔ ان منظوم یا غیر منظوم فسانوں کی بجائے خود تاریخی وقعت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، اُن سے ایک یقینی نتیجہ نکلتا ہے، جسے ہم قوم راجپوت کے مداح کرنل ٹاڈ کے الفاظ میں نقل کریں گے:

> "اس تمام زمانے میں (جس سے (۷۵ھ/۶۹۴ء تا ۱۰۵ھ/۷۲۴ء) مراد ہے) ہندو اقوام کے اندر ہل چل نظر آتی ہے اور کوئی نامعلوم حملہ آور اُن کی حکومتوں کو جابجا درہم برہم کیے ڈالتا ہے۔ اس حملہ آور کی آمد کبھی تو سندھ کی طرف سے بیان کی جاتی ہے اور کبھی سمندر سے اور جابجا اُسے 'دیو' یا جادوگر کے نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[1] الیٹ صفحہ ۳۵۸۔

مگر بہر صورت، وہ (فاتح) "ملیچھ" یعنی غیر قوم کا آدمی تھا بسمت ۷۵۰ سے ۸۰۷ تک (مطابق سنین ہجری مذکور) جادو، چوہان، اور گہلوٹ خاندانوں کی "تاریخیں" اپنی اپنی جگہ انھی انقلابات کی گواہی دیتی ہیں.... ٹھیک یہی زمانہ ہے جبکہ خراسان میں خلیفہ کا نائب یزید تھا اور ولید کی فوجیں دریائے گنگا تک ممالک ہند فتح کر رہی تھیں۔ غرض اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہندو راجاؤں کے خاندانوں میں مذکورۂ بالا انقلابات کا اصلی باعث یزید تھا، یا قاسم اور چتوڑ اور موڑی کو بچانے کے لیے جو راجہ جمع ہوئے تھے اُن کے ناموں کی فہرست بھی اسی نتیجے کی تائید کرتی ہے....."[1]

جنید کے جانشین

سر ہنری الیٹ نے چینی تاریخوں سے بھی ان عربی فتوحات کی شہادت فراہم کی ہے[2] مگر معلومات کے اس ماخذ سے ہم خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے۔ بہرحال جنید کے عہد میں عرب جس قدر دُور تک بڑھے تھے پھر نہ بڑھ سکے کیونکہ جب یہ بہادر و اقبال مند والی ترقی پا کر خراسان کا حاکم مقرر ہوا تو اس کی جگہ تمیم بن یزید کو سندھ بھیجا گیا جو نہایت بے پروا اور سُست حاکم تھا۔ عربی شاعر فرزدق کی ایک منظوم درخواست کی تعمیل کر دینے کی بدولت اس کا نام فیاضانِ عرب میں شمار ہوتا ہے لیکن اُس کے عہد میں غالباً اکثر بعید علاقے جنھیں جنید نے فتح کیا تھا، مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئے۔[3]

بظاہر یہی تمیم ہے جسے الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں محمد بن قاسم کا جانشین بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:-

خلافت اموی کے خاتمے یعنی تقریباً چھتیس برس تک

۱۔ اینلز اوف راجستھان۔ جلد اول صفحہ ۲۰۲۔

۲۔ صفحہ ۴۴۲۔

۳۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۴۳۔

سندھ کی حکومت اسی تمیم کی اولاد میں رہی اور پھر ایک بغاوت میں، جس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں، سومرہ قوم کے راجپوتوں نے مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا اور ان کے تمام مقبوضات ہندوؤں کے قبضے میں آگئے جو یہاں پانچ سو برس تک حکمراں رہے۔[۱] "بہ الفاظ دیگر الفنسٹن صاحب عربوں کی تقریباً تین صدی کی حکومت چند سال اور چند لفظوں میں ختم کیے دیتے ہیں، حالانکہ تاریخ فرشتہ میں جس کا انھوں نے حوالہ دیا ہے نہ یہ عبارت مجھے ملی نہ سنین کا یہ تعین دوسرے اس مؤلف نے سندھ کا جہاں ذکر کیا ہے (مقالۂ ہشتم، روضۂ دوم) وہاں اپنی ناواقفیت کا کئی جگہ عذر کیا ہے کہ مجھے عربوں کی فتوحات اور اس کے بعد کے صحیح حالات کسی متداول و مشہور تاریخ (فارسی؟) میں نہ مل سکے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ عام انگریزی تاریخوں میں بھی جو حال میں لکھی گئی یا لکھی جارہی ہیں، اس بارے میں الفنسٹن ہی کی پیروی کی جاتی ہے اور ڈاکٹر ایلیٹ کی تاریخ کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس نے کمال محنت سے متعدد عربی اور فارسی کتابوں کے اجزا انگریزی میں ترجمہ کیے اور تاریخ سندھ پر خود ایک مستقل مضمون لکھ کر جلد اول کے اخیر میں شامل کر دیا ہے۔

القصہ تمیم کے بعد حکم اور پھر فاتح سندھ کا بیٹا عمر بن محمد قاسم ولایت سندھ پر مامور ہوا ان کے عہد میں بعض علاقے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے پھر ان کے قبضے میں آئے اور محفوظہ، منصورہ نامی شہروں کی بنیاد پڑی۔[۲] جس میں منصورہ نے بہت ترقی کی اور عرصے تک حکومت و تجارت کا مرکز رہا۔ محفوظہ کی جائے وقوع ایلیٹ کے قیاس کے مطابق وہاں سمجھنی چاہیے جہاں اب نصرپور آباد ہے اور

۱۔ تاریخ ہند مؤلفہ الفنسٹن صفحہ ۳۰۴۔

۲۔ فتوح البلدان صفحہ ۴۴۴۔ ادریسی نے اس شہر کو غلطی سے عباسی خلیفہ المنصور کے نام سے موسوم اور اسی کے عہد حکومت کی تعمیر بتایا ہے۔

منصورہ متعدد فتوحات کی یادگار ہیں[1] قدیم "برہمن آباد" کے قریب بسایا گیا تھا جس کے آثار قدیمہ حال میں کھود کر نکالے گئے ہیں۔

خلافت عباسیہ

یعقوبی کی روایت کے بہ موجب عمر بن محمد کا جانشین یزید بن عرار ہوا[2] (غالباً ۱۲۶ھ / ۷۴۴ء) تحفۃ الکرام اور تاریخ سندھ میں اس سے مختلف روایتیں بھی ملتی ہیں[3] اور اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ان دنوں اسلامی سلطنت میں اس انقلاب کا طوفان آگیا تھا جس نے آخر کار اموی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور عباسیوں نے اُن کی جگہ لی (۱۳۲ھ / ۷۵۰ء) امن وامان ہونے کے بعد جب اس خاندان کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر المنصور نے سندھ کا والی ہشام بن عمر التغلبی کو مقرر کیا (۱۴۲ھ / ۷۶۰ء)[4] تو مسلمانوں کی اس حکومت میں تازہ روح اور قوت پیدا ہوگئی۔ ہشام نے اندرونی شورشوں سے ملک کو پاک کر دیا اور شمال میں کوہستان کابل اور کشمیر تک کے بعض علاقے فتح کیے جو اب تک مسلمانوں سے مغلوب نہ ہوئے تھے۔ اسی طرح جنوب میں اس نے ایک بحری مہم گجرات کے مغربی ساحل پر روانہ کی اور "نربدا" کو فتح کیا۔ عربی تواریخ کی مجمل روایتوں سے اُس کی فتوحات کی حدود معین کرنا دشوار ہے لیکن خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق بات جس کے بیان کرنے میں قدیم وجدید مورخ متفق ہیں، یہ ہے کہ ہشام کے زمانے میں اسلامی حکومت کو کمال استحکام حاصل ہوا اور ایک اعتبار سے یہی وقت ہے جس میں سندھ صحیح معنی میں "اسلامی ملک" سمجھا جانے لگا۔

سندھ کی آزاد عربی ریاستیں

بعد کے تمام عرب والیوں کے نام اور حالات لکھنا سندھ کی مستقل تاریخ

---

[1] مولانا شرر۔ تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۳۸۔

[2] مولانا شرر۔ تاریخ سندھ حصہ دوم صفحہ ۱۴۔

[3] تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۳۔ ایلیٹ صفحہ ۴۴۲۔

[4] ایلیٹ نے بلکہ خود بلاذری نے اس کا سنہ لکھنے میں غلطی کی ہے۔ دیکھو تاریخ سندھ مولفہ شرر حصہ دوم صفحہ ۶۰۔

باب

لکھنے والے کا کام ہے۔ ان میں زیادہ شہرت شہر بیضا کے بانی عمران بن موسیٰ برمکی کو حاصل ہوئی جو ۲۲۱ھ (۸۳۶ء) میں والیِ سندھ مقرر ہوا تھا۔ اس جگہ صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ آئندہ ایک صدی میں جب تک عباسی خلفاء کی قوت بنی رہی، سندھ کا وسیع صوبہ بھی اُن کے والیوں کے ماتحت اچھی حالت میں رہا۔ بے شبہ اس اثنا میں کبھی یمانی اور نزاری عربوں کی شر انگیز عداوت نے اور کبھی فرقۂ اسمٰعیلیہ اور قرامطہ کی خوفناک سازش و شورش نے اس ملک کے امن و امان میں خلل ڈالا، بایں ہمہ مجموعی طور پر سندھی رعایا کی فلاح و سرسبزی میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ خلافت عباسیہ کی قوت میں زوال آنے کے بعد بھی جبکہ یہاں قریشی عربوں نے دو آزاد ریاستیں قایم کر لیں۔ سندھ کی اندرونی حالت بہت اچھی رہی جیسا کہ مورخ مسعودی اور بعد کے عرب جغرافیہ نویسوں کی تحریر سے ثابت ہے۔ یہ مورخ ۳۰۳ھ (۹۱۵ء) میں ہندوستان کی سیاحت کو آیا تھا اور گو اس نے بعض روایتیں بلا تحقیقات اپنی کتاب میں لکھ دی ہیں، لیکن اس کے زمانۂ سفر کے مشاہدات ہی ہمارے لیے کافی دلچسپ و کارآمد ہیں۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی سندھ میں اس وقت عبداللہ بن عمر ہباری کی موروثی حکومت قایم تھی اور اس کا صدر مقام شہر منصورہ میں تھا۔ شمالی سندھ کی ریاست زیادہ وسیع تھی۔ دارالحکومت ملتان، اور ابواللباب المنبہ وہاں کا فرماں روا تھا۔ ان قریشی النسب امیروں نے اپنی اپنی جگہ مستقل بادشاہی کے تمام لوازم مہیا کر رکھے تھے۔ اور بظاہر اسی عیش پسندی اور جاہ پرستی نے انھیں کسی دوسری طرف جنگی پیش قدمی کی فرصت نہ دی۔ دوسرے ان کی اور عام طور پر سندھ کے اکثر عرب متوطنوں کی نسلیں اب مخلوط ہو گئی تھیں اور ایک عرصے تک اس ملک میں رہنے کی وجہ سے اُن کے وطنی تعلقات کبھی کے منقطع ہو چکے تھے۔ سیاسی آزادی نے یقیناً اس علیٰحدگی کو اور تقویت پہنچائی ہوگی اور عراق و عرب کی تازہ جماعتوں کے آتے رہنے کا سلسلہ بھی بند نہیں تو کم ضرور ہو گیا ہوگا۔ غرض یہ اور دیگر اسباب جن کا ٹھیک پتا

چلانا دشوار ہے، ایسے پیش آئے کہ خلافت سے علیحدہ اور خود مختار ہونے کے بعد سندھ میں کوئی ایسی قومی سلطنت نہ بن سکی جیسی کہ ماوراء النہر یا شمالی ایران میں قایم ہوگئی تھی۔ ملتان و منصورہ بھی مل کر کبھی ایک متحد اور مستحکم ریاست نہ بنی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد انھی کا مغربی علاقہ چھین کر مکران اور اس کے شمال میں چار علیحدہ ریاستیں قایم ہوگئی تھیں جن میں عباسی خلفا کے نام کے ساتھ آل بویہ کے سلاطین کا نام بھی خطبوں میں پڑھا جاتا تھا[۱]۔

اسمٰعیلیہ اور قرامطہ

یہ اصطخری اور ابن حوقل کے زمانۂ سیاحت یعنی چوتھی صدی ہجری کے وسط کے حالات ہیں۔ اسی صدی کے اواخر میں جب علامہ مقدسی نے ان ممالک کا سفر کیا تو خلفائے بغداد کا یہ مذہبی تعلق بھی منقطع ہوگیا تھا اور ملتان میں علانیہ فاطمی خلفائے مصر کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یوں بھی اکثر مقامات میں مذہب قرامطہ و اسمٰعیلیہ کا زور بڑھتا جاتا تھا[۲]۔ چنانچہ آخر میں تمام سندھ کی حکومت انھی کے قبضے میں آگئی اور سلطان محمود غزنوی کے حملے کے وقت (۴۰۱ھ / ۱۰۱۰ء) وہ اس ملک میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔

یہ دونوں فرقے شیعہ مسلمانوں کی شاخیں ہیں لیکن ان کے بعض گروہ جمہور مسلمانوں سے اتنے سخت مذہبی اور سیاسی اختلافات رکھتے تھے کہ انھیں مسلمان سمجھنا دشوار ہے۔ اسی لیے چوتھی صدی ہجری میں جب اسمٰعیلیوں نے افریقہ میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی اور ادھر عراق و حجاز میں قرامطہ نے ہنگامہ بپا کیا تو کچھ عرصے کے لیے اسلام اور اسلامی ممالک کی حالت نہایت مخدوش نظر آنے لگی تھی اور یہ محض تقدیری امر تھا کہ اسمٰعیلیوں میں پہلے باہمی نفاق ہوا اور پھر ان کی سیاسی قوت زائل ہوگئی[۳]۔

۱۔ تاریخ سندھ، مولفہ مولانا شرر صفحہ ۱۲۱۔
۲۔ احسن التقاسیم صفحہ ۴۸۱ و ۴۸۵۔
۳۔ ان فرقوں کے عقائد اور سیاسی عروج و زوال کو، مولانا شرر نے اپنی

باب ۱۲ سومرہ اور سمہ

غرض اسی مذہب کے لوگ تھے جنھوں نے غزنوی سلطنت میں ضعف آنے کے بعد پھر سندھ پر تسلط کرلیا اور انھی کے حکمراں فرقے یا قبیلے کا نام تاریخ میں "سومرہ" ہے جن کو بعض فارسی مؤلفوں نے بے پروائی سے نومسلم راجپوت قرار دیا ہے اور بعد کے بعض انگریزوں نے خالص ہندو راجپوت لکھ کر مسلمانوں کی حکومت ہی کو سندھ میں ختم کر دیا ہے۔ لیکن اس بارے میں سب سے زیادہ قدر کے قابل مولانا شررؔ لکھنوی کی تحقیق ہے جنھوں نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ درحقیقت یہ لوگ یہودی النسل نومسلم تھے جنھوں نے عراق سے آکر سندھ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور قرمطی مذہب میں آنے کے بعد تقریباً ۳۷۵ھ سے ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء تک اس ملک پر حکومت کرتے رہے۔[۱]

صاحب تحفۃ الکرام نے خاندان سومرہ کی حکومت کا خاتمہ خاندان سمہ کی حکومت کے سال آغاز ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء کو قرار دیا ہے اور سرہنری ایلیٹ بھی اسی سے اتفاق کرتے ہیں۔[۲] "بیگ لارنامہ" اور "تاریخ طاہری" میں اس سے مختلف سنہ لکھے ہیں۔ اور اس اختلاف کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں سندھ پر سلاطین غور، و دہلی کے حملے ہونے لگے تھے جن سے یہاں کی مقامی حکومت سالہا سال تک متزلزل ہو جاتی تھی۔ بہرحال یہ انقلاب حکومت آٹھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے اور اس بارے میں قریب قریب سب مورخ متفق ہیں کہ خود سمہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں ہوا۔

جدید تحقیقات کی رو سے یہ نیا خاندان جس کے فرماں روا جام کے ہندی لقب سے ملقب ہوتے تھے، نسلاً راجپوت اور دیناً مسلمان تھا، اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) تاریخ سندھ کے آخری حصے میں بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ اردو میں بعض اور تاریخیں بھی ایسی ترجمہ یا تالیف ہو چکی ہیں جن میں ان مذہبی فرقوں کے جستہ جستہ حالات موجود ہیں۔

[۱] تاریخ سندھ حصۂ دوم صفحہ ۱۳ وغیرہ۔

[۲] تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۴۹۔ ایلیٹ جلد اول صفحہ ۴۹۵۔

اسی کے عہد حکومت میں سندھ کے جنوبی علاقوں میں اسلام پھیلا اور وہاں کی بہت سی قومیں مسلمان ہوگئیں[1]۔ فارسی تاریخوں سے بھی اس خاندان کے بعض حکمرانوں کی دینداری اور اعلیٰ قابلیت کا پتا چلتا ہے مگر ان میں ہمارے مورخ سب سے زیادہ جام نظام الدین کے مداح ہیں جس کا عرف عام نندہ تھا، اور جس کے طویل عہد میں (از ۸۶۶ھ تا ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء) اس خاندان کی حکومت ہر اعتبار سے اوج کمال پر پہنچ گئی تھی۔

سمہ خاندان کے اس فرماں روا کے بعد معلوم ہوتا ہے سندھ میں پہلے خانہ جنگی شروع ہوئی اور پھر شاہ بیگ ارغون نے جو چنگیز خاں کی اولاد میں تھا، یہ ملک ان سے چھین لیا۔ اسی کا بیٹا شاہ حسین ارغون تھا جس کے عہد حکومت میں ہمایوں پادشاہ کو ہندوستان چھوڑ کر سندھ کے راستے ایران جانا پڑا تھا۔ وہ ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء میں لاولد فوت ہوا، اور سندھ کی ریاست اسی کے ہم قوم سرداروں میں تقسیم ہوگئی جو ترخان کہلاتے ہیں۔ ان کی خود مختاری کا خاتمہ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء میں ہوا جبکہ یہ تمام علاقہ مستقل طور پر سلطنت مغلیہ کا صوبہ بن گیا۔

[1] انسائیکلو جلد ۲۵ صفحہ ۱۴۳۔ گزیٹیر جلد ۲۲ صفحہ ۳۹۶۔ الیٹ صفحہ ۴۹۶۔

باب ۱۴

سلطنت غزنی

پہلی فصل: شاہانِ غزنوی کا تعلق ”ہندوستان“ سے

ہندوستان کی تاریخ میں غزنی کے بادشاہوں کا ذکر آنے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ سندھ و مکران میں عربوں کے جانشین ہوئے یا سلطان محمود نے اس ملک پر چند یورشیں کیں اور یہاں کے شہروں سے بہت سا مال لوٹ کر لے گیا بلکہ درحقیقت یہ بادشاہ جنھیں مسلمان مورخ آلِ سبکتگین اور زیادہ تر سلاطین یمینیہ[1] کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اسلامی دنیا میں عام طور پر ”ہندوستان“ کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور خود انھیں اپنے ہندی مقبوضات و فتوحات پر ناز تھا۔ صحیح معنی میں ان کا تسلط آخر تک صرف پنجاب پر قائم رہا جس کا سلطان محمود کے زمانے میں (۴۱۳ھ / ۱۰۲۱ء) باضابطہ سلطنت سے الحاق کر لیا گیا تھا اور دربار غزنی (غزنہ یا

---

[1] دار الخلافت بغداد سے محمود کو ”یمین الدولہ امین الملت“ کا خطاب دیا گیا تھا (۳۸۹ھ) نیز مسلمان بادشاہوں میں وہ سب سے پہلا شخص ہے جو ”سلطان“ کے لقب سے ملقب ہوا۔ (طبقات ناصری صفحہ (۱۱) وغیرہ)۔

غزنین) سے وہاں کے عمّال و والی مقرر ہو کر آتے تھے[لہ]۔ نیز محمود کے آخری جانشینوں نے اُسے اپنا ماویٰ و مستقر بنا لیا تھا۔ لیکن ممالک اسلامی میں انھیں "ہندوستان" کا فرماں روا سمجھے جانے کے اسباب دوسرے تھے۔

"سلاطین ہند" کہلانے کی وجہ

لفظ **ہندوستان** سے بہت دن تک (بلکہ دکن میں اب تک) دریائے **نربدا** کے **شمال** کا وہ علاقہ مراد ہوتا تھا جو پنجاب، نیپال، مگدھ (یا بہار) اور بندھیل کھنڈ کے درمیان واقع ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں **ہرش** کی وسیع و قوی سلطنت اسی علاقے میں قائم ہوئی پھر ڈھائی سو برس بعد راجہ **بھوج** نے اسی کی راجدھانی **قنوج** کو اپنا پایہ تخت بنا کے بڑی قوت و نام آوری پائی تھی اور اسی وجہ سے شہر قنوج اُن دنوں "ہندوستان" کا دار السلطنۃ سمجھا جاتا تھا۔ تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں نے یہی اطلاع اسلامی ممالک میں شائع کر دی تھی۔ اور گو سلطان محمود کے حملوں کے وقت قنوج کی سلطنت گھٹتے گھٹتے چھوٹی سی ریاست رہ گئی تھی تاہم شہر قنوج کی شہرت میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ کیونکہ اس کی بجائے نہ کوئی اور بڑی سلطنت قائم ہوئی نہ کسی دوسرے شہر نے وہ مرکزی حیثیت پائی، جو ڈیڑھ صدی پہلے قنوج کو حاصل تھی۔

پس ہندوستان کے قدامت پسند باشندوں کے نزدیک اگر کوئی شہر تمام مُلکِ ہند کا پایۂ تخت کہلا سکتا تھا تو وہ یہی راجہ بھوج کی پرانی راجدھانی تھی جہاں سلطان محمود کے زمانے تک اسی (پڑیہار) خاندان کے راجہ فرماں روائی کرتے تھے۔ مسلمان حملہ آوروں کا بھی خیال یہی تھا اور اسی لیے جب قنوج فتح ہوا (سنہ ۴۰۹ھ / ۱۰۱۸ء) اور اُسی یورش میں برن (بلند شہر) متھرا وغیرہ اکثر علاقے فتح کر کے سلطان بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ غزنی پہنچا تو ان فتوحات کی خاص طور پر خوشی منائی گئی۔ خلیفۂ بغداد (القادر باللہ) کو بیش قیمت اور نادر روزگار تحائف کے ساتھ یہ اطلاع ملی تو وہاں بہت بڑا جلسہ کیا گیا اور خلیفہ موصوف کے حکم سے تمام مساجد میں سلطان محمود کا مرسلہ فتح نامہ پڑھ کر سنایا گیا اور

لہ۔ فرشتہ صفحہ ۳۰۔

باب ۱۲

"اُس روز بغداد میں ایسی خوشیاں منائی گئیں کہ معلوم ہوتا تھا آج مسلمانوں کی کسی عید کا دن ہے ......"[1]

اسی پر منحصر نہیں بلکہ بعد میں بھی یہ سلطان ہندوستان میں جب اور جدھر بڑھا ملک فتح (یا کم سے کم پامال) کرتا ہوا نکل گیا اور یہاں کے جس رئیس یا راجہ نے اس کا مقابلہ کیا شکست کھائی۔ ان وجوہ سے اگر محمود کے ہم عصر، جنھیں ہندوستان کے جغرافی عرض وطول کا صحیح علم نہ تھا اس تمام ملک کو اس کا مفتوحہ سمجھنے لگے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ دوسرے بیان کرتے ہیں کہ سلطان محمود نے فتح سومنات کے بعد گجرات کو مستقل یا کچھ عرصے کے لیے اپنا مستقر بنانے کا ارادہ کیا تھا[2] اور گو اس ارادے پر ساتھ والوں کی حُبِّ وطن کی وجہ سے عمل نہ ہوسکا تاہم بجائے خود یہی واقعہ اسے ایک حد تک "ہندوستان کا بادشاہ" کہلانے کا مستحق بنا سکتا ہے۔

سلطان کو ہندوستان اور وہاں کے نفائس ونوادر سے جو دلچسپی تھی اس کی بعض مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر یہ روایت ہے کہ قنوج ومتھرا کے حملے سے واپس آنے کے بعد جب اس نے غزنی میں ایک وسیع ورفیع مسجد جامع تیار کرائی اور اس کے ساتھ بہت بڑا مدرسہ اور کتب خانہ بنانے کا حکم دیا اور نہایت بیش قیمت فرش وفانوس سے ان کی زینت بڑھائی، تو اِن عالیشان عمارات میں بہترین سنگ مرمر و رُخام

---

[1] ۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۔ الفنسٹن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے (صفحہ ۳۲۴) کہ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ قنوج میں ایسی کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر ... ہندو اور مسلمان دونوں قوم کے مصنف ایک سے ایک بڑھ کر اس کی مدح وثنا اور اس کے دربار کی شوکت واحتشام کے بیان کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں ..." مگر جیسا کہ راقم الحروف نے اوپر لکھا، ہندوستان میں اگر اس وقت درحقیقت کوئی شہر مدح وثنا یا شہرت کے قابل تھا تو وہ قنوج تھا۔

[2] ۔ روضۃ الصفا صفحہ ۸۱۔ فرشتہ صفحہ ۳۳۔

باب ۱۲

ہندوستان کی کانوں سے منگا کر لگائے اور ان کے متعلق جو باغ بنوایا اُس میں درخت بھی ہندوستان کے نصب کرائے۔ انھیں وہاں بویا نہیں گیا تھا بلکہ پرورش یافتہ بڑے بڑے درخت یا پودے جو وزن و ضخامت میں ایک دوسرے کے برابر تھے بجنسہٖ اکھڑوا کر غزنی منگوا لیے گئے تھے[۱]۔

ہندی ہاتھی اور سپاہی

مگر غالباً ان سب باتوں سے بڑھ کر جو شے ہم عصر بادشاہوں پر سلطان کے "بادشاہ ہند" ہونے کا رعب ڈالتی تھی وہ اس کے جنگی ہاتھی تھے۔ ہندوستان کی یہ شاہانہ سواری دارالخلافت بغداد میں کوئی نئی چیز نہ تھی۔ سندھ کے عرب والیوں اور ہند کے راجہ مہاراجوں نے بارہا خلفائے بغداد کی خدمت میں یہ "تحفہ" ارسال کیا تھا۔ لیکن سلطان محمود کے پاس ان ہاتھیوں کی جتنی تعداد جمع ہو گئی تھی اتنی اب تک کسی مسلمان فرماں روا کے خیال میں بھی نہ گزری ہوگی۔ بلکہ خود ہندو راجہ مہاراجوں میں بہت کم ہوں گے جن کے ہاں فیل خانۂ غزنی کے برابر ہاتھی موجود ہوں کیونکہ لوٹ اور خراج میں صدہا ہاتھی سلطان کے قبضے میں آ جاتے تھے اور غالباً ذاتی طور پر بھی وہ اس "مہیب آلۂ جنگ" کا بہت قدردان تھا چنانچہ فارسی تاریخوں میں یہ قصہ محفوظ ہے کہ جب حملۂ قنوج کے زمانے میں سلطان نے قلعۂ منج[۲] کو فتح کیا تو گو وہاں کا راجہ چندر رائے بچ کر نکل گیا لیکن اس کا سب سے بڑا ہاتھی جو ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور جسے سلطان بڑی سے بڑی قیمت پر خریدنا چاہتا تھا اور راجہ نے اسے دینے سے انکار کر دیا تھا، ایک رات ازخود شاہی لشکر میں آ گیا۔ سلطان کو بے حد خوشی ہوئی اور

۱۔ روضۃ الصفا صفحہ ۷۲۔ فرشتہ صفحہ ۳۰۔ اسی مسجد کو "عروس فلک" کہتے تھے اور اس کے کتب خانے میں بے شمار اور نادر روزگار کتابیں جمع کی گئی تھیں۔

۲۔ منج، سر ہنری ایلیٹ کے قیاس کے مطابق سرحد بندیل کھنڈ کے قریب کا مقام تھا (جلد دوم صفحہ ۴۶)۔ جدید تحقیقات کی رو سے اس قدیم مقام کا منیچ معلوم ہوا ہے اور وہ موجودہ جونپور کے قریب وہاں واقع تھا جہاں اب ظفرآباد ہے۔

باب ۳

ہاتھی "خداداد" کے نام سے فیل خانے میں داخل کر لیا گیا۔[1] اُسے اپنے "صاحب فیل" ہونے پر جو ناز تھا اس کا اظہار اس مشہور قصے سے بھی ہوتا ہے کہ جب خلیفۂ بغداد نے اسے سمرقند پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی تو سلطان محمود نے غضب ناک ہو کر ایلچی سے کہا کہ کیا تمہارا یہ منشا ہے کہ میں ایک ہزار ہاتھی سے بغداد پر فوج کشی کروں اور اُسے پامال و خراب کر کے اس کا ملبہ ہاتھیوں پر لاد کر غزنی اٹھوا منگاؤں؟ القادر باللہ نے اس کے جواب میں جو مراسلہ بھیجا اس میں بسم اللہ کے بعد صرف ایک سطر تھی اور اس میں بھی صرف ال م ال م یہی تین حرف الگ الگ لکھ کر حمد و نعت پر خط کو ختم کر دیا تھا۔ ان حروف مقطعات کو دیکھ کر سب حیران رہ گئے اور دیر تک مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ایک شخص نے بڑھ کر عرض کی کہ شاید یہ سورۂ "الم ترکیف" کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے "اصحاب فیل" کی تباہی کا ذکر کیا ہے! یہ سنتے ہی سلطان دم بخود رہ گیا اور شدت خوف سے اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ ایلچی سے بہت کچھ معذرت کی اور تحائف گراں بہا کے ساتھ خلیفہ کی خدمت میں عریضۂ ندامت و افسوس لکھ کر بغداد بھیجا۔

اُس زمانے کی مشہور و مستند تاریخ یمینی میں بھی بعض جگہ سلطان کی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کا ذکر آتا ہے[2] اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہند و ایران و ترکستان کے معرکوں میں بھی سلطان کا ساتھ دیتے تھے۔ باقی غیر سپاہی پیشہ ہندیوں کی تو ہندوستان کے ساتویں آٹھویں حملے کے بعد ہی غزنی میں وہ کثرت ہو گئی تھی کہ فرشتے[3] کے الفاظ میں "غزنین را در آں سال از بلاد ہندوستان می شمردند" (۴۰۲ھ / ۱۰۱۱ء)۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو سلطان محمود نے صحیح معنی میں تمام ہندوستان کو بلکہ شمالی ہندوستان کو بھی فتح نہیں کیا نہ اس پر مستقل قبضہ رکھا تاہم ۳۸۹ھ / ۹۹۹ء سے

۱۔ فرشتہ صفحہ ۳۰۔ طبقات اکبری۔ الیٹ جلد دوم صفحہ ۴۶۱۔

۲۔ اقتباس از تاریخ یمینی۔ الیٹ جلد دوم ۳۲۔

۳۔ فرشتہ صفحہ ۲۸۔

باب ۴

سنہ ۴۱۷ھ / ۱۰۲۶ء تک اس مُلک پر جو پندرہ یا کم سے کم بارہ حملے کیے وہ اپنا غیر معمولی اثر ڈالے بغیر نہ رہے۔ اول تو سلطان کی توجہ سے ممالک سندھ میں، جہاں عربوں کے زوال اور قرامطہ کی بے پروائی سے اسلام کی قوت نہایت ضعیف ہوگئی تھی مسلمانوں کے قدم پھر جم گئے۔ دوسرے پنجاب کا وسیع و سرسبز علاقہ مستقل طور پر اُن کی ملکیت بن گیا اور یہ وہ صوبہ تھا کہ ہندوستان کے باہر کے تمام مقبوضات نکل جانے کے بعد بھی محمود کی اولاد کے قبضے میں رہا اور خاندان یمینیہ کا چراغ اسی کے پائے تخت لاہور میں گل ہوا۔ مگر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ محمود ہی کے حملوں نے مسلمانوں کو آیندہ تمام ہندوستان فتح کرنے کا راستہ دکھایا اور گو خود اس کی اولاد اپنے جھگڑوں کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکی لیکن اکثر اس بات کی آرزومند رہی۔ حتیٰ کہ اُن سے زیادہ اولوالعزم سپاہی میدانِ عمل میں داخل ہوئے جنھوں نے محمود کے خوابِ پریشاں کو عالمِ خارج میں سچا کر دکھایا۔

ہندوستان پر سلطان محمود کے مذکورۂ بالا حملوں کا مجمل احوال اس زمانے کی عام انگریزی اُردو تاریخوں میں موجود ہے ان کے مختصر واقعات اور سنین اس باب کے آخر میں بہ طریق ضمیمہ یکجا لکھ دیے گئے ہیں۔ زیادہ مفصل اور محققانہ بیان کی ہماری کتاب میں گنجایش نہیں۔ دوسرے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ترتیبِ زمانی کے ساتھ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ غوریوں کے آنے تک ہندوستان سے شاہانِ غزنی کے کیا تعلقات رہے تاکہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا سلسلہ، جو اکثر انگریزی تاریخوں میں جا بہ جا گسستہ نظر آتا ہے حتی الامکان ٹوٹنے نہ پائے۔

مسعود کی تخت نشینی

تینتیس ۳۳ برس کی فاتحانہ حکومت کے بعد سلطان محمود نے سنہ ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں وفات پائی اور غزنی کی چھوٹی سی ریاست کو اپنے زمانے کی سب سے بڑی سلطنت بنا گیا جس میں غزنی، زابلستان، خراسان، خوارزم، چغانی، طبرستان، اصفہان، کرمان، مکران، کیچ، سندھ (تا گجرات)، پنجاب اور خراج گزاروں کی حیثیت سے قنوج، و کالنجر کے علاقے شامل تھے[1]۔ دنیاوی جاہ و جلال اور

۱؎ طبقات ناصری مترجمہ میجر راورٹی حاشیہ صفحہ ۸۸۔

دولت و مال کے ساتھ خدا نے اسے بیٹے بھی سات[۱] عنایت کیے تھے لیکن ان میں محمد اور مسعود صرف دو بھائیوں کو وراثت تخت کا دعویٰ تھا اور انھی کی طرف داری نے امرائے غزنی کے دو گروہ کر دیے تھے، شہزادہ محمد نہایت خلیق، علم دوست اور باپ کا چاہیتا بیٹا تھا اور سلطان محمود اسی کو وارث بنانا چاہتا تھا[۲] لیکن اکثر امرا اور اہل ملک شہزادہ مسعود کے گرویدہ تھے جو نہایت قوی ہیکل، دریادل، سپاہی مزاج آدمی تھا اور باپ کی زندگی میں کئی معرکے سر کر چکا تھا۔ اول اول اس نے ممالک عراق و جبال و طبرستان لے کر بھائی سے مصالحت کرنی چاہی تھی۔ بہت سے درباری بھی خانہ جنگی اور باہمی فساد سے بچنے کی صلاح دے رہے تھے لیکن سلطان محمد اپنی بادشاہی کا اعلان کر چکا تھا سلطنت کی تقسیم اسے گوارا نہ تھی۔ وہ بزور شمشیر مسعود کو مطیع کرنے پر آمادہ ہوا اور جن امرا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ان کے تعاقب میں اس نے اپنے ایک ہندو امیر سوبندرائے کو ہندی فوج دے کر آگے روانہ کیا اور خود وسیع پیمانے پر بھائی سے جنگ کی تیاریاں کیں۔ مگر سوبندرائے منحرف امیروں سے شکست کھا کے مارا گیا[۳] اور کچھ دن بعد خود سلطان محمد کو اہل دربار نے حراست میں لے لیا سلطان مسعود کی بادشاہی متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی۔

ہندو عہدہ دار — سوندر یا سوبندرائے پر منحصر نہیں بلکہ اس عہد کے مشہور مورخ ابوالفضل بیہقی (ولادت ۳۸۶ھ وفات ۴۷۰ھ) کی تاریخ میں ہمیں کئی جگہ دربار غزنی کے ہندو عہدہ داروں اور سپاہیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں سب سے معزز تلک نامی ایک ہندو حجام تھا جو اپنی ہوشیاری، خوش بیانی اور قابلیت کی وجہ سے

۱۔ ال فنسٹن صاحب نے تاریخ فرشتہ میں دو بیٹوں کا حال دیکھ کر محض اپنے قیاس کی بنا پر لکھ دیا ہے (صفحہ ۳۴۳) کہ سلطان محمود کے صرف دو بیٹے تھے!

۲۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۳۔ فرشتہ صفحہ ۴۰ وغیرہ۔

۳۔ فرشتہ صفحہ ۴۰۔ بیہقی نے "سوبندرائے" کی بجائے اس ہندو سپہ سالار کا نام "سوندر" بتایا ہے تاریخ بیہقی (صفحہ ۵۰۴)۔

خواجہ احمد بن حسن میمندی کا دبیر بن گیا تھا اور آخر میں ہندوستان کے باغی سپہ سالار احمد نیال تگین کے مقابلے کے لیے خلعت سپہ سالاری پاکر ہندوستان بھیجا گیا۔ (۴۲۶ھ، ۱۰۳۵ء) الیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ یہی شخص ہے جسے صاحب طبقات اکبری نے "تلک بن جے سین" کے نام سے یاد کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورخ اسے نومسلم ہندو سمجھتا تھا۔[1] لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ کتابت کی غلطی ہے اور غالباً اسی کو بگاڑ کر فرشتہ نے "تولک بن حسین" کردیا ہے۔[2]

بہرحال ہمیں بعد کی تاریخوں کی بجائے تاامکان خود بیہقی سے استفادہ کرنا چاہیے جس کی دلچسپ تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتے کی طرف سے شایع ہوچکی ہے اور گو اس کے بعض اجزا ایسے ضائع ہوئے کہ اب اُن کا پتا نہیں چلتا۔ بایں ہمہ جو کچھ موجود ہے وہی یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ اُس زمانے میں ہند اور اہل ہند کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات روز بروز بڑھتے جاتے تھے اور دربار غزنی کے وزیر اعظم کو اس بات کی ضرورت پڑنے لگی تھی کہ ہندوؤں سے گفتگو یا معاملات طے کرنے کے لیے ایک ہندو مترجم کو اپنی سرکار میں ملازم رکھے۔[3]

ہند پر حملے

اس کے علاوہ سلطان محمود کے پیہم حملوں نے اہل غزنی کو ہندوستان کا جو راستہ دکھا دیا تھا اُسے وہ بھولے نہ تھے اور گو مسعود کو اپنے شمالی ہمسایوں کی لڑائیوں سے بہت کم فرصت ملی تاہم اس کے عہد میں ہندوستان پر دو حملے ہوئے:۔ ان میں پہلا حملہ اسی احمد نیال تگین نے کیا تھا جس کی بغاوت کا ذکر اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ وہ دریائے گنگا کے کنارے کنارے شہر بنارس تک ۱
بڑھا (۴۲۴ھ، ۱۰۳۳ء) جہاں اب تک کسی مسلمان کے قدم نہ پہنچے تھے اور اس دولت مند شہر کو لوٹ کر واپس ہوگیا۔[4] مگر اس حملے کو محض ایک قزاقانہ تاخت سمجھنا چاہیے

[1] الیٹ جلد دوم صفحہ ۶۰۔

[2] فرشتہ صفحہ ۴۲۔

[3] بیہقی صفحہ ۵۰۳۔

[4] بیہقی صفحہ ۴۹۷۔ الیٹ جلد دوم صفحہ ۵۸۔ راورٹی ترجمہ طبقات ناصری حاشیہ صفحہ ۹۳۔

باب ۱۴

جس کا کوئی مستقل نتیجہ نہیں نکلا۔ دوسری مرتبہ خود سلطان مسعود نے موجودہ صوبۂ پنجاب کے جنوب مشرقی حصے پر فوج کشی کی اور قلعۂ ہانسی اور سون پت کو فتح کیا (۴۲۹ھ / ۱۰۳۷ء)[1] اور فرشتے کی روایت کے بہ موجب اپنے فرزند ابوالمجدود کو یہاں کا عامل بنا کر خود غزنی کو مراجعت کی۔

اُس کا جلد سے جلد غزنی پہنچنا ضروری تھا، بلکہ وہاں پہنچ کر ہندوستان آنے پر وہ پشیمان ہوا کیونکہ اس عرصے میں سلجوقی ترکوں نے سلطنت کے بہت سے علاقے پامال کر دیے تھے اور سیلاب کی طرح خراسان و رَے تک بڑھے چلے آتے تھے، سلطان کے آیندہ تین سال انھی کے ساتھ کشمکش میں گزرے اور کئی مرتبہ سخت خوں ریز لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں کے حالات ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہیں، البتہ خاص طور پر لکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ آخر میں جب مسعود کو خراسان میں شکست فاش نصیب ہوئی اور وہ نہایت شکستہ دل ہو کر غزنی واپس آیا تو اس نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اب ہندوستان جا کر نئے سرے سے جنگی تیاریاں کرنی چاہئیں، چنانچہ تمام قیمتی ساز و سامان اور زر و جواہرات اونٹوں پر لدوا کر ہندوستان کی جانب روانہ ہو گیا۔ (۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء)۔

مسعود کی گرفتاری

غزنی کے اُمرا سلطان کے اس ارادے کے خلاف تھے کیونکہ اس اہتمام کے ساتھ پائے تخت کو خیرباد کہنا ترکِ وطن کے مرادف تھا، اور بیہقی کا مفصل بیان[2] پڑھنے سے بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ شکست خوردہ سلطان کو افغانستان میں اپنا مستقبل کچھ خوشگوار نظر نہ آتا تھا، اور عجب نہ تھا کہ آل سبکتگین کا آیندہ مستقر کوہستانِ سلیمان کے مشرق میں قائم ہو جائے۔ لیکن تقدیر کو یہ انقلاب ابھی منظور نہ تھا۔ سلطان مسعود لاہور کے راستے ہی میں تھا کہ اُس کے غلاموں نے بغاوت پر کمر باندھی اور تمام

۱۔ بیہقی صفحہ ۶۲۵۔ فرشتہ اسے ۴۲۷ھ کا واقعہ بتاتا ہے (صفحہ ۴۴) اور طبقات ناصری کا حوالہ دیتا ہے، مگر اس تاریخ کے موجودہ نسخوں میں کہیں یہ عبارت نہیں ملتی۔ دیکھو راورٹی کا ترجمہ طبقات ناصری حاشیہ صفحہ ۹۳)۔

۲۔ تاریخ بیہقی صفحات ۸۲۷ تا ۸۳۲۔

خزانہ لوٹ کر سلطان کو حراست میں لے لیا، انھوں نے اس کے نابینا بھائی امیر محمد کو قید سے نکال کر دوبارہ تخت پر بٹھا دیا تھا، اور چند روز بعد مسعود کو قتل بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بیٹے **مودود** کو اس غداری کی اطلاع ہوئی تو نہایت غضب ناک ہوا، اور اُمرائے دربار نے بھی فوراً اس کی بادشاہی کا اعلان کر کے امیر محمد پر فوج کشی کی۔ اس موقع پہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان کے اُمرا اس کشمکش میں امیر محمد کے طرفدار تھے[۱]۔ لیکن لڑائی میں مودود کو فتح ہوئی (۴۳۴ھ / ۱۰۴۲ء) اور اس نے باپ کے انتقام میں امیر محمد اس کی اولاد اور بہت سے باغی غلاموں کو چُن چُن کر قتل کرا دیا۔

تاریخ فرشتہ کی روایت[۲] کے بہ موجب مودود کو اس فتح کے بعد سب سے زیادہ خوف اپنے چھوٹے بھائی **مجدود** سے تھا جو پہلے باپ کی جانب سے ہانسی کا صوبہ دار مقرر ہوا اور مذکورۂ بالا خانہ جنگی کے زمانے میں بہ اطمینان تمام پنجاب پر مسلط ہو گیا تھا۔ بلکہ قلعۂ ہانسی کو اپنا جنگی مستقر بنا کے اب دہلی پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مودود نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور ادھر سے مجدود بہ عجلت لاہور پہنچ کر مقابلے پر آمادہ تھا کہ مرگ ناگہاں نے اس کا اور آیندہ جنگ کا خاتمہ کر دیا اور صوبۂ پنجاب لڑے بھڑے بغیر مودود کے قبضے میں آ گیا۔

مگر مودود کو اپنے سلجوقی ہمسایوں کی لڑائیوں سے فرصت نہ تھی اور پنجاب کے مسلمان عُمّال باہمی نفاق و شقاق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ دہلی کے راجہ نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور نہ صرف ہانسی اور تھانیسر، بلکہ نگرکوٹ کا قلعہ بھی مسلمانوں سے چھین لیا اور دربار غزنی کو نَو برس تک اس طرف توجہ کرنے کی مہلت میسر نہ آئی۔ البتہ ۴۴۱ھ / ۱۰۴۹ء میں جب سلطنت سلطان عبدالرشید کے قبضے میں آئی اور از سر نو انتظام درست ہوا تو اس کے مشہور سپہ سالار نوشتگین نے پنجاب پر لشکر کشی کی اور نگرکوٹ کو دوبارہ چھین لیا۔ (۴۴۳ھ / ۱۰۵۱ء)۔

---

[۱]۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۵۔

[۲]۔ فرشتہ صفحہ ۴۴۔

باب ۱۲
سلطان ابراہیم

اس واقعے کے تقریباً تیس برس بعد آلِ سبکتگین کے دسویں بادشاہ سلطان ابراہیم بن مسعود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور موجودہ سہارن پور کے ضلع تک بڑھا جہاں اُن دنوں نہایت خوفناک جنگل کھڑے تھے۔ اس نے بہت سے قلعے فتح کیے اور آیندہ طغاتگین کی یورش کا حال پڑھ کر قیاس ہوتا ہے کہ شاید یہ علاقہ مستقل طور پر سلطنت غزنوی میں شامل کر لیا گیا ہوگا کہ اس سپہ سالار کو ہندوستان میں اتنی دور تک بڑھنے میں آسانی ہوئی جہاں سلطان محمود کے سوا اور کوئی اسلامی بادشاہ نہ پہنچ سکا تھا۔[1]

اسی طرح آخری شاہان غزنوی کے زمانے میں بھی جابجا ہندوستان کا ذکر آتا ہے بلکہ جس قدر اُن کی سلطنت ضعیف ہوتی گئی اور بیرون افغانستان کے شمالی علاقے اُن کے حریف سلجوقیوں کے قبضے میں آتے گئے اسی قدر اُن کا تعلق اپنے ہندی مقبوضات کے ساتھ قوی ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ۵۴۵ھ (۱۱۵۱ء) میں **علاء الدین** حاکم **غور** نے **بہرام شاہ** غزنوی کو کئی شکستیں دے کر پائے تخت پر قبضہ کر لیا اور شہر میں آگ لگا دی۔[2]

بہرام کے جانشیں **خسرو شاہ** کے زمانے میں **غز** نامی ایک تُرکی قبیلے نے **ملک سنجر** سلجوقی سے بغاوت کی اور اسے گرفتار کر کے خود تمام خراسان پر مسلط ہو گئے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے پائے تخت غزنی پر حملہ کیا اور محمود اعظم کا جانشیں جو غالباً دوبارہ غزنی آ گیا تھا، اس بے سرے گروہ سے بھی مقابلہ نہ کر سکا اور اپنا قدیم پائے تخت چھوڑ کر پنجاب میں ہٹ آیا۔ اس قبیلے کو بعد میں غوریوں نے غزنی سے نکال دیا تھا لیکن غزنی کے اصلی وارثوں کو آیندہ اپنے وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی اور خسرو شاہ نے مجبوراً لاہور میں جسے قدیم مورخ لوہور

۱۔ طبقات ناصری صفحہ ۲۲۔ فرشتہ صفحہ ۴۸ مگر یہ تصریح کسی تاریخ میں نہیں ملی کہ وہ کس مقام تک بڑھ آیا تھا۔

۲۔ ان واقعات کے سنین میں بہت اختلافات ہیں جن پر راورٹی نے نہایت محققانہ بحث کی ہے (ملاحظہ ہو اس کا ترجمہ طبقات ناصری حاشیہ صفحہ ۱۱۲)۔

لکھتے ہیں، سکونت اختیار کرلی اور سات آٹھ برس حکومت کرکے اسی ہندی شہر میں فوت ہوا۔ (۵۵۵ھ ۱۱۶۰ء)۔

مذکورۂ بالا واقعات نے شاہان یمینیہ کو گویا خالص ہندوستانی فرماں روا بنادیا تھا اور آیندہ اسی ملک میں اپنی سلطنت بڑھانے کا انھیں بہت اچھا موقع مل گیا تھا لیکن اول اول اُن کی حسرت آلود نگاہیں انھیں افغانی پہاڑوں کی طرف لگی رہیں جہاں اُن کے اجداد نے قریب قریب دو صدی تک اس شان و شوکت کے ساتھ فرماں روائی کی تھی۔ پھر ادھر سے مایوسی ہوئی تو شاہانِ غور نے انھیں خود پنجاب میں اطمینان سے نہ بیٹھنے دیا اور سلطان معزالدین، یا شہاب الدین غوری نے چند حملوں میں پیشاور، ملتان اور سندھ فتح کرکے خاص لاہور پر فوج کشی کی۔ سلطان خسرو ملک بن خسرو شاہ قلعہ بند ہوگیا تھا اس لیے پہلی مرتبہ شہاب الدین صرف اس کے بیٹے کو بہ طور یرغمال اپنے ساتھ لے آیا اور دو برس بعد پھر بھلاوا دے کے یکایک لاہور پہنچ گیا۔ بے خبر خسرو سے مدافعت نہ ہوسکی۔ وہ اور اس کا تمام خاندان گرفتار کرلیا گیا اور اسی سال (۵۸۲ھ مطابق ۱۱۸۶ء میں)، آل سبکتگین کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

ع بقا بقائے خدا ست و ملک، ملکِ خدا ست!

دوسری فصل
طرزِ بادشاہی

"طرزِ شاہی"

ملکِ ہندوستان سے شاہانِ غزنوی کے سیاسی تعلقات کا مجمل احوال اوپر ہماری نظر سے گزرا۔ لیکن اُن کے سب سے قوی اور تاریخی تعلق کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے کیونکہ ہندوستان میں جو اسلامی سلطنت آیندہ قایم ہوئی اس میں بادشاہی کا طریقہ عرصے تک وہی رہا جو اول اول غزنی میں جاری ہوا تھا۔ اس طرزِ حکومت کو ہم

باب ۱۲

"تُرک شاہی" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں جس میں بادشاہ کے انتخاب اور بڑے بڑے کاموں کے انصرام میں ایک حد تک تُرک سردارانِ فوج کی رائے کا دخل ہوتا تھا، اور موروثی ہو جانے کے بعد بھی مطلق العنان بادشاہی کی پوری شان پیدا نہیں ہوئی تھی۔ گو امیر سبکتگین کے بعد غزنی کی خود مختار سلطنت خاص اس کے خاندان کی میراث بن گئی تھی تاہم اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ اس خاندان کے بہت کم افراد ایسے تھے جو اُمرائے دربار کی اتفاقِ رائے کے بغیر تخت نشین ہوئے ہوں۔

ایک اعتبار سے یہ طرزِ حکومت اسی آئین کی بگڑی ہوئی صورت تھی جسے دینِ اسلام نے عرب میں رواج دیا تھا لیکن غزنی میں محض وقتی ضرورت و حالات نے اسے پیدا کیا تھا اور اس کا کوئی مستقل قانون یا دستور العمل نہ تھا لہٰذا جب وہاں کے فرماں رواؤں کی قوت بڑھی تو اُن کی بادشاہی موروثی ہو گئی اور اُن کے درباروں میں اُس مطلق العنانی کے جلوے بھی نظر آنے لگے جو ایرانی تمدن اختیار کرنے کی بہ دولت خود بغداد کے عرب خلفا میں پیدا ہو گئی تھی۔

الپتگین

بہر حال، اس حکومت کی بنیاد امیر الپتگین تُرک کے زمانے میں پڑی (۳۲۲ھ / ۹۳۴ء) جو سامانی بادشاہوں کا غلام تھا۔ خراسان و ہرات کے جنوب مشرق میں غزنی، مکران، اور سندھ کے یہ سب علاقے خلافتِ بغداد کے زوال کے وقت سے آلِ سامان کے زیرِ اثر آ گئے تھے اگرچہ یہاں جو اسلامی ریاستیں قایم ہو گئی تھیں اُن کے موروثی رئیسوں پر سامانیوں کی حکومت برائے نام تھی اور وہ اپنے اندرونی معاملات میں قریب قریب خود مختار تھے، یہی سبب ہوا کہ جب الپتگین منصور سامانی (شاہِ بخارا) کے عتاب سے ڈر کر غزنی آیا اور یہاں کے رئیس یا والی کو شکست دے کر خود اس علاقے پر قابض ہو گیا تو دربارِ بخارا نے بھی اس کو وہاں کا والی تسلیم کر لیا اور وہ برائے نام اُن کے باجگزار کی حیثیت سے

ـه ۔ اس کی مثال کے واسطے ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحات ۱۲، ۲، ۹، ۲۰ ۔ نیز راورٹی کا ترجمہ حاشیہ صفحہ ۹۷ ۔ اور منتخب التواریخ جلد اول صفحات ۲۱، ۳۰، ۳۳ ۔

اس کے جانشین

تیس برس[1] فرماں روائی کرتا رہا۔ (۳۲۲ھ/۹۳۴ء تا ۳۵۲ھ/۹۶۳ء)۔

الپ تگین کے بیٹے **اسحٰق** کو اپنے باپ کی جانشینی کے لیے حریفوں سے لڑنا پڑا اور جب تک دربار بخارا سے اجازت اور مدد نہ ملی وہ غزنی کی حکومت حاصل نہ کر سکا۔ ان کوششوں میں اس کے باپ کا غلام **سبکتگین** اس کا شریک حال اور رفیق تھا لیکن اسحٰق کی وفات کے بعد بعض یورپی مورخوں نے سبکتگین کو اس کا جانشین قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے الپتگین کے دو غلاموں نے حکومت کی: پہلا والی امیر **بلکاتگین** ہوا جو اس عہد کا مشہور سپاہی اور نامی سپہ سالار تھا اور دوسرا امیر پیرے جس کی ہندوستان والوں سے بھی ایک لڑائی کا حال ملتا ہے۔ طبقات ناصری کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ بلکاتگین اتفاق آرا سے حاکم بنایا گیا تھا، مگر پیرے ایسا ہر دلعزیز نہ تھا اور بلکاتگین کی وفات کے چار پانچ سال کے اندر ہی لوگ اس کی فتنہ پردازی سے ناراض ہو گئے اور اسے معزول کر کے انھوں نے امارتِ غزنی کے منصب پر امیر **سبکتگین** کو منتخب کیا[2] (۳۶۶ھ/۹۷۶ء)۔

ان واقعات کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ غزنی کی چھوٹی سی ریاست میں اب تک "اولی گارکی" یا حکومتِ خواص قائم تھی جسے ہم نے **ترک شاہی** کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس کے بانی اور حکومت کے حصہ دار ترک تھے۔ لیکن سبکتگین کے زمانے میں ادھر تو سلطنت کی حدود وسیع ہوئیں اور ادھر جنگی قوت اور ذاتی قابلیت نے اس فرماں روا کو پہلے سے کہیں زیادہ قوی کر دیا۔ اس نے ہرات، مکران اور لمغان کے بعض اضلاع بزور شمشیر فتح کیے اور افغانوں کو جنگی تربیت دے کر اتنی زبردست فوج مرتب کر لی کہ خود شاہ بخارا کو اس کی مدد کی ضرورت ہوئی اور حفاظت کے لیے اس نے ملک خراسان کو بھی افواج غزنی کی تحویل میں دے دیا۔

[1] یعنی ۳۵۲ھ تک (ملاحظہ ہو ترجمہ راورٹی حاشیہ صفحہ ۷۱) الفنسٹن، ٹامس اور خود بعض فارسی مورخوں نے اس کے زمانۂ حکومت اور دیگر حالات کے متعلق سخت غلطیاں کی ہیں۔

[2] طبقات ناصری صفحہ ۷۔ ترجمہ راورٹی حواشی صفحات ۷۱ تا ۷۳۔

باب ۸

امیر محمود بن سبک تگیں ان افواج کا سپہ سالار تھا اور مذکورہ خدمات ہی کے صلے میں دربار بخارا نے اسے "سیف الدولہ" کا اور اس کے باپ کو "ناصر الدین" کا خطاب عطا کیا تھا۔ (۳۸۴ھ ۹۹۴ء)۔

اب غزنی کے مستقل اور خود مختار سلطنت بننے میں کچھ کسر نہ رہی تھی اور جب امیر سبک تگیں نے وفات پائی (۳۸۷ھ ۹۹۷ء) تو وراثت کے لیے ہر شخص کی نظر اسی کے بیٹوں پر پڑتی تھی جن میں سے تین خود باپ کی زندگی میں بڑے بڑے معرکوں میں شریک رہے تھے۔ مختصر یہ کہ سبک تگیں ہی وہ شخص ہے جس سے غزنی میں خود مختار و موروثی بادشاہی کا آغاز ہوا اور اس کے لایق بیٹے کے زمانے میں وہ بدرجۂ غایت مستحکم ہوگئی۔

لوازم مطلق العنانی

مزید برآں، سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اس قسم کے تمام اسباب و لوازم جمع ہوگئے تھے جو جمہوریۂ فرانس کے ایک سپہ سالار تک کو مطلق العنان بادشاہ بننے کی طمع دلا سکتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا فاتح اور سب سے قوی اور دولت مند فرماں روا تھا۔ جیحون و دجلہ تک اس کی حکومت کی حدیں پہنچ گئی تھیں سندھ و پنجاب کی مالگزاری براہ راست اس کے خزانے میں وصول ہوتی تھی اور اُس دولت کا حساب لگانا محال ہے جو اسے ہندوستان کے حملوں میں خراج و غنائم کی صورت میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ سن کر کہ آل سامان کے خزانے میں جواہرات کی مقدار سات رطل[۱] سے زیادہ نہ تھی، وہ اگر سجدۂ شکر بجا لایا تو کچھ بیجا نہ تھا کیونکہ خود اس کے خزانے میں سو رطل سے زیادہ وزن کے بے نظیر جواہر موجود تھے۔[۲]

صاحب روضۃ الصفا نے اُس کے تزک و احتشام کی نہایت دلچسپ تصویر الفاظ میں کھینچی ہے۔ یہ ایک مجلس مصالحت کا بیان ہے جسے سلطان محمود نے ایلک خاں اور اس کے بھائی کی نزاع کا فیصلہ کرنے کی غرض سے منعقد کیا تھا۔

۱۔ رطل وزن میں غالباً ۶ چھٹانک کے قریب ہوتا تھا۔

۲۔ روضۃ الصفا صفحہ ۸۹۔ فرشتہ صفحہ ۳۶۔

مجلس کے راستے پر دو ہزار غلام بیش قیمت لباس پہنے صف بستہ کھڑے تھے اور اُن کے آگے پانچ سو غلامانِ خاصہ کی صف تھی جن کی سنہری پیٹیاں جواہرات سے مرصع تھیں۔ تخت شاہی کے گرد، حاجبوں کے گروہ میں ہر شخص قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے اشارۂ سلطانی کا منتظر تھا۔ میدان میں سات سو کوہ پیکر ہاتھی کھڑے جھوم رہے تھے اور اُن کی بیش بہا جھولوں پر نفیس اسلحہ اور مختلف قسم کا قیمتی اسباب آراستہ کیا تھا۔ میدان میں پیادہ وسوار "زرہ ہائے داؤدی در بر و خود ہائے فرنگی بر سر" تلواریں کھینچے، نیزے تانے کھڑے تھے جس مکان میں سفیروں کو کھانا کھلایا گیا، وہ جواہرات کی چمک سے جگمگا رہا تھا۔ اُس کے تکلفات کو دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ سب نے متفق اللسان اقرار کیا کہ کسی زمانے میں بھی ایسے نفائس "اکاسرۂ عجم، قیاصرۂ روم، حکام عرب و رایانِ ہند" کے ہاتھ نہیں آئے تھے[1]۔

طبقات ناصری کی مختصر تحریر میں بھی سلطان کی وسعت سلطنت اور درباری شان وشوکت کی شہادت محفوظ ہے کہ دربار عام کے روز تخت شاہی کے گرد چار ہزار کمسن غلاموں کی صف استادہ رہتی تھی جن کے ہاتھوں میں سیم و طلائے خالص کے گرز (یا عصا) اور سروں پر نہایت بیش قیمت کلاہیں ہوتی تھیں۔ اسی کتاب کے مؤلف کا بیان ہے کہ شاہی فیل خانے میں ڈھائی ہزار (جنگی) ہاتھی تھے[2]۔ اور گو فوج کی صحیح تعداد ہمیں معلوم نہ ہو سکی لیکن قنوج کی فوج کشی کے وقت ایک لاکھ سوارانِ خاصہ لشکر سلطانی کے تنخواہ دار ملازم تھے اور بیس ہزار جنگجو ماوراء النہر کی طرف سے آکر شریک فوج ہو گئے تھے ایسی سپاہ کو فوج مطوعہ (یعنی "والنٹیرز") کہتے تھے اور انھیں صرف جہاد فی سبیل اللہ کا جوش غزنی کھینچ لایا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کا شوقِ شہادت دیکھ کر سلطان محمود نے ہندوستان پر یہ حملہ کیا[3]۔

---

[1]۔ روضۃ الصفا صفحہ ۴۸ و ۴۹۔

[2]۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۰، ۱۱۔

[3]۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۹۔ نیز دیکھو تاریخ یمینی مترجمۂ انگریزی۔ ایلیٹ جلد دوم صفحہ ۴۱۔

غرض دربارِ غزنی میں تمام وہ ساز و سامان افراط کے ساتھ جمع تھے جو حکومت شخصی کے بادشاہوں کو مطلق العناں جابر بنا دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اسلامی اور یورپین بادشاہوں کا فرق نمایاں ہوتا ہے کہ گو ایشیا کا مطلق العناں فرماں روا بھی کسی دنیاوی قانون کا ماتحت اور اپنے کسی فعل کا رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں تھا اور اس لیے بعض بادشاہوں نے محض اپنی خود رائی سے لوگوں کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچائیں۔ کم سے کم انھی کی بدولت قوموں کو یہ نقصان عظیم پہنچا کہ ان کی آزادیِ رائے اور خودداری فنا ہوگئی اور وہ خود اپنی نگاہ میں ذلیل و خوار ہوگئے۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ ممالکِ ایشیا میں ایک اور قوت بھی تھی جو بادشاہی کے ان بُرے اثرات کو کم و بیش زائل کرتی رہتی تھی۔ اس سے ہماری مراد مذہب ہے جس کی ہمہ گیر بندش سے بہت کم اسلامی بادشاہ آزاد ہوتے تھے ورنہ عمل میں اسلامی اوامر سے تجاوز و انحراف کے باوجود، عقائد و اخلاق میں وہ بالعموم کسی نہ کسی حد تک اسلام کی تعلیم سے مغلوب و متاثر ہوتے تھے۔ اور یہ اثر جس بادشاہ پر زیادہ ہوتا تھا اسی قدر اس کی مطلق العنانی کے بُرے اثرات و شیُون میں کمی آجاتی تھی۔ کیونکہ اپنی بندگی بیچارگی کا احساس اور آیندہ محاسبے کا خوف، ظلم و ستم کا ہاتھ کوتاہ کر دیتا ہے اور جس دل میں "خدا پرستی" گھر بنا لیتی ہے۔ وہاں "خود پرستی" کو جگہ نہیں ملتی۔

دوسرے یہ ہم بتا چکے ہیں کہ غزنی کی "ترک شاہی" سلطنت میں "حکومت خواص" کی شان تھی اور وہاں کے بادشاہ کسی حد تک اپنے تُرکی اُمرا کی رائے کے پابند ہوتے تھے اور گو اس کے واسطے کوئی قانون منضبط نہیں ہوا تھا تاہم وضع قدیم کا تھوڑا بہت لحاظ بھی ان کی مطلق العنانی کو ناگوار جبر و استبداد کی صورت اختیار

(بقیۂ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تعجب ہے کہ آل فنسٹن صاحب نے سلطان محمود کی باقاعدہ سوار فوج کی تعداد ۵۴ ہزار بتائی ہے (تاریخ ہند صفحہ ۳۴۲) اور گو کوئی حوالہ نہیں دیا لیکن ان کا سب سے بڑا ماخذ فرشتہ ہے اور اس میں مذکورۂ بالا حملے کے وقت ہی ایک لاکھ سوارانِ خاصہ کی تعداد موجود ہے۔

کرنے نہ دیتا تھا کم سے کم ان کے سب سے بڑے بادشاہ سلطان محمود کے حالات میں ہمیں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جس سے یہ ثابت ہو کہ اُس کی مطلق العنانی رعایا کے حق میں باعث آزار و نقصان ہو گئی تھی۔

محمود کے بعد

اس سلسلے میں باقی شاہان غزنی کے متعلق صرف چند سطریں کافی ہوں گی کیونکہ گو سلطنت ایک خاندان کی میراث بن گئی تھی پھر بھی آئین حکومت میں غالباً کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا، اور جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں یہ بادشاہ اُمرائے دربار کے اجماع یا اتفاقِ رائے سے تخت نشیں ہوتے تھے۔ مگر اس بات کا پتا چلانا دشوار ہے کہ آیا ہر درباری امیر کو اس معاملے میں رائے دینے کا حق ہوتا تھا یا اُمرا کا کوئی خاص گروہ اس کو طے کرتا تھا۔ بہرحال، سلطان محمود کی وفات کے بعد یہ سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی اور یہ بھی ایک وجہ ہوئی کہ وہاں کے بادشاہ اپنے اُمرا کی مدد سے کبھی مستغنی نہ ہو سکے اور ان کی مطلق العنانی اپنی پہلی حدود میں محدود رہی۔ بایں ہمہ ایک مختصر حکایت سے جو اتفاقیہ طور پر تاریخ میں محفوظ رہ گئی ہے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صرف نصف صدی تک موروثی اور شخصی بادشاہی کے قیام نے سلاطین غزنی کے خیالات پر کیا اثر ڈالا تھا۔ یہ حکایت سلطان ابراہیم بن مسعود (شہید) کے متعلق ہے جسے اہل تاریخ نے "سید السلاطین" کا لقب دیا تھا۔ اس نے اپنے طویل عہدِ حکومت (۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء تا ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء) میں نہ صرف بعض وہ علاقے واپس لیے جو پہلے سلاطین غزنی کے ہاتھ سے نکل گئے تھے بلکہ تمام نظم و نسق کی اصلاح کی۔ رفاہِ عام کے لیے بہت سی عمارتیں بنائیں، کئی نئے شہر آباد کیے[1]۔ اور ان کامیابیوں کے باوجود ذاتی اخلاق و انکسار کا جو نمونہ پیش کیا اس کی نظیر سلاطین غزنی میں نہیں ملتی۔ تمام اسلامی مورخ اس کے زہد و تقویٰ عدل و رعایا پروری کی تعریف کرتے ہیں۔ جامع الحکایات[2] میں لکھا ہے کہ یہ سلطان ہر سال امام یوسف سجاوندی کو بلواتا تھا اور وہ اپنے وعظ میں خود سلطان پر سرِ مجلس اعتراض کرنے میں مطلق

[1] ۔ طبقات ناصری صفحہ ۲۰۔

[2] ۔ واضح رہے کہ یہ کتاب محض حکایتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

باک نہ کرتے تھے اور سلطان سنتا اور کچھ برا نہ مانتا تھا۔ اسی حلیم الطبع بادشاہ کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ اس نے کسی مزدور کو دیکھا کہ شاہی عمارات کے لیے بھاری پتھر سر پر رکھے جا رہا ہے اور بوجھ کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھا رہا ہے۔ سلطان کو رحم آیا۔ حکم دیا کہ پتھر کو سر پر سے پھینک دے۔ اس نے تعمیل کی اور وہ پتھر وہیں میدان میں ڈال دیا۔ بعد میں سواروں کے گھوڑے جب یہاں پہنچتے تو دوڑنے میں اس پتھر سے اکثر ٹھوکر کھاتے اور اسی خیال سے کسی مصاحب نے سلطان سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو پتھر کو وہاں سے ہٹوا دیا جائے۔ سلطان ابراہیم نے کہا میں نے اسے وہاں گرا دینے کا حکم دیا تھا اب اگر دوبارہ اسے اٹھوانے کے لیے کہوں گا تو اس سے میری بات کی بے ثباتی ظاہر ہوگی۔" و آں لائق بادشاہانِ صاحب اقتدار نیست!" اپنے بیجا قول کا اس قدر پاس کرنا خاص مطلق العنان بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ مسلمانوں میں یہ خیالات اہل عجم کی صحبت سے پیدا ہوئے تھے اور جب سلطان ابراہیم جیسا نیک دل بادشاہ بھی ان سے نہ بچ سکا تو دوسروں کے متعلق ہم خود قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ کب ان سے محفوظ رہے ہوں گے۔ بلکہ غور سے دیکھئے تو یہ عجب و خود پسندی انھی لوازم عیش اور شاہانہ طمطراق کا نتیجہ تھی جنھیں خلفائے عرب نے ایرانیوں کی تقلید میں اختیار کیا تھا۔ چند مستثنیات کے سوا غزنی کے اکثر بادشاہ بھی انھی ایرانی رسوم کے عادی تھے۔ اور ان میں سے بعض سونے کے اتنے وزنی تاج پہن کر تخت پر بیٹھتے تھے کہ سر اس کے وزن کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس لیے تاج کو طلائی زنجیروں میں باندھ کر لٹکا دیا جاتا تھا۔[۲] خوب صورت غلاموں کی فوج کی فوج ان کے گرد و پیش رہتی تھی۔ مطرب و ساقی ان کی بزمِ عیش کا لازمہ ہو گئے تھے۔ نجومیوں کے مہورت بتائے بغیر وہ بالعموم کوئی کام نہ کرتے تھے۔[۳]

---

[۱]۔ جامع الحکایات۔ قسم دوم باب شانزدہم۔ حکایت ششم۔ تاریخ فرشتہ میں (صفحہ ۴۹) غالباً اس واقعے کو وہیں سے نقل کیا ہے۔

[۲]۔ فرشتہ صفحہ ۴۲ سلطان مسعود کی تاج پوشی کے بیان میں۔

[۳]۔ ان بادشاہوں کی مے کشی اور نجومیوں سے عقیدت مندی کے بہت سے واقعات

باب ۱۲

تیسری فصل۔ شاہان غزنوی کی علم نوازی

مگر سلطان محمود اور اس کی اولاد کا مشرق پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُن کی سرپرستی نے فارسی علم ادب کو فروغ دیا اور یہی علمی خدمات ان کے نام نیک کو قرن ہائے دراز تک زندہ رکھنے کی ضامن ہیں۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنے مشہور قطعے میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے:۔

"بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد | کہ در رفعت ہمی بامہ مِرا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے | مدیح عُنصری ماندست برجائے!"[۱]

واضح رہے کہ اسلامی فتح کے دو صدی بعد تک ایران کے مصنفین اور شعرا عربی زبان ہی میں نظم و نثر کے کمال دکھاتے تھے اور معمولی یادداشتوں یا بچوں کی کتابوں کے سوا تیسری صدی ہجری تک غالباً کوئی کتاب فارسی میں نہیں لکھی گئی[۲]۔ اس کے بعد جب عربی حکومت میں زوال آیا اور ایرانی النسل بادشاہوں کی حکومتیں قایم ہوئیں تو ایرانیوں کو اپنی قومی زبان میں لکھنے کا خیال آیا اور فارسی علم ادب کا آغاز ہوا۔ لیکن سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت تک نثر میں صرف گنتی کی چند

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تاریخ بیہقی، جامع الحکایات، چہار مقالۂ نظامی عروضی اور بعد کی فارسی تاریخوں میں مذکور ہیں۔

سلہ۔ چہار مقالہ صفحہ ۲۳۔ قطعہ کا مطلب یہ ہے کہ سلطان محمود نے بہت سی عمارتیں بنائیں جو بلندی میں چاند پر چشمک کرتی تھیں۔ ان کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں نظر آتی لیکن عنصری نے اُس کی تعریف میں جو کچھ لکھ دیا تھا وہ آج تک سلامت ہے۔

سٹہ۔ لٹریری ہسٹری جلد اول صفحہ ۱۱، ۱۲ و ۳۴۰ نیز شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲۔

باب ۱

کتابیں لکھی یا عربی سے ترجمہ کر لی گئی تھیں اور اگرچہ ایرانی نیز ترکی امیروں کی قدردانی سے مختلف مقامات خاصکر بخارا میں بہت سے فارسی شعرا پیدا ہو گئے تھے مگر اِن میں صرف دو مشہور ہیں: (۱) **رودکی** اور (۲) **دقیقی**، جس نے شاہ نوح بن منصور کی فرمایش سے "شاہ نامہ" نظم کرنا شروع کیا تھا۔ گویا فارسی زبان کی سب سے ممتاز صنف شعر یعنی مثنوی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ قصیدہ اور غزل بہت سادہ اور ابتدائی حالت میں تھے اور دورِ غزنوی سے پہلے زیادہ تر قطعات اور رباعیات کا رواج تھا۔[1] جس کے معنی یہ ہیں کہ فارسی علم ادب گھٹنیوں چلنے لگا تھا، دوڑنے کی اُس میں طاقت نہ آئی تھی۔

محمود کی علم دوستی

یہ بھی عجیب اتفاق زمانہ ہے کہ اس بچے کی پرورش ترکوں نے غزنی میں کی جو اُس کے وطن اصلی سے کہیں دُور تھا۔ اور فردوسی کی منسوبہ ہجو سلطان محمود کو کتنا ہی بدنام کرے، علم اور خاصکر فارسی شاعری پر اس بادشاہ نے جو احسانات کیے ہیں وہ کسی طرح نہیں مٹ سکتے۔ وہ بذات خود فاضل اور نہایت سلیم المذاق شخص تھا۔ مستند کتابوں میں اُسے فقیہ مانا گیا ہے اور فقہ میں اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے۔[2] فارسی تذکروں اور تاریخوں میں اس کے طبعزاد چند شعر بھی منقول ہیں۔[3] لیکن اس کی علم دوستی کا شاید سب سے اچھا ثبوت وہ عالیشان مدرسہ اور کتب خانہ ہے جو اُس نے صرف کثیر کے ساتھ غزنی میں تعمیر کیا تھا۔ نہایت نادر اور بیش قیمت کتابیں اس میں جمع کی تھیں اور اس کے سالانہ مصارف کے واسطے جاگیریں اور گاؤں وقف کر دیے تھے۔[4]

[1] ۔ لٹ ہسٹری جلد اول صفحہ ۴۷۲۔

[2] ۔ شعر العجم حصۂ اول صفحہ ۵۷۔

[3] ۔ لباب الالباب جلد اول صفحہ ۲۴ و ۲۵ ونیز دیکھو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۲۰۔

[4] ۔ روضۃ الصفا صفحہ ۷۲۔ فرشتہ ۔ ۳۰ مگر حیرت ہے کہ پروفیسر براؤن جیسا واقف کار شخص محمود کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض اتفاقات یا ملکی فتوحات کا نتیجہ تھا کہ سلطان کے دربار میں اتنے ادیب جمع ہو گئے ورنہ اس میں "نہ کوئی ذاتی قابلیت تھی نہ خیر و شرافت نہ علمی لیاقت" (لٹ ہسٹری جلد دوم صفحہ ۱۰۲)۔

باب ۱۴

اس علمی قدر دانی اور شاہانہ داد و دہش کا ہر طرف شہرہ ہو گیا تھا اور دُور دُور کے علما و شعرا کھنچ کھنچ غزنی آ رہے تھے۔ عربی زبان کا بے مثل انشا پرداز **بدیع الزماں ہمدانی** جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے "اعجوبۂ روزگار" مانا جاتا تھا، سلطان کے جوارِ فیض میں ہرات آ گیا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی اور چالیس برس کی عمر میں رحلت کر گیا (۳۹۸ھ / ۱۰۰۷ء) محمود کی مدح میں اس کا ایک عربی قصیدہ محفوظ ہے۔

حکیم ابو علی سینا اور ابو ریحان بیرونی وغیرہ چند اربابِ کمال شاہِ خوارزم کے دربار میں تھے۔ محمود نے انھیں خود اپنا سفیر بھیج کر غزنی بلایا۔ یہ سفیر خواجہ **حسین بن علی میکال** بھی اپنے زمانے کا نامور فاضل تھا اور یہ انتخاب ہی محمود کی قدر شناسی کی شہادت ہے۔ بو علی سینا نے یہ دعوت قبول نہ کی لیکن ان اہلِ کمال میں جو سلطان کی فیاضی کا شہرہ سن کر غزنی آئے، علامہ ابو ریحان بیرونی بھی تھا، جو اپنے زمانے کے متعدد علوم کا متبحر عالم گزرا ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں کتاب "آثار الباقیہ"، "قانون مسعودی" اور "تفہیم" سب سے زیادہ مشہور اور موجود ہیں ورنہ کئی ضایع ہو گئیں اور ان کے صرف نام باقی رہ گئے۔ مگر بیرونی کی نام آوری کا دوسرا سبب "کتاب الہند" ہے جسے اُس نے کئی سال ہندوستان میں رہ کر اور سنسکرت زبان میں پورا عبور حاصل کر کے تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر سخاؤ جنھوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ شایع کیا ہے شہادت دیتے ہیں کہ آج بھی دورِ جدید کی تمام آسانیوں کے باوجود اتنی صحت اور وسعتِ نظر کے ساتھ قدیم ہند پر ایسی محققانہ کتاب لکھنا جیسی بیرونی لکھ گیا ہے سالہا سال کی محنت کا کام ہے[1]۔

فردوسی کا قصہ

لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی سلطان محمود سے زیادہ خوش نہیں رہا، اور نہ سلطان ہی اس پر کچھ بہت مہربان تھا۔ عجب نہیں کہ اس باہمی ناراضامندی کا ایک سبب وہی مذہبی اختلاف ہو جس کی بدولت فردوسی کو دربارِ غزنی سے ناکام واپس جانا پڑا۔

"شعرائے محمودی"

لیکن اگر فردوسی کو غزنی کی سکونت راس نہ آئی تو اور بہت سے شاعر سلطان کی داد و دہش سے فیض یاب ہونے والے موجود تھے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ

[1] مقدمۂ کتاب "بیرونیز انڈیا"۔

چارسو "شاعر متیں" سلطان کے ملازم تھے[1]۔ انعام و اکرام کی یہ حالت تھی کہ ایک موقع پر ہر شاعر کو جس نے قصیدہ لکھا تھا صلے میں ۲۰،۲۰ ہزار درہم عطا ہوئے[2]۔ عنصری کی ایک برجستہ رباعی پر حکم دیا گیا کہ شاعر کا منہ تین مرتبہ جواہر سے بھر دیا جائے[3]! یوں بھی عنصری کی (جو پہلے نادار شخص تھا) دولت مندی مشہور ہے کہ سلطان کی فیاضی کے طفیل چارسو زریں کمر غلام اس کے جلو میں چلتے تھے اور ظروف میں اس کی دیگیں تک طلائی یا نقرئی تھیں[4]۔ لیکن سلطان کے ادبی ذوق کی شاید سب سے عمدہ شہادت یہ ہے کہ اس نے عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ سب شعرا کا کلام دیکھے اور اس کی تنقید و اصلاح کے بغیر کسی کے شعر دربار میں پیش نہ ہوں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر سخن سنج کو ایک خاص معیار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا ورنہ اس کے شعر مقبول نہ ہوتے تھے۔

غرض سلطان محمود کی سرپرستی اور ان شعرا کی عرق ریزی نے فارسی شاعری میں، غزل کے سوا، ہر صنف شعر کو اوج کمال پر پہنچا دیا، اور اسدی، فرخی اور منوچہری جیسے قادر الکلام شاعر پیدا کیے جن کا کلام آج بھی دنیائے ادب کا نہایت عزیز سرمایہ ہے۔

سلطان مسعود کا زمانہ

لیکن منوچہری کی شاعری کا زیادہ زمانہ سلطان مسعود کے دربار میں گزرا[5] اور اسے ہم عہدِ مسعودی کے ادیبوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ بیرونی کی کتاب "قانون مسعودی" بھی اسی عہد میں تکمیل کو پہنچی اور مسعود کے نام سے منسوب ہے۔ مصنف کو صلے میں اس نے "ایک ہاتھی چاندی" عنایت کی تھی[6]۔ ایک اور فاضل روزگار قاضی ابو محمد ناصحی نے بھی فقہ حنفی میں اپنی تصنیف کو اس بادشاہ کے نام پر "کتاب مسعودی" موسوم کیا۔

واضح رہے کہ محمود کی اولاد میں علم و فضل کا امتیاز شہزادہ محمد کو حاصل تھا۔ لوگ عربی اشعار میں اس سے استناد کرتے تھے[7]، اور مسعود کی شہرت سپاہ گری اور جسمانی قوت کی

1۔ فرشتہ صفحہ ۳۹۔
2۔ شعر العجم صفحہ ۵۸ بحوالہ مجمع الفصحا۔
3۔ چہار مقالہ صفحہ ۴۵۔
4۔ شعر العجم صفحہ ۲۱۔ بحوالہ مجمع الفصحا، تذکرۂ دولت شاہ وغیرہ۔
5۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۴۔ 6۔ طبقات ناصری صفحہ ۱۲۔ ترجمہ راورٹی حاشیہ صفحہ ۸۸۔

باب ۱۴

وجہ سے تھی۔ لیکن تخت نشیں ہو کر اس نے اپنی سخاوت اور علم کی قدردانی سے یہ کمی پوری کر دی اور ممالک محروسہ میں نہایت کثرت سے مدرسے تعمیر کرائے[۱]۔

ہندی شاعر

لیکن اس جگہ سب سے زیادہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ پنجاب پر پچاس ساٹھ برس کی اسلامی حکومت نے خود اس ملک میں فارسی گو شعرا پیدا کر دیے تھے، چنانچہ عوفی کو اپنے مشہور تذکرے میں ان کے نام پر ایک علیحدہ باب قایم کرنے کی ضرورت ہوئی[۲]۔ ان میں سے دو خاص طور پر لایق ذکر ہیں: اول اُستاد ابوالفرج رُونیؔ جو مضافات لاہور میں موضع رُون کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں ملا عبدالقادر بداونی کے زمانے میں ویران و بے چراغ ہو چکا تھا[۳]۔ مگر استاد موصوف کے وہاں سکونت اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ سلطان محمود یا مسعود ہی کے زمانے میں مسلمانوں کی آبادی شہروں تک محدود نہ رہی تھی۔ بہر حال یہ شخص اپنے زمانے کا نہایت نامور شاعر گزرا ہے اور عوفی کا بیان ہے کہ انوری جیسا مسلّم الثبوت اُستاد قصیدہ نگاری میں اسی کا مُقلِد تھا۔ دوسرا مشہور شاعر جسے خاک ہند سے منسوب کرتے ہیں، مسعود سعد سلمان ہے۔ وہ "سید السلاطین" ابراہیم بن مسعود کا مدّاح تھا۔ قصائد و قطعات[۴] کے علاوہ عوفی نے اس کی ایک غزل نقل کی ہے جو حقیقت میں "چمن لطافت کا پھول ہے"[۵] اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کی یہ صنف بھی سلاطین غزنی کی سرپرستی میں بہت کچھ ترقی کر گئی تھی۔ مگر ہماری نظر میں سعد سلمان کی ناموری کا سب سے بڑا سبب دوسرا ہے: وہ یہ کہ مسلمانوں میں یقیناً سب سے پہلا شخص وہ ہے جس نے "ہندوی" یا ہندوستانی زبان میں شاعری کی اور عربی و فارسی کے پہلو بہ پہلو اس زبان میں ایک

۱۔ فرشتہ صفحہ ۴۴۔

۲۔ لباب الالباب جلد دوم باب دہم "شعرائے غزنہ و لوہور" (لاہور)

۳۔ منتخب التواریخ صفحہ ۳۷۔

۴۔ اس کے قریبی زمانے کے سخن سنج نظامی عروضی نے اس کے کلام کی جس فراخ دلی سے داد دی ہے وہ اس کی خوبی کی بہترین شہادت ہے (ملاحظہ ہو چہار مقالہ صفحہ ۵۰ و ۵۸)۔

۵۔ لباب جلد دوم صفحہ ۲۵۱۔

مستقل دیوان اپنی یادگار چھوڑا[۱] جو غالباً ملا عبدالقادر بداونی کے زمانے تک موجود تھا اور قرینہ کہتا ہے کہ یہ دیوان پنجاب کی مقامی بولی میں نہیں بلکہ اُسی ہندی زبان میں ہوگا جو "ہندوستان خاص" یادو آب کی زبان تھی۔

عہد بہرام شاہ

سلطان ابراہیم کے بعد کچھ عرصے تک سلطنت میں فتنہ و فساد ہوتے رہے اور امن اُس وقت ہوا جب کہ خاندان یمینیہ کا بارھواں بادشاہ **بہرام شاہ** ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں (یعنی سلطان ابراہیم کی وفات کے بیس برس بعد) تخت نشین ہوا۔ اس کے اوائل عہد کا درباری شاعر **سید حسن** غزنوی تھا لیکن **حکیم سنائی** اور **نظامی گنجوی** جیسے اساتذہ کے مقابلے میں اس غریب کی چنداں شہرت نہ ہوسکی اور یہ دونوں باکمال بہرام شاہ کے مداح تھے۔ سنائی کی مشہور مثنوی **حدیقہ** اسی بادشاہ کے نام پر لکھی گئی اور گوشہ نشین نظامی کا وطن اگرچہ سلطان **طغرل** کی قلمرو میں تھا، اور شہرت کلام کی بدولت بڑے بڑے سلاطین عصر انھیں اپنے دربار میں بلانا بلکہ بعض اپنی اولاد کا ان کے ہاں پیوند کرنا چاہتے تھے مگر سب سے پہلے جس بادشاہ کی سرپرستی کو انھوں نے قبول کیا وہ یہی بہرام شاہ تھا۔ مثنوی **مخزن الاسرار** اسی فیاض بادشاہ کے نام پر تصنیف ہوئی اور اس کے صلے میں "پانچ ہزار اشرفی ایک قطار شتر اور بہت سے بیش قیمت کپڑے" بادشاہ نے انھیں ارسال کیے[۲]۔

اسی بادشاہ کی سرپرستی میں اور بہت سی کتابیں فارسی میں تصنیف یا ترجمہ ہوئیں[۳]۔ جن میں سب سے زیادہ "کلیلہ دمنہ" مشہور ہے۔ یہ **ہارون الرشید** کے عہد میں پہلوی سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھی۔ اب اُسے دوبارہ فارسی کا لباس پہنایا گیا اور یہی ترجمہ کچھ مدت کے بعد زیادہ سلیس عبارت میں بدل کر **انوار سہیلی** کہلانے لگا۔

بہرام شاہ کے آخری زمانے میں مُلوکِ غُور سے وہ لڑائی چھڑ گئی جس نے

---

[۱] لباب۔ صفحہ ۲۴۶۔ منتخب التواریخ صفحہ ۳۸۔ نیز ملاحظہ ہو خزانۂ عامرہ صفحہ ۱۴ و ۱۵ جس میں شاعر کے خاص "ہندستانی" ہونے کو بدلائل ثابت کیا ہے۔

[۲] شعر العجم۔ ۲۹۰۔

[۳] راورٹی۔ ۱۰۹۔ فرشتہ ۵۰۔ منتخب ۴۹۔

انجام کار شہر غزنی کی عظمت کو خاک میں ملا دیا، اور علاء الدین کے ہاتھوں علم و فضل کا یہ مرکز ایسا تاراج ہوا کہ پھر اسے اُبھرنا نصیب نہ ہوا۔

ضمیمہ باب ۱۴

شاہان غزنی کے سنین حکومت

امیر الپ تگیں

سنہ ۳۲۲ھ تا سنہ ۳۵۲ھ مطابق سنہ ۹۶۳ء

اسحٰق بن الپ تگیں
سنہ ۳۵۲ھ تا سنہ ۳۵۵ھ
۹۳۶ء تا ۹۶۵ء

بلکاتگیں (غلام الپ تگیں)
سنہ ۳۵۵ھ تا سنہ ۳۶۳ھ
۹۶۵ء تا ۹۷۳ء

امیر پیرے (غلام الپ تگیں
سنہ ۳۶۲ھ تا سنہ ۳۶۶ھ یا سنہ ۳۶۷ھ
۹۷۶ء

امیر ناصر الدین سبک تگیں (غلام الپ تگیں)

سنہ ۳۶۷ھ تا سنہ ۳۸۷ھ مطابق سنہ ۹۹۷ء

(۱) سلطان یمین الدولہ ابوالقاسم محمود

سنہ ۳۸۸ھ تا سنہ ۴۲۱ھ مطابق سنہ ۱۰۳۰ء

(۲) امیر محمد بن سلطان محمود
ہفت ماہ

(۳) سلطان مسعود بن محمود
سنہ ۴۲۲ھ تا سنہ ۴۳۲ھ
۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء

(۴) سلطان مودود بن مسعود
سنہ ۴۳۲ھ تا سنہ ۴۴۱ھ
۱۰۴۰ء تا ۱۰۴۹ء

مسعود بن محمود
ایک ماہ
طغرل غلام
چہل روز

(۵) علی بن مودود
۴۴۱ھ تا ۴۴۳ھ
۱۰۴۹ء تا ۱۰۵۱ء

(۶) عبدالرشید بن سلطان محمود
۴۴۳ھ تا ۴۴۴ھ
۱۰۵۲ء

(۷) فرخ زاد بن سلطان مسعود
۴۴۴ھ تا ۴۵۱ھ
۱۰۵۹ء

(۸) سید السلاطین ابراہیم بن مسعود
۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ
۱۰۹۸ء

(۹) مسعود (الکریم) بن ابراہیم
۴۹۲ھ تا ۵۰۸ھ
۱۱۱۴ء

(۱۰) شیرزاد بن مسعود الکریم
۵۰۸ھ تا ۵۰۹ھ
۱۱۱۵ء

(۱۱) ملک ارسلاں بن مسعود الکریم
۵۰۹ھ تا ۵۱۱ھ
۱۱۱۷ء

(۱۲) بہرام شاہ بن مسعود الکریم۔
۵۱۲ھ تا ۵۴۷ھ
۱۱۵۲ء

(۱۳) خسرو شاہ بن بہرام شاہ
۵۴۷ھ تا ۵۵۵ھ
۱۱۶۰ء

(۱۴) خسرو ملک بن خسرو شاہ
(فرماں روائے پنجاب) از ۵۵۵ھ تا ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء

۲۔ سلطان محمود کے حملے[1] ہند پر

واقعات

سنین	
۳۹۰ھ ۱۰۰۰ء	×۱۔ سلطان محمود کا پہلا حملہ سرحد ہند پر اور جنوبی ہند کے جاٹوں کی سرکوبی۔
۳۹۱ و ۹۲ھ ۱۰۰۲ء	۲۔ جنگ پشاور اور راجہ جے پال کی شکست و گرفتاری۔........
۳۹۵ھ ۱۰۰۴ و ۵ء	۳۔ راجہ بھاٹیا پر فوج کشی۔ جنگ بھیرا۔..........
۳۹۶ھ ۱۰۰۵ء	۴۔ ابوالفتح والیِ ملتان پر فوج کشی۔..........

[1] سلطان محمود کے کُل حملوں کی تعداد بعض مورخوں نے ۱۲، بعض نے ۱۶، اور بعض نے ۱۷ بتائی ہے اور اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض نے معمولی سرحدی لڑائیوں کو شمار کے قابل نہیں سمجھا۔ ہم نے اوپر صرف اُن حملوں کا ذکر کیا جن کے سنین و واقعات قریب قریب مسلّم ہیں۔ اور اگر ان میں ۱۔ ۵۔ اور ۱۵ جن پر نشان × کر دیا گیا ہے اور جو چنداں وقیع نہیں چھوڑ دیا جائے تو محمود کے حملوں کی تعداد بارہ رہ جائے گی۔ مولف۔

×۵۔ سُکھ پال (نومسلم) کی بغاوت اور اس کی تنبیہ کے لیے محمود کی فوج کشی۔ سنہ ۳۹۸ھ / ۱۰۰۷ء

۶۔ راجہ انند پال سے جنگ نگرکوٹ یا کوٹ کانگڑے کی فتح۔ .... سنہ ۳۹۹ھ / ۱۰۰۸ء

۷۔ ملتان پر دوسرا حملہ۔ .... سنہ ۴۰۱ھ / ۱۰۱۰ء

۸۔ راجہ بھیم والی ناردین یا نندونہ (مشرقی پنجاب) پر فوج کشی۔ .... سنہ ۴۰۴ھ / ۱۰۱۳ء

۹۔ فتح تھانیسر وغیرہ۔ .... سنہ ۴۰۵ھ / ۱۰۱۴ء

۱۰۔ کشمیر پر ناکام فوج کشی۔ .... سنہ ۴۰۶ھ / ۱۰۱۵ء

۱۱۔ فتوحاتِ قنوج و متھرا۔ .... سنہ ۴۰۹ھ / ۱۰۱۷ء

۱۲۔ کشمیر پر دوسرا حملہ۔ .... سنہ ۴۱۲ھ / ۱۰۲۰ء

۱۳۔ گوالیار و کالنجر کی فتح۔ الحاقِ پنجاب۔ .... سنہ ۴۱۳ و ۱۴ھ / ۱۰۲۱ء

۱۴۔ سومنات و گجرات کی فتح۔ .... سنہ ۴۱۶ و ۱۷ھ / ۱۰۲۵ء

×۱۵۔ ملتان کے قزاقوں کی سرکوبی۔ .... سنہ ۴۱۷ھ / ۱۰۲۵ء

باب ۱۵

مسلمانوں کا تسلط ہندوستان پر

پہلی فصل سلطان معزالدین محمد بن سام

نسل و خاندان

غور[1] کے رئیس جنھوں نے سلطان محمود کی اولاد سے بادشاہی چھینی، تاریخ میں **آلِ شنسب** یا **سلاطین شنسبانیہ** کہلاتے ہیں کیونکہ عام روایت کے مطابق اُن کے بزرگوں میں سب سے پہلا شخص جس نے حضرت علیؓ کے عہد میں اسلام قبول کیا، شنسب تھا۔ ان کی نسل کے متعلق بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے نیم تاریخی بادشاہ **ضحاک تازی** کی اولاد میں ہیں لیکن تحقیقاتِ جدید ان افسانہ آمیز روایتوں کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کی رُو سے یہ بادشاہ "تاجیک" (یعنی اہلِ ایران و عرب کی مخلوط نسل سے) ہیں اور غالباً خراسان سے اُٹھ کر ان اضلاع میں آئے تھے۔ ان کی قدیم تاریخ پر مفصل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجایش نہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے لایق ہے کہ غور کے یہ رئیس افغانی نہیں تھے اور سلطان محمود کے

[1] راورٹی حواشی صفحہ ۳۲۶ وغیرہ۔

زمانے تک نہ انھوں نے مدنیت میں کچھ ترقی کی تھی نہ اُن کی سیاسی قوت چنداں قابل لحاظ تھی اُن کے ماتحت قبائل، افغانستان کے پہاڑی جرگوں کی طرح، نیم خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور قدرتی پیداوار کے علاوہ لوٹ کا مال ان کی دل پسند وجہ معاش تھی۔ تاریخ یمینی سے یہ بات ثابت ہے کہ ابھی تک ان کے بہت سے افراد بت پرست یا غیرمسلم تھے۔ ان کی قزاقانہ دست برد پر غضبناک ہو کر سلطان محمود نے جب خروج کشی کی تو آہن گراںؔ نامی قصبہ اُن کا سب سے مضبوط اور دشوار گزار قلعہ اور سوری کا بیٹاؔ ان کا مُلک یا بڑا سردار تھا جسے لڑائی میں شکست ہوئی اور قید کر کے غزنی بھیج دیا گیا۔ وہاں اس پر جو کچھ گزری اس کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے اور اس لڑائی کا سنہ (سنہ ۴۰۱ھ ۱۰۱۰ء) بھی مسلم نہیں لیکن تمام روایتوں کو پڑھ کر جو نتیجہ ہمارے مفید مطلب نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اسی شکست کے بعد سے **غور** کے رئیس شاہانِ غزنی کے باجگزار ہو گئے اور وہاں کے قبائل میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے اسلام قبول کرنے کے بعد ان میں نہ صرف مدنیت اور نظم ونسق کی قابلیت پیدا ہوئی بلکہ قومی حوصلے بڑھ گئے اور قزاقی کی بجائے اب وہ بادشاہی کے خواب دیکھنے لگے۔ سلاطین غزنی کے انحطاط نے اِن حوصلوں کو تقویت پہنچائی۔ غور کے رئیس رفتہ رفتہ خودمختار ہوتے گئے اور سنہ ۴۹۳ھ ۱۰۹۹ء میں **عزالدین حسین** کی بادشاہی کو خود سلطان مسعود (الکریم) نے تسلیم کر لیا۔ "فاتح ہندوستان" غور کے اسی پہلے بادشاہ کا

۱؎ میجر راورٹی نے اس قلعے کو غزنی کے قریب "آہنگ" نامی ندی کے متصل بتایا ہے (حاشیہ صفحہ ۳۲۰) لیکن تعجب ہے کہ اس غیر معروف دیہ کی بجائے (جو آہنگ ندی کے قریب تھا) اُس "قلعۂ آہنگراں" کی طرف ان کا خیال نہ گیا جو غزنی سے تقریباً سوا دو سو میل مغرب میں رُود ہری پر واقع ہے (دیکھو روائیل ایٹ لس۔ نقشہ ۳۲) غور کے رئیسوں کا خاص علاقہ یہی تھا اور اسی علاقے میں کچھ عرصے بعد اُن کا مشہور قلعہ فیروزکوہ تعمیر ہوا۔

۲؎ بعض مورخوں نے اس کا نام "محمد بن سوری" بتایا ہے۔ طبقات ناصری (صفحہ ۳۹ وغیرہ) لیکن تاریخ یمینی میں صرف "ابن سوری" لکھا ہے۔ مفصل بحث کے لیے دیکھو راورٹی حاشیہ ص ۳۲۱۔

باب ۱۵

پوتا تھا اور چونکہ آئندہ واقعات میں عزالدین حسین کے بیٹوں کا بار بار ذکر آئے گا لہذا یہ ورق پڑھتے وقت ذیل کا شجرہ پیش نظر رکھنا چاہیے:-

عزالدین حسین

- فخرالدین
- سلطان سیف الدین سوری
- قطب الدین
- بہاءالدین (سام)
  - شمس الدین الملقب بہ سلطان غیاث الدین
  - شہاب الدین الملقب بہ سلطان معزالدین (سام)
- سلطان علاءالدین "جہانسوز"
  - سلطان سیف الدین محمد
- شہاب الدین
- شجاع الدین

عزالدین نے اپنا ملک بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ خود مختار رئیس تھے لیکن غالباً "سلطان" کا لقب صرف **سیف الدین سوری** کو حاصل تھا، اور جب اُس کا بھائی **قطب الدین** غزنی میں قتل ہوا تو اُسی نے انتقام کے لیے بادشاہ غزنی پر فوج کشی کی

غزنی کی پہلی تسخیر

قطب الدین کے قتل کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ ایک قول تو یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں سے ناراض ہو کر غزنی چلا آیا تھا اور اپنے حُسنِ صورت و سیرت کی بہ دولت اُمرائے غزنی کا محسود ہوا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اسے خود غزنی کے بادشاہ بہرام شاہ نے بُلایا اور اپنی بیٹی بیاہی یا بیاہنی چاہتا تھا کہ کسی سنگین قصور کی بنا پر اس سے ناراض ہو گیا اور زہر دے کر مروا ڈالا۔ بہرحال یہ مسلم تھا کہ قطب الدین بہرام شاہ کے حکم سے مارا گیا اور اس کا کوئی سبب بتایا نہیں گیا تھا لہذا مقتول کے بھائی سیف الدین سوری کو یہ خبر ہوئی تو نہایت غضبناک ہوا اور انتقام لینے کے لیے اُس نے خاص پائے تخت غزنی پر فوج کشی کی۔ بہرام شاہ کو شکست کھا کے فرار

ہونا پڑا اور سُوری نے شہر پر قابض ہو کر اپنے "سلطان غزنی" ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعض روایتوں سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید اس فتح میں سوری کا بھائی بہاء الدین سام شریک غالب تھا اور یہ کامیابی کسی حیلے سے حاصل ہوئی تھی۔ بہرحال ۵۴۳ھ/۱۱۴۹ء میں سیف الدین سوری غزنی میں تخت نشین ہوا اور اُمرائے غزنی کی اطاعت گزاری پر مطمئن ہو کر اس نے اپنے غوری سپاہیوں کو وطن جانے کی اجازت دے دی اور صرف تھوڑی سی فوج اس کے پاس غزنی میں رہ گئی۔

تھوڑے دن میں برف باری نے غُور کے راستے بھی بند کر دیے۔ اُمرائے غزنی موقع کی تاک میں تھے انھوں نے خفیہ طور پر بہرام شاہ کو بلا بھیجا اور وہ سرحد ہندوستان سے تازہ لشکر لے کر غزنی آ گیا۔ سُوری نے کثرت تعداد کے مقابلے سے بچ کر بھاگنا چاہا لیکن وہ اور اس کا وزیر سید مجد الدین مُوسوی گرفتار کر لیے گئے اور سخت ذلت و تشہیر کے بعد انھیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔

دوسری تسخیر و تاراجی

بھائی کی اس فضیحت و قتل کی اطلاع پہلے بہاء الدین سام کو ملی اور مورّخ لکھتا ہے کہ طیش و انتقام کے جوش میں اس نے مجلس عزا کو بھی ملتوی کر دیا اور بہرام شاہ سے لڑنے کے لیے فوج مہیّا کی[1]۔ لیکن وہ غزنی کے راستے میں مر گیا اور یہ فرض تیسرے بھائی علاء الدین حسین کے ہاتھوں انجام کو پہنچا جس نے بہرام شاہ کو تین شکستیں دے کر دوبارہ غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اور حکم دیا کہ شہر کو لوٹ کر آگ لگا دی جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور سات شبانہ روز ادھر شہر جلتا رہا اور لوگوں کا خون برسات کے میلے پانی کی طرح گلیوں میں بہتا رہا اور ادھر یہ افغانستان کا نیرو ایک قصر میں بیٹھا عیش و طرب کا لطف اٹھاتا رہا۔ آخر آٹھویں رات مطربوں کو حکم دیا کہ چنگ و چغانہ پر یہ نظم گائیں جو خود اُس نے اپنی مدح میں نظم کی تھی:-

جہاں داند کہ من شاہِ جہانم — چراغِ دودۂ عبّاسیانم

....

بر آں بودم کہ از اوباش غزنی — چو رودِ نیل جوئے خوں برانم

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۵۰۔

باب

ولیکن گندہ پیر انند و طفلاں شفاعت می کند بخت جوانم
بہ بخشیدم بدلیشاں جانِ ایشاں کہ بادا جانِ شاں پیوند جانم

مگر اس "جان بخشی" کا اعلان ہوتے تک کم سے کم ستر ہزار" شہری قتل ہو چکے تھے[۱] جو بھاگ گیا گرفتار ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ غزنی اور گرد و نواح کے شہروں کی وہ عمارات محمودی کہ "در آفاق مثلِ آں نہ بود" بالکل مسمار کر دی گئیں اور آج بھی کھنڈروں سے اُن کی عظمت و وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے[۲]۔ اس خوفناک انتقام سے سلطان محمود، مسعود اور ابراہیم کے مقبرے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے ورنہ دیگر سلاطین غزنوی کی قبریں تک کھدوا کے پھینک دی گئیں۔

مگر تقدیر نے خود علاء الدین سے اِن وحشیانہ مظالم کا بدلہ لینے میں دیر نہ کی۔ وہ تھوڑے ہی دن بعد سلطان سنجر سے شکست کھا کے گرفتار ہوا اور دو سال تک اس کے "اردو" میں نانبائیوں کے تنور سلگاتا اور طرح طرح کی ذلتیں اٹھاتا رہا۔ پھر اس قید سے مخلصی ملی تو موت نے فرصت نہ دی وہ غور پہنچ کر مر گیا اور صرف اس کی بے رحمی اور آتش زنی کی داستانیں باقی رہ گئیں۔

شمس الدین و شہاب الدین

اس خونخوار فرماں روا نے جسے تاریخ "جہاں سوز" کے لقب سے یاد کرتی ہے، اپنے مرحوم بھائی بہاء الدین سام کے دو بیٹوں کو بھی قید میں ڈلوا دیا تھا لیکن جب وہ مرا اور اُس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا تو اُس نے چچیرے بھائیوں کو رہا کر دیا اور اپنے دربار میں جگہ دی پھر سیف الدین مارا گیا تو اُمرائے دربار نے انھی میں سے بڑے بھائی شمس الدین (بن بہاء الدین) کو غور کا بادشاہ بنایا (۵۵۶ھ / ۱۱۶۰ء) اور اُس نے کچھ عرصے بعد سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کر کے تینتالیس برس تک کمال شوکت و شان کے ساتھ بادشاہی کی۔

اس جواں سال بادشاہ کی فتوحات جنھوں نے عہد محمود کی یاد تازہ کر دی تھی، ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہیں۔ اہل ہند کو صرف اس کے بھائی شہاب الدین سے

---

[۱]۔ راورٹی (حاشیہ صفحہ ۳۴۶)۔

[۲]۔ طبقات ناصری ۵۸۔ راورٹی حاشیہ ۳۵۵۔

سابقہ پڑا جس کے نام کو انگریزی تاریخوں میں نئی نئی طرح سے لکھا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اپنے بھائی کی تخت نشینی اور بعض فتوحات کے بعد اُس نے معز الدین والدنیا محمد بن سام کا لقب اختیار کر لیا تھا اور فارسی تاریخوں میں اس کو اکثر اسی لقب سے اور کبھی کبھی اصلی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے انگریز مورخ "جن کا ماخذ الفنسٹن یا تاریخ فرشتہ کا غلط در غلط انگریزی ترجمہ ہے" اس بات کو نہ جاننے سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں[1]۔

ہندوستان پر ابتدائی حملے

الغرض بھائی کی تخت نشینی کے چند سال بعد جب قبیلۂ غز کو شکست ہوئی اور شہر غزنی تیسری مرتبہ غوریوں کے قبضے میں آیا، تو یہاں کا صوبہ دار معز الدین مقرر ہوا (۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء) اور چونکہ شاہی خاندان کے ایسے عہدہ دار اپنی جگہ قریب قریب خود مختار حاکم ہوتے تھے، لہٰذا بعض مورخوں نے اسی سال کو اس کے عہد بادشاہی کا آغاز قرار دیا ہے حالانکہ بھائی کی زندگی میں خود اُس نے کبھی خود مختار بادشاہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور ہمیشہ اس کا مطیع و فرماں بردار رہا۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ غزنی کی حکومت محمود اعظم کی میراث تھی۔ اس کے سوختہ اور شکستہ در و دیوار بھی ہمت عالی کے حیرت انگیز کرشمے یاد دلاتے تھے۔ اور اگر فیروز کوہ میں رہ کر سلطان غیاث الدین کو محمود کے قدیم مقبوضات کو واپس لینے کی آرزو ہو سکتی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خاص محمودی پائے تخت کا مالک اُس کے جنوب مشرقی علاقوں کو پھر غزنی کے ماتحت لانے کی سعی نہ کرتا۔ ادھر اُسے اپنے چچا کی طعن یاد تھی جس نے شمس الدین (یا غیاث الدین) کی تخت نشینی کا حال سن کر کہا تھا کہ تیرے بھائی نے یہ نام پیدا کیا دیکھئے تو کیا کر کے دکھاتا ہے؟ غرض غزنی کے علاقے کا انتظام درست کرتے ہی وہ فوج لے کر پہلے سندھ پر بڑھا اور ملتان کو قرامطہ کی بدعملی سے نجات دلائی۔ اسی سال اُچھ فتح ہوا جہاں ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی جس کی بیوی مسلمان حملہ آوروں سے مل گئی (۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء)۔

اس راستے سے تین سال بعد اُس نے گجرات پر فوج کشی کی جس کا قدیم پائے تخت انہلواڑہ (یا نہروالہ) ان دنوں سرستی (سرسوتی) ندی کے جنوبی کنارے پر ساحل بحر سے

[1] ناموں کی اس تبدیلی کے متعلق دیکھئے طبقات ناصری صفحہ ۲۹۔ ایلیٹ نے بھی ایک ضمیمے میں روضۃ الصفا کے حوالے سے اس واقعے کو لکھا ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۴۸۳)۔

باب ۱۵

کوئی پچاس میل دُور (موجودہ ریاست بڑودہ کے شمالی اضلاع میں) واقع تھا۔ اسلامی تاریخوں میں یہاں کے راجہ کا نام **بھیم دیو** لکھا ہے مگر ونسنٹ اسمتھ کی تحقیقات کی رو سے یہ راجہ **مول راج** تھا۔[1] نام جو کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ ان دنوں اُس کی ریاست شمالی ہند کی سب سے قوی اور بڑی ریاستوں میں شمار ہوتی تھی۔[2] مگر معلوم ہوتا ہے مسلمانوں کو راستے کی خرابی اور حریف کی قوت کا صحیح اندازہ نہ تھا اور جب اُن کی تھکی ماندی فوج بہ مشکل سندھ کے ریگستان کو طے کر کے انہلواڑے کے سامنے پہنچی تو راجہ کے لشکر کثیر پر کچھ زور نہ چل سکا اور لڑائی میں تھوڑا سا نقصان بھی مضمحل سپاہیوں کو بددل کرنے کے لیے کافی ہوگیا۔ معزالدین نے بے نیل مرام پسپائی کا حکم دیا اور نقصان و صعوباتِ سفر کے سوا اس حملے میں کچھ اُس کے ہاتھ نہ آیا۔

فارسی تاریخوں میں اس حملے کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی گئی۔ ممکن ہے کہ معزالدین کے سندھی دشمنوں کو انہلواڑے سے کچھ مدد ملتی ہو یا یہ کہ محض سلطان محمود کی تقلید کے جوش میں یہ حملہ کیا گیا ہو۔ بہر حال، اس بے سود مہم سے اتنا فایدہ تو ہوا کہ آیندہ معزالدین کی توجہ پنجاب کی طرف مبذول ہوگئی اور تین حملوں میں یہ علاقہ اور پایۂ تخت لاہور اس کے قبضے میں آگئے (۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء)۔

جنگ ترائن

لیکن محمودی مقبوضات میں پنجاب کے بعض علاقے اور خود یہاں کی پُرانی راج دھانی یعنی قلعہ **بھٹنڈہ** ابھی تک مطیع نہ ہوئے تھے۔ لہٰذا معزالدین کو جب اور طرف سے فرصت ملی تو پھر ادھر بڑھا اور ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء میں یہ مستحکم قلعہ بھی اس نے مسخر کر لیا۔ واضح رہے کہ قدیم اسلامی تاریخوں میں اس قلعے کا نام کہیں تو "بترہندہ" لکھا ہے اور کہیں "سرہندہ" جس سے طرح طرح کے مغالطے پیدا ہوئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک فرشتہ اور لبّ التواریخ کے قول مان لینے میں کوئی حرج نہیں جنھوں نے صاف صاف "بھٹنڈہ" لکھا ہے۔ کیونکہ دوسری شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یہی مقام پہلے "بٹرنڈہ" کے نام سے مشہور تھا اور جے پال راجہ کا پایۂ تخت سمجھا

۱۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۸۹، ۲۱۸۔

۲۔ ٹاڈ، جلد دوم صفحہ ۷۔

باب۱۵

جاتا تھا۔ پس بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اسی لفظ کو بگاڑ کر قدیم مورخ یا اُن کے کاتبوں نے "تبرہندہ" بنادیا ہو۔

الغرض معزالدین اس قلعے میں کچھ فوج اور اپنا عامل مقرر کر کے لاہور کو واپس جارہا تھا کہ اسے پرتھی راج یا رائے پتھورا کے بہت بڑی فوج کے ساتھ بڑھنے کی اطلاع ملی اور اُس نے اپنا شمالی سفر ملتوی کر کے راجہ کی طرف رُخ کیا طبقات ناصری کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ راجہ کی فوج قریب پہنچ گئی تھی لیکن مسلمانوں کے آنے کی خبر سُن کر وہ پیچھے ہٹ گئی یا درحقیقت محض اُس کی جنگی تیاری سُن کر ہی معزالدین چل کھڑا ہوا تھا، غرض اصلیت جو کچھ ہو اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ فریقین کا مقابلہ تھانیسر سے کچھ دور مقام ترائن پر ہوا جو بھٹنڈے سے تقریباً سو میل مشرق میں واقع تھا۔ غالباً معزالدین کی اسی پیش قدمی کی بنا پر انگریزی تاریخوں میں کمال بے احتیاطی سے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ غزنی ہی سے رائے پتھورا پر حملہ کرنے کی غرض سے چلا تھا۔ حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے اور حقیقت میں یہ محض اس کی دلیری تھی کہ ہندی فوج کی جنگ پر آمادگی سُن کر لڑائی پر تیار ہو گیا ورنہ اس کی فوج کی تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھی اور پرتھی راج تین ہزار ہاتھی اور دو لاکھ سوار میدان میں لایا تھا[۱]۔

کرنل ٹاڈ کا بیان ہے کہ دہلی اس وقت ہندوستان کی چار سب سے بڑی راجپوت ریاستوں میں شمار ہوتی تھی اور ایک سو آٹھ راجہ اس کے باجگزار تھے[۲] لیکن واضح رہے کہ اس قوت کا اصلی سبب اجمیر و دہلی کی ریاستوں کا ایک راجہ کی میراث ہو جانا تھا ورنہ خود شہر یا ریاست دہلی کو اس زمانے میں کوئی بڑی اہمیت حاصل نہ تھی اور خود ٹاڈ کی مبہم تحریر سے ظاہر ہے کہ خاص ریاست دہلی کی حدود اس زمانے کی دو قسمتوں (یعنی قسمت میرٹھ اور قسمت دہلی یا انبالہ) سے زیادہ وسیع نہ تھیں[۳] اور گمان غالب یہ ہے کہ خود پرتھی راج نے اس شہر کو اپنا مستقل مستقر بھی نہیں بنایا بلکہ

---

[۱] فرشتہ (بحوالہ زین المآثر) صفحہ ۵۷۔

[۲] اے نلز جلد دوم صفحہ ۷۔

[۳] گزیٹیر جلد ہشتم صفحہ ۸۹۔

باب ۵

یہاں اس کے بھائی کھانڈے رائے یا گوبند رائے کی حکومت رہی۔
یہی کھانڈے رائے ہے جو ترائین کی پہلی لڑائی میں ہراول کا سردار تھا اور سلطان معزالدین اس کے ہاتھ سے زخمی ہوا۔ یہ زخم ایسا کاری لگا تھا کہ روایتِ عام کی بموجب اگر ایک خلجی غلام اُسے نہ سنبھالتا تو وہ وہیں گر پڑتا یا پڑا رہ جاتا۔ سچ پوچھیے تو لڑائی اس کے زخمی ہونے سے پہلے ہی بگڑ چکی تھی اور میمنہ اور میسرہ بہت پہلے پسپا ہو چکے تھے کیونکہ مسلمانوں کا پورا لشکر گویا ہندوؤں کی طویل صف کی گود میں آ گیا تھا اور جب اُن کے آگے بڑھے ہوئے بازو رخ بدل کر قلب کی طرف چلے تو مسلمان دونوں جانب سے نرغے میں آنے لگے اور اس کا سب سے پہلے ہراس میمنہ اور میسرہ کی صفوں میں ظاہر ہوا کہ اُن کے سردار گھبرا کر پیچھے ہٹے اور جس طرح بن پڑا اس حلقے سے نکل گئے۔ قلب کی فوج کو خود معزالدین لڑا رہا تھا اس میں بھی انتشار پیدا ہوا اور ایک امیر نے بڑھ کر عرض کی کہ بازوؤں کے افغان اور خلجی سردار جنھیں بہادری کے بڑے دعوے تھے، میدان سے فرار ہو چکے ہیں اس وقت مناسب یہی نظر آتا ہے کہ فوراً باقی ماندہ فوج کو لے کر جانب لاہور واپسی کا حکم دے دیا جائے معزالدین کو یہ رائے پسند نہ آئی اور تلوار کھینچ کر حریف کے قلب لشکر پر حملہ کیا اور اسی میں وہ زخم کھایا جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے۔ یہ روایت بھی قرینِ صحت ہے کہ وہ زخم کھا کر وہیں گر پڑا تھا اور بہت دیر کے بعد رات کو اس کے غلام میدان جنگ میں اپنے نزدیک اس کی نعش ڈھونڈنے آئے اور اس وقت وہ انھیں زندہ مل گیا۔[۱]
مفرور سپاہی میدان سے چالیس میل کے قریب دُور مقیم تھے۔ وہیں زخمی امیر کو لائے اور پھر لاہور لے گئے جہاں زخم سے شفا پانے کے بعد وہ غزنی آیا اور اس ناکامی کا بدلہ لینے کی تیاریاں کیں۔ انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کو جس طرح بیان کیا ہے وہ سراسر نادرست اور فرشتے کے صریحاً غلط ترجموں[۲] پر مبنی ہے تاہم معزالدین کی اس شکست کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیرہ مہینے کے محاصرے کے بعد قلعۂ بھٹنڈہ دوبارہ پرتھی راج کے

۱۔ فرشتہ ۵۷ بحوالۂ زین المآثر۔
۲۔ چنانچہ اس موقع پر فرشتے کے انگریز مترجموں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا چالیس میل تک تعاقب

باب ۵

ہاتھ آگیا اور اُس نے مسلمان حملہ آوروں کو کامیابی سے روکنے کی ایک جوش انگیز نظیر قائم کردی جس سے اس کی شجاعت وسپہ سالاری کی ہر طرف دھوم مچ گئی چنانچہ ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں جب معزالدین تازہ فوج کے ساتھ دوبارہ لاہور آیا اور پرتھی راج کو اطاعت قبول کرنے کا پیام بھیجا تو راجہ نے سخت جواب دیا اور اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ حلیف اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگئے۔

دوسری جنگ

اگرچہ اس دوسری لڑائی کا مقام بھی مشتبہ ہے لیکن عام روایت یہی ہے کہ وہ اُسی ترائن کے میدان میں ہوئی جہاں پہلی لڑائی ہوئی تھی۔ فریقین کی جنگی تعداد کا زیادہ تفصیل وصحت کے ساتھ علم ہے اور صاحب تاج المآثر نے اسی واقعے سے اپنی کتاب آغاز کی ہے۔ طبقات ناصری کی تحریر کے علاوہ خود فرشتے نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت سی تاریخوں کا نچوڑ ہے اور ان سب کو پڑھ کر ہم آج بھی اس خونریز مقاتلے کا خاصا صحیح اور صاف تصور ذہن میں قائم کرسکتے ہیں۔ معزالدین کی فوج میں ایک لاکھ بیس ہزار یا کچھ کم سوار شامل تھے، اور جدھر سے اُن کا پرا گزرتا وہاں برچھیوں کی کثرت سے نیزوں کا بن نظر آنے لگتا تھا چند ہاتھی بھی تھے مگر انھیں خیمہ وخرگاہ کے ساتھ کئی میل پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ قلب کے دستے بھی بطریق فوج محفوظ ہیں عقب میں تھے اور باقی فوج چار حصوں میں آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے ہر طرف تیراندازوں کے دستے متعین تھے جن کا خاص کام یہ تھا کہ آگے نکل نکل کر غنیم کے جنگی ہاتھیوں پر حملہ کریں اور جب وہ بڑھیں تو یہ پیچھے ہٹ کر ہر طرف منتشر ہوجائیں اور تیر باری سے انھیں پریشان کردیں۔

اس کے جواب میں پرتھی راج نے حملے اور مدافعت کی غالباً کوئی خاص تدبیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کیا گیا اور اسی کو الفنسٹن اور بعد کے انگریز تاریخ نویسوں نے طرح طرح کے بے بنیاد مبالغوں کے ساتھ بیان کیا ہے حالانکہ تاریخ فرشتہ میں کہیں "تعاقب" کا لفظ تک نہیں ہے۔ اس قسم کی بے شمار اغلاط بلکہ اختراعات اور اصل عبارت کا بالکل اُلٹا ترجمہ کرنے کی مثالیں جسے خود انگریزی میں دیکھنی ہوں وہ کم سے کم راورٹی کے حواشی پڑھے۔ ہماری کتاب میں ان کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

باب ۱۱

نہیں سوچی تھی۔ اسے اپنی پہلی فتح اور کثرت تعداد پر غرور تھا اور یہ قریب قریب مسلّم ہے کہ اس مرتبہ تین لاکھ سوار اور بے شمار پیادہ و تیر انداز اس کے ہم رکاب تھے۔ ڈیڑھ سو راجہ اور راجکمار اپنے اپنے دستے لے کر آئے اور قسمیں کھا کھا کر شریک جنگ ہوئے تھے کہ یا ماریں گے یا اسی جگہ مر جائیں گے اور میدان سے پیچھے قدم نہ ہٹائیں گے۔ اس جوش و خروش کا کچھ اندازہ چاند یا چند بھاٹ کے گیتوں سے بھی ہوتا ہے جو پرتھی راج کا مدح خواں تھا اور جس نے ان واقعات کو اپنی طول طویل مثنوی "پرتھی راج راسو" میں نظم کیا ہے۔ افسوس ہے کہ بعد کی تحریفوں نے اس مجموعے کی تاریخی وقعت غارت کردی[1] اور اسی طرح کرنل ٹاڈ کی تحریر بھی ہمارے لیے کارآمد نہیں جو درایت یا صحتِ روایت کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا اور بے تکان خیالی افسانے لکھتا چلا جاتا تھا۔

---

[1] چاند اور اس کی کتاب کے متعلق سر چارلس لائل کی محققانہ رائے بجنسہٖ ذیل میں ترجمہ کی جاتی ہے:-

"چاند جو بھاٹوں کے خاندان سے ہے، لاہور کا باشندہ تھا جہاں اس کے وقت میں (تقریباً ایک سو ستر سال پہلے سے) مسلمانوں کی حکومت قائم تھی اور اس لیے اس کی نظم میں بہت سے فارسی الفاظ موجود ہیں۔ لیکن اس کتاب کا جو نسخہ اب موجود ہے وہ سترھویں صدی کے اوائل میں یعنی چاند کی وفات کو چار سو برس سے بھی زیادہ گزرنے کے بعد میواڑ کے راجہ امر سنگھ نے از سر نو تحریر کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے یہ شبہہ کرنے کی معقول وجہ ہے کہ آیا اس میں چاند کی اصل نظم کسی حد تک بھی اپنی پہلی صورت میں باقی رہی یا نہیں۔ کیونکہ جس قسم کے واقعات اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں وہ ہمارے شبہے کو اور قوی کرتے ہیں۔ مثلاً اس میں جتنی تاریخیں لکھی ہیں، وہ سیا مل داس کی تحقیقات کے بموجب اصلی سنین سے قریب قریب نوے برس کا فرق رکھتی ہیں۔ پھر یہ کہ اس میں قصے کے سورما پرتھوی راج اور سلطان شہاب الدین (محمد غوری) کی بہت سی لڑائیوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے صرف آخری میں اُسے فتح ہوئی ورنہ ہر دفعہ اسی نے شکست کھائی گرفتار بھی ہوا اور فدیہ دے کر چھوٹا۔ حالانکہ ہم عصر اور مستند فارسی تاریخوں میں آخری فتح سے پہلے صرف ایک لڑائی کا حال ملتا ہے

فرشتے کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ لڑائی سے کچھ پہلے فریقین میں جو خط و کتابت ہوئی اُس نے راجپوتوں کو اس قدر مطمئن کر دیا تھا کہ انھیں مسلمانوں کی طرف سے پیش قدمی کا خیال نہ رہا تھا اور اسی لیے جب یکا یک طبل و دمامہ پر چوب پڑی اور دور سے پرچم سُرخ و سیاہ جن پر "نصر من اللہ" لکھا ہوا تھا ہوا میں لہراتے نظر آئے تو وہ حیران ہو گئے اور بہت جلد اپنی صفوف آراستہ کر کے میدان میں داخل ہوئے اور تیسرے پہر تک جان توڑ کے لڑتے رہے۔ لیکن معزالدین کی سپہ سالاری محض جاں بازی کا زور نہ چلنے دیتی تھی۔ صبا رفتار گھوڑوں پر اس کے سدھے ہوئے تیر انداز ہندی بازوؤں کی صفیں اُلٹے دیتے تھے اور غالباً ان صفوں کے پیچھے دبے ہی غوری فوج قلب پر ٹوٹ پڑی اور ہندی سپاہ کا دل بادل پراگندہ ہونے لگا۔ پرتھی راج کے جنگی ہاتھی بازوؤں کی فوج کی امداد اور کبھی اِن قلبی حملوں کی روک تھام کے لیے دوڑتے دوڑتے تھکے جاتے تھے۔ ان عظیم الجثہ حیوانات کا طیش و غضب میں اپنی سونڈوں کو پیچ و تاب دے کر چنگھاڑیں مارنا، بہادروں کا دل ہلائے دیتا تھا۔ ان کی جھولوں میں جو آئینے لگے ہوئے تھے، وہ سورج کی کرن سے چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے مگر غوری شہسواروں کے دلوں میں اس کالی بلا کا خوف تھا بھی تو بہت جلد زائل ہو گیا کیونکہ جب ہاتھی اُن کا رُخ کرتے تو وہ گھوڑوں کو ایڑ لگا کے دُور نکل جاتے اور پلٹ پلٹ کے تیروں کی بوچھار کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ہاتھیوں کے بدن میں تیروں نے گھُس کر انھیں خارپشت سے مشابہ بنا دیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جس میں سلطان کو شکست ہوئی مگر وہ اس مرتبہ بھی بچ کر لاہور چلا آیا تھا کتاب کی پندرھویں فصل میں مغلوں کی آمد واقعے سے تیس برس پہلے دکھائی ہے اور ان کا بہادر پرتھوی راج سے شکست کھانا بیان کیا ہے! اس قسم کی باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ ایسی تحریر بجنسہٖ ایک ہم عصر شخص کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب نہیں (ان تحریفات کے باوجود) کتاب کا معقول حصہ چاند ہی کے زمانے کا ہو اور اس صورت میں جہاں تک جدید تحقیقات کو دسترس ہے، اسی حصے کو ہندی زبان کی سب سے پہلی تحریر مانا جائے گا۔" (انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۳ صفحہ ۴۸۴)۔

باب ۵

معلوم ہوتا ہے اب ہندی فوج سمٹ کر وسط میں جمع ہو رہی تھی اور اُس نے آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا تھا مگر اس کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اسلامی رسالوں کے پیہم حملے زیادہ کارگر نہ ہوتے تھے اور وہ اپنی جگہ قدم جمائے ہوئے لڑ رہی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر معزالدین نے جو قلب کی فوج کو لیے ابھی تک الگ کھڑا تھا، میان سے تلوار کھینچ لی اور اسی اشارے پر بارہ ہزار تلواریں ایک ساتھ میان سے باہر نکل آئیں سواروں نے اپنے برچھے گھوڑوں کے کان پر سیدھے رکھ لیے اور گھوڑے اُڑا کر غنیم پر آ گرے۔ معزالدین کے تازہ دم رسالے کا یہ حملہ نہایت سخت تھا۔ بے دل راجپوت اس کی تاب نہ لا سکے بلکہ پہلے ہی تصادم میں ہندی لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔

اس لڑائی میں گوبند رائے یا کھانڈے رائے والیِ دہلی اور بہت سے راجپوت سردار مارے گئے۔ خود پرتھی راج فرار ہو گیا تھا مگر میدانِ جنگ سے چند کوس کے فاصلے پر گرفتار ہو کے مارا گیا یا دوسری روایت کے بموجب غزنی تک پہنچ کر قید میں مر گیا۔ فریقین کے نقصانات کی ٹھیک تعداد معلوم نہیں۔ تاج المآثر میں ہندی مقتولین کا شمار ایک لاکھ بتایا گیا ہے لیکن اس کتاب کا مصنف انشا پردازی کے زور میں صحت کی چنداں پروا نہیں کرتا اور ایسے جزئی واقعات کے متعلق اس کی سرسری شہادت کافی نہیں۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی لکھنے کے لائق ہے کہ جنگ میں پرتھی راج کی طرف سے افغان (اجیر؟) سپاہی[1] اور معزالدین کی طرف سے اس کے باجگزار راجہ جمّو کا بیٹا خود اپنے ہم مذہبوں کے خلاف لڑنے آئے تھے[2]۔

لڑائی کے نتائج

اس معرکے نے ریاست اجمیر و دہلی کو مسلمانوں کا مطیع بنا دیا تھا۔ لیکن قبول اطاعت اور خراج گزاری کے وعدے پر دونوں جگہ کے راج برقرار رکھے گئے اور مسلمانوں کے مستقل قبضے کی حدود موجودہ ضلع انبالے سے آگے نہ بڑھیں۔ چنانچہ اُن کا سرحدی مستقر ابھی تک کہرام اور

[1] فرشتہ۔ ۵۸۔ ٹاڈ کا بیان ہے کہ قنوج اور نہرواله کی فوج میں تاتاری سپاہی نوکر رکھے جاتے تھے۔ (جلد اول صفحہ ۱۲۱)۔

[2] راورٹی۔ حاشیہ ۴۶۶۔

سمانہ[1] تھا اور غزنی جاتے وقت ان کی حفاظت فاتح نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کر دی تھی۔ مگر دہلی کے راجہ کی اطاعت محض دفع الوقتی کے طریق پر تھی اور جب ایبک ہانسی اور میرٹھ کے سرکشوں کا قلع قمع کر رہا تھا اُس نے بھی بغاوت کی۔ قطب الدین کو چند روز محاصرہ کرنے کے بعد دوبارہ دہلی کو تسخیر کرنا پڑا اور قلعۂ کول (یا علی گڈھ) کی فتح سے "ریاستِ دہلی" کا پورا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ ۵۸۹ھ ۱۱۹۳ میں دہلی مسلمانوں کا مستقر بن گئی لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ خود معز الدین ابھی محض اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کا ماتحت صوبہ دار تھا اور دہلی کے نئے حاکم (قطب الدین) کو تو اس وقت تک "غلامی" سے بھی آزادی نہیں حاصل ہوئی تھی۔

فتح قنوج

ان فتوحات نے اسلامی حکومت کی سرحدیں کئی ہندو ریاستوں کے قریب تک پہنچا دیں جن میں قنوج کا راجہ سب سے زیادہ قوی تھا۔ اس شہر کی عظمت و شہرت کا پہلے ذکر آچکا ہے اور گو اب یہ ایک معمولی ریاست کا پائے تخت رہ گیا تھا اور اس کے مغربی ہمسائے یعنی دہلی کے تمار یا تو ار راجپوت بھی اس کی بالادستی تسلیم نہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ قراین کہتے ہیں کہ معز الدین کا ہم عصر راجہ جے چندر ہندوستان کے سب سے دولت مند اور طاقتور راجاؤں میں شمار ہوتا تھا اور ٹاڈ کی روایت صحیح ہو تو اس کے پاس کئی لاکھ پیادہ اور تیس ہزار زرہ پوش سواروں کی فوج تھی[2]۔ پرتھی راج سے سیاسی رقابت کے علاوہ اس کی عداوت کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ یہ نوجوان راجہ سر دربار جے چندر کی بیٹی کو لے کر بھاگا اور لڑتا بھڑتا اپنے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ پس ترائن کی جنگ میں پرتھی راج کو قنوج سے کسی قسم کی مدد نہیں ملی تھی مگر اس بنا پر بعض تاریخ نگاروں کا یہ قول کہ اُس نے مسلمانوں کی اعانت کی محض بے بنیاد ہے۔ بے شبہہ وہ پرتھی راج کا مخالف تھا لیکن مسلمانوں کا دوست نہ تھا اور جب انھوں نے ریاست دہلی پر مستقل قبضہ کیا تو خود جے چند نے اُن پر حملے کی تیاریاں کیں[3]۔

---

[1] - سمانہ دہلی سے تقریباً ڈیڑھ سو میل اور کہرام (گھرام یا رام گڈھ) اس سے بھی کچھ کم فاصلے پر، آج کل پٹیالے کی ریاست میں واقع ہیں۔

[2] - اے نگز۔ جلد دوم صفحہ ۶ و ۷۔

[3] - راورٹی۔ حاشیہ صفحہ ۵۱۸۔

والیِ دہلی کے پاس ابھی تک پچاس ہزار سوار سے زیادہ فوج نہ تھی اور اس کو ناکافی سمجھ کر خود معز الدین غزنی سے ہندوستان آگیا تھا لیکن لڑائی میں زیادہ تر قطب الدین ہی کی فوج نے حصہ لیا اور غزنی کے صرف ہراول کی مدد سے جے چندر کو موضع چندواڑ یا چندآور پر شکست دی۔ میجر راورٹی کا قیاس ہے کہ غالباً یہ وہی مقام ہے جو اٹاوے سے چند میل جنوب مشرق میں آج کل "چندوال" کہلاتا ہے۔ راجہ جے چند اس لڑائی میں مارا گیا اور نہ صرف قنوج بلکہ ہندوستان کا "دل" یعنی گنگا جمنا کا دوآبہ (بنارس تک) مسلمانوں کے قبضے میں آگیا (۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء) اور اس کے ولایتِ دہلی سے علیحدہ، تین صوبے بنا دیے گئے **کول، بداوں** اور **اودھ** جہاں کے والی یا عامل براہ راست معز الدین کے ماتحت تھے۔[۱] اسی طرح جب سال ڈیڑھ سال کے بعد قلعۂ تھنگر (**بیانہ**) فتح ہوا تو وہاں ایک علیحدہ والی مقرر کر دیا گیا۔

اس واقعے کے بعد خود معز الدین کو کئی سال تک ہندوستان آنے کی فرصت نہیں ملی اگرچہ یہاں کے صوبوں سے ہر سال محاصل کی رقم اور واقعات کی اطلاع اسے پہنچتی تھی اور وہ مناسب وقت احکام بھیجتا رہتا تھا۔ ان ہندوستانی صوبوں کے مختصر حالات آئندہ ہماری نظر سے گزریں گے۔ لیکن اس فصل کو ختم کرنے سے پہلے بعض واقعات لکھنے ضروری ہیں جن میں پہلا یہ ہے کہ ۵۹۹ھ / ۱۲۰۳ء میں سلطان غیاث الدین نے انتقال کیا اور معز الدین باضابطہ "سلطان اعظم" کے لقب سے ملقب ہوا مگر اس نے پائے تخت نہیں بدلا بلکہ غور میں اپنے ایک بھتیجے کو حاکم بنا کے خود غزنی میں رہا اور یہیں سے وہ جنگی مہم خوارزم لے گیا جس کے آخر میں سخت شکست ہوئی اور وہ رنجیدہ و ناکام واپس آیا۔ شاہ خوارزم سے مصالحت ہو گئی تھی لیکن سلطان فوج کی از سرِ نو تنظیم کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں سرحدِ ہند کے **کھوکھروں** کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ یہ سرکش و جنگجو قوم پشاور سے لاہور کے قریب تک شمال مغربی پنجاب کے پہاڑی علاقے میں پھیلی ہوئی تھی اور سلطان کی پچھلی شکست نے

---

[۱] ان صوبوں کی صاف صاف تصریح نہ ہونے سے، بعد کی تاریخوں میں سخت غلطی پیدا ہو گئی ہے اور اس تمام علاقے کا حاکم قطب الدین ایبک کو سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ عرصے تک وہ اس کے ماتحت نہ تھے جیسا کہ طبقاتِ ناصری سے ثابت ہے۔ مگر اس کے ثبوت تاریخ مذکور کے مختلف مقامات پر منتشر ہیں۔ راقم الحروف نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ناصری ۱۴۰۔ راورٹی حواشی صفحہ ۴۶۹ و ۵۱۹۔

اسے اتنا دلیر کر دیا تھا کہ ان کی قزاقی کے خوف سے لاہور کا صوبہ دار سالانہ محاصل کی رقم غزنی نہ بھیج سکا اور معزالدین کو ان سرکشوں کی تادیب کے واسطے خود ہندوستان آنا پڑا۔ حکم کے مطابق غالباً خود قطب الدین ایبک دہلی سے کمک لے کر پہنچ گیا تھا اور ان بادشاہی فوجوں نے گھیر گھیر کر باغیوں کو کئی شکستیں دیں اور آخر ان کے سرداروں نے ہتھیار ڈال دیے پھر مالگزاری کی باقیات لے کر انھیں معافی دے دی گئی۔ (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء)

سلطان کا قتل

اس مہم کے بعد سلطان واپس جا رہا تھا اور جہلم کو عبور کر چکا تھا کہ چند باطنی فدائیوں نے[1] اُسے خیمہ میں گھس کر دوپہر کو سوتے میں یا دوسری روایت کے بموجب، مغرب کی نماز پڑھتے میں قتل کر دیا (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء) اور خود بچ کر نکل گئے۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کھوکھروں کی ایک جماعت نے کیا جس کے رشتہ دار پچھلی لڑائی میں مارے گئے تھے۔ لیکن اس عہد کی قریبی تاریخوں اور دیگر شہادتوں سے یہ امر یقینی نظر آتا ہے کہ قاتل فرقۂ ملاحدہ کے چند فدائی تھے اور انھی نے بعد میں یہ بے بنیاد افواہ مشہور کر دی تھی کہ اس قتل کے بانی **امام فخرالدین رازی**[2] ہیں جن کے شاہ خوارزم کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔

---

[1] ۔ فدائیوں کی جماعت کا خاص کام یہ تھا کہ وہ اپنے سرگروہ یا امام کے حکم کی بموجب ہر ایسے مسلمان بادشاہ یا عالم کا جو اس فرقۂ ملاحدہ کا مخالف ہو، کام تمام کر دے۔ سلطان معزالدین سے اِن کی عداوت کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ اُس نے سندھ میں قرامطہ کا استیصال کیا اور خود کہستان (ایران) میں باطنیوں کو سخت شکستیں دیں بلکہ معلوم ہوتا ہے اس کی سرپرستی میں جو علما اس فرقے کے عقائد کی تردید و تکذیب کر رہے تھے، اُس نے اخلاقی اور مذہبی طور پر باطنیوں کو سخت نقصان پہنچایا اور بہت سے لوگ اُن کے عقاید سے تائب ہو کر پھر جمہور اہل اسلام سے آملے۔

[2] ۔ امام ممدوح جنھوں نے تفسیر، علم کلام، اصول فقہ اور نیز طب میں نہایت ضخیم اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں، ہرات کے رہنے والے تھے۔ زندگی میں تصنیف سے بڑھ کر اُن کے وعظ کی دھوم تھی اور خود سلطان معزالدین کے لشکر میں عرصے تک انھوں نے باقاعدہ ہر ہفتے وعظ کہا ہے۔ ۶۰۶ھ / ۱۲۰۹ء میں انتقال ہوا۔

باب ۹

دوسری فصل "ملوک مُعزیہ" (ہند میں)

معزی غلام

اہل ہند کو سلطان معزالدین سام کے صرف اوصاف سپہ سالاری دیکھنے کا موقع ملا اور اسی لیے بخوفِ طوالت ہم نے اس کے ذاتی اوصاف بیان کرنے سے پہلوتہی کی ورنہ اس کے سوانح پر تفصیلاً غور کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمعصر مصنفین نے اس کی مدح میں جو کچھ لکھا وہ محض مبالغہ یا بادشاہ سرائی نہیں بلکہ سچی تعریف ہے جس کا وہ فی الواقعی مستحق تھا۔ اور یہ مصنف متفق ہیں کہ علاء الدین جہاں سوز جیسے خونخوار چچا کا یہ مسکین بھتیجا نہایت خدا ترس، عادل، رعایا پرور و فیاض بادشاہ تھا۔[1] غلاموں پر اس کی شفقت ضرب المثل ہے کہ اس بے بس گروہ کے صدہا افراد کو کمال توجہ سے بہترین تعلیم و تربیت دلاتا، اور اولاد کی مثل عزیز رکھتا تھا جو داس کے نرینہ اولاد نہ تھی اور اسی بنا پر جب کسی مصاحب نے متاسفانہ یہ تمنا ظاہر کی کہ کاش اللہ تعالیٰ آپ کو فرزند عطا فرماتا کہ اس وسیع سلطنت کے وارث ہوتے اور آپ کا نام روشن کرتے۔ تو سلطان نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ بادشاہوں کے صرف چند بیٹے ہوا کرتے ہیں مگر مجھے خدا نے ہزاروں فرزند عطا فرمائے ہیں جو میرے بعد سلطنت کے وارث اور میرا نام قائم رکھنے والے ہوں گے۔ اور یہ محض قول نہ تھا بلکہ امیرانہ تربیت اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے غلاموں کو دے کر اُس نے عملی طور پر اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ اپنا آئندہ وارث انھی غلاموں کو بنانا چاہتا ہے جو حسب قابلیت ترقی کر کے منصب امارت تک پہنچ جاتے تھے۔

سلطان تاج الدین یلدوز

ان میں چار یا پانچ وہ خوش نصیب غلام تھے جنھوں نے اپنے شریف آقا کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے حصوں پر ایک عرصے تک مستقل فرماں روائی کی۔ باقی وہ جو امارت یا سپہ سالاری کے منصب تک پہنچے شمار سے باہر ہیں۔ مگر بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] راورٹی حاشیہ صفحہ ۴۸۷۔

ان میں سلطان معزالدین کو **تاج الدین یلدُز** (ایلدُوز) سب سے زیادہ عزیز تھا اور کم سے کم خاص غزنی میں وہ اپنا جانشین اسی کو بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس وصیت کے مطابق سلطان کے بھتیجے (فرماں روائے غور) نے بھی یلدُز کی بادشاہی تسلیم کر لی تھی اور وہ بیرون ہند علاقے کا باضابطہ فرماں روا ہو گیا تھا۔ لیکن جب اُس نے دریائے سندھ کے مشرق میں ملک پنجاب پر تصرف کرنا چاہا تو **قطب الدین ایبک** نے جو ممالک ہند میں خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر چکا تھا، مقابلہ کیا اور تاج الدین کو شکست کھا کر کرمان میں پناہ لینی پڑی۔ سلطان قطب الدین کا خاص پائے تخت غزنی پر قبضہ ہو گیا تھا لیکن وہ فتح کی خوشیاں منانے ہی میں رہا اور اس کا حریف یک بیک دوبارہ غزنی آپہنچا۔ قطب الدین کو بدقت بھاگ کر ہندوستان واپس آنا پڑا اور شہر پھر سلطان تاج الدین کے قبضے میں آگیا۔ یہ غالباً ۶۰۵ھ/۱۲۰۹ء کا واقعہ ہے اور اس کے سات برس بعد تاج الدین نے پھر ایک مرتبہ ہندوستان کا رُخ کیا تھا لیکن سلطان شمس الدین کے ہاتھ سے شکست کھائی اور گرفتار ہو کر بداؤں لایا گیا اور وہیں وفات پائی۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے زمانے تک وہاں اس کی قبر "زیارت گاہِ مردم" تھی۔[1]

قباجہ اور طغرل — سلطان کا ایک اور غلام **ناصر الدین قباجہ** (یا قباچہ)[2] تھا جس نے اپنے آقا کی وفات کے بعد سندھ میں بادشاہی کا اعلان کیا اور بائیس برس بڑی سطوت کے ساتھ وہاں حکومت کرتا رہا۔ سلطان تاج الدین اور قطب الدین سے بارہا اس کی لڑائیاں ہوئیں اور یہ تینوں حریف شمالی پنجاب پر دعوئی ملکیت کرتے رہے لیکن سلطان شمس الدین کے زمانے میں دہلی کی سلطنت اس قدر قوی ہو گئی کہ کوئی حریف اس کا ہم پلہ نہ رہا اور آخر میں افواج دہلی نے خود سندھ پر پیش قدمی کی۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں یہ ملک فتح ہو گیا اور قباجہ نے دریا میں ڈوب کر اپنی جان دے دی۔

---

[1] منتخب التواریخ صفحہ ۵۶۔

[2] قیاس عام کی بموجب عربی لفظ "قبا" پر فارسی حرف تصغیر کا پیوند لگا کر یہ مرکب بنایا ہے جس کے معنی "چھوٹی قبا" کے ہوں گے۔ اس کا معرب قباجہ ہوا لیکن بعض فارسی مصنف فارسی "چ" کو قائم رکھتے ہیں اور قباچہ ہی لکھتے ہیں۔

باب ۵

قطب الدین ایبک کا ایک اور حریف **بہاءُ الدین طغرل**، سلطان معزالدین کا بہت قدیم اور محبوب غلام تھا جسے (غالباً سنہ ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء میں) سلطان تھنکر (بیانہ) کا والی مقرر کرتے وقت وعدہ کر گیا تھا کہ اگر اُس کی کوششوں سے قلعہ گوالیار فتح ہوا تو وہ علاقہ بھی طغرل کے سپرد کر دیا جائے گا۔ طغرل کی فیاضیاں مشہور تھیں اور دُور دُور سے لوگ آکر اس کی سرکار میں ملازمت کرتے تھے۔ رہنے کے واسطے اُس نے ایک نیا قلعہ "سلطان کوٹ" تعمیر کیا تھا اور خاص گوالیار کے قریب اس قسم کے مورچے تیار کرائے تھے کہ فوجیں اطمینان کے ساتھ مقیم رہ کر اہلِ قلعہ کو پیہم حملوں سے تنگ کر سکیں۔ اس تدبیر نے گوالیار والوں کو بالکل عاجز کر دیا اور جب طغرل کے مقابلے میں کسی طرح مدافعت نہ کر سکے تو انھوں نے ایک اور چال چلی کہ خفیہ طور پر اپنے آدمی بھیج کر قطب الدین ایبک سے مصالحت کر لی اور قلعہ اس کے فرستادہ اشخاص کے حوالے کر دیا۔ طغرل کو یہ اطلاع ہوئی تو نہایت ناراض ہوا اور عجب نہ تھا کہ اُس کی ایبک سے جنگ چھڑ جائے لیکن یہ نوبت آنے سے پہلے اُس نے وفات پائی اور تقدیر نے قطب الدین کا ایک خطرناک حریف کم کر دیا (سنہ ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء)۔

محمد بن بختیار خلجی

ہندوستان میں سلطان معزالدین کا ایک اور مشہور سردار **اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی** ہے جس کے نام، قومیت اور حالات لکھنے میں انگریزی مورخوں نے عجیب عجیب غلطیاں کی ہیں۔ اختصار کے لیے بعض فارسی تاریخوں میں اس کا نام "محمد بختیار" لکھا ہے اور درحقیقت یہاں اضافت محذوف، اور "محمد بن بختیار" مراد ہے۔ لیکن دوسری غلطی، یعنی محمد بن بختیار کو قوم کا افغان اور معزالدین یا قطب الدین کا غلام بتانا بعض انگریز مورخوں کی ذاتی اختراع ہے جس کا کسی ماخذ سے ثبوت نہیں مل سکتا۔ راورٹی نے "انگریز اہل تحقیق" کی جن اغلاط کی سختی سے تردید کی ہے، ان میں سے ایک یہ بات بھی ہے۔ میجر موصوف لکھتے ہیں کہ "خلج خالص تُرکی قبیلہ ہے اور اس قوم کی ہر تاریخ میں ان کا حال موجود ہے۔ اس قبیلے کے بعض گروہ زیر نظر عہد سے کچھ مدت پہلے افغانستان کے جنوب مغربی علاقے میں آبسے تھے اور پھر غور و غزنی کی فوجوں کے ساتھ ہندوستان میں آئے۔"[1]

غرض، اختیار الدین یا محمد بختیار خلجی اسی تُرکی قبیلے کا سپاہی تھا اور اسے خدا نے

---

[1] راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۴۸۔

فراست و شجاعت کے ساتھ غیر معمولی جسمانی قوت عطا کی تھی۔ مگر اس کا قد و قامت اور صورت کچھ ایسی غیر متناسب تھی کہ غزنی اور دہلی دونوں جگہ کے بھرتی کرنے والے عہدہ داروں نے اسے فوج میں کوئی عمدہ خدمت دینے سے انکار کر دیا اور وہ بداؤں ہو کر اودھ کے صوبہ دار ملک حسام الدین کی سرکار میں آیا جہاں جنگی خدمات کے صلے میں اسے بہت جلد پرگنہ بھگوت اور بھیولی جاگیر میں عطا ہوئے جو موجودہ مرزاپور و بنارس کے اضلاع میں واقع تھے۔ یہ سہارا پاکر محمد بختیار نے منیر و بہار کے قریبی اضلاع پر حملے کرنے شروع کیے اور تھوڑے ہی دن میں اس کی شہرت نے بہت سے خلجی سپاہیوں کو اس کے گرد جمع کر دیا۔

فتح بہار و بنگالہ

واضح رہے کہ اس وقت، یعنی چھٹی صدی ہجری یا بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم سے کم ملک بہار کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی۔ رام پال کے بعد جس کا سنہ وفات قیاساً (سنہ ۱۱۳۰ء یعنی) سنہ ۵۲۴ھ کو قرار دیا گیا ہے پال خاندان کی حکومت میں زوال آگیا تھا اور سین خاندان کے راجہ صرف مشرقی بنگالے کے حاکم تھے۔ غربی بنگالے اور بہار میں کوئی مرکزی سلطنت ایسی نہ تھی کہ محمد بن بختیار خلجی کی یورشوں کا خاطر خواہ انسداد کر سکتی حتیٰ کہ مشہور وقایع نویس تارناتھ اور بعض بنگالی مصنفوں نے رام پال کے ساتھ اس خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا ہے حالانکہ اس کے بعد پانچ راجہ گدی پر بیٹھے[1]۔ اگرچہ ان کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی اور قیاس چاہتا ہے کہ دستور کے موافق یہاں بھی ہر علاقے کا زمیندار خود مختار رئیس بن گیا ہوگا۔

اول اول محمد بن بختیار خلجی کی سہل فتوحات کا بڑا سبب یہی طوائف الملوکی تھی جس کی انگریزی تاریخوں میں صراحت نہ ہونے کی وجہ سے سخت غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ تاریخ نویس فاتح کو معمولی جاگیردار کی بجائے مسلمانوں کی شاہی افواج کا سپہ سالار اور سلطان معز الدین یا قطب الدین کا فرستادہ سردار بتاتے ہیں جو سراسر غلط ہے[2]۔

---

[1]۔ ارلی ہسٹری اوف انڈیا صفحہ ۴۰۱۔

[2]۔ "کرانیکلز اوف دی پٹھان کنگز" صفحہ ۱۱۰ جس میں محمد بن بختیار کو اودھ کا "سپہ سالار" بتایا گیا ہے۔ مارش مین اور دیگر درسی تاریخوں کو چھوڑ کر جن میں بالکل بے سر و پا روایات درج ہیں ہندوستان کی تازہ ترین انگریزی تاریخ بھی محمد کو قطب الدین ایبک کا سپہ سالار (جنرل) بتاتی ہے (اوکسفورڈ ہسٹری

باب ۱۲

بے شبہ قلعہ بہار و منیر کی تسخیر[1] کے بعد وہ بہت سے تحائف لے کر قطب الدین سے ملنے آیا، (جو اس وقت غالباً تمام ہندوستان کا اعلیٰ صوبہ دار مقرر کر دیا گیا تھا) اور اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صفحہ ۲۲۱) اور یہ محض نگاہ کی غلطی یا سرسری چوک نہیں ہے بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے صورت حال کو مطلق نہیں سمجھے اور اسی وجہ سے فتح بہار و بنگالہ کے متعلق ان کی تمام تحریر ایک ناواقف شخص کی فرضی گفتگو نظر آتی ہے۔

[1] اس تسخیر کے سنہ میں بہت اختلاف ہے مگر اکثر مورخ ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء لکھتے ہیں، جسے راورٹی صحیح نہیں سمجھتا۔ اس فتح کے متعلق ایک اور روایت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ قلعۂ بہار فتح ہوا تو وہاں ہندوؤں کی بہت سی کتابیں نکلیں اور چونکہ بہ قول صاحب طبقات ناصری، وہاں کے تمام برہمن لڑائی میں قتل کرا دیے گئے تھے، لہٰذا اُن کا پڑھنے والا کوئی نہ ملا۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب اس پر یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ "ضرور وہ سب جلا دی گئی ہوں گی" (آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۲۲۱) اسمتھ صاحب کی "تحقیقات" کے متعلق تو کچھ کہنا سننا فضول ہے جنھوں نے طبقات ناصری کا وہ انگریزی ترجمہ پڑھنے پر بھی جو راورٹی نے کیا ہے اپنی رائے نہ بدلی۔ حالانکہ اس میں سرے سے اس روایت ہی کی تغلیط موجود ہے کہ ان کتابوں کا کوئی پڑھنے والا زندہ نہیں رہا تھا (حاشیہ ۵۵۲) لیکن اس موقع پر یہ صراحت کرنی ضروری ہے کہ درحقیقت یہ کتب خانہ بودھ مت والوں کا تھا اور قصبۂ بہار ابتدا میں انھی کے درویشوں کی ایک خانقاہ تھی۔ بعد میں جب بودھ مت کی صورت اور تعلیم بدلی اور یہ مقام بھی ایک جنگی قلعہ بن گیا تو یہاں کی قدیم خانقاہ اور کتب خانہ محض بزرگوں کی یادگار رہ گیا اور اگر وہاں درویشوں کا کوئی گروہ موجود بھی ہوگا تو یقیناً وہ ان قدیم علوم سے بہت کم واقف ہوگا، جنھیں برہمنوں نے مٹا دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ بہار کی تسخیر کے وقت اس کی مختصر آبادی میں زیادہ تر سپاہی پیشہ لوگ تھے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے یا بھاگ گئے اور غالباً انھیں کسی دوسرے قصبے کے ہندوؤں کو بلا کر یہ کتابیں پڑھوانی پڑیں جیسا کہ طبقات ناصری میں مجملاً اور زبدۃ التواریخ میں صراحتہً مذکور ہے (ملاحظہ ہو راورٹی کا مذکورۂ بالا حاشیہ) غرض گو تفصیلی حالات موجود نہیں لیکن جو شہادت محفوظ ہے اُسی سے یہ ثابت کرنا دشوار نہیں کہ انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اور جس سے فاتحین کی خونخواری اور وحشیانہ سفاکی دکھانی مقصود ہے، وہ خود لکھنے والوں کی ناواقفیت یا تعصب پر دال ہے۔

بہت کچھ تعریف و مدارات کی گئی لیکن یہ ملاقات محض ایک نیم آزاد والی کی حیثیت سے تھی ورنہ قطب الدین کی طرف سے پہلے یا بعد میں اُسے کوئی فوجی امداد نہیں ملی اور اُس نے ان مشرقی صوبوں میں جو کچھ کیا، اپنی قوت بازو سے کیا۔ الغرض بہار میں اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے بعد محمد بختیار خلجی نے مشرقی بنگالے پر فوج کشی کی۔ وہاں اُن دنوں لکشمن سین کی حکومت تھی (جسے مسلمان مورخ رائے لکھمینہ لکھتے ہیں) اور اس کا پائے تخت "نُوبودویپ" یا "نُودِیہ" (ندیا) تھا جو کلکتے سے کوئی ساٹھ میل شمال میں واقع ہے۔ سین خاندان کے اس راجہ کی قوت بھی پہلے سے کمزور ہو چکی تھی لیکن محمد بختیار نے اس کے شہر کو جس طرح فتح کیا وہ اس کی دلیری کی حیرت انگیز مثال ہے۔ کیونکہ جب دو منزلہ سہ منزلہ کوچ کرتا ہوا وہ شہر کے قریب پہنچا تو اس کی ساری فوج پیچھے رہ گئی تھی اور صرف اٹھارہ سوار ساتھ دے سکے تھے۔ مگر اس اولوالعزم سردار نے کچھ پروانہ کی اور انھی چند سواروں کو لیے ہوئے شہر کے بازاروں سے چپ چاپ گزر کے شاہی قلعے یا محل کے دروازے تک پہنچ گیا۔ بازار کے لوگ یہی سمجھتے رہے کہ وہ کوئی سوداگر ہے اور اپنے گھوڑے دکھانے راجہ کے پاس آیا ہے کہ محل کے پھاٹک پر پہنچ کر اس نے یکایک تلوار کھینچ لی اور دربانوں کو مارتا کاٹتا اندر داخل ہو گیا۔ اس اچانک حملے سے محل بھر میں شور مچ گیا۔ راجہ کھانا کھانے بیٹھا تھا کہ چیخ پکار کی آوازیں آئیں اور وہ ایسا بے حواس ہوا کہ ننگے پاؤں محل کے چور دروازے سے نکل کے بھاگا اور محل یا اندرونی قلعے پر محمد کا قبضہ ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ نڈر سردار اپنے اٹھارہ سپاہیوں کے ساتھ کتنے دن تک محل کی مدافعت کرتا رہا یا یہ کہ خوف زدہ شہر والوں کو اس پر حملہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی؟

بہر حال اُس کی فوج بہت جلد تو دیہ آ پہنچی اور شہر و مضافات مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔

اس واقعے سے حملہ آوروں کی شجاعت و دلیری کے ساتھ اہل بنگالہ کی بزدلی بھی ثابت ہوتی ہے۔ ان مرطوب ممالک میں بہت کم جانباز اور جری سپاہی پیدا ہوئے ہیں اور خود مسلمان فاتحین کی نسلیں چند صدی میں کمزور و ضعیف ہو گئیں۔ لیکن جانبازی کے علاوہ معلوم ہوتا ہے محمد بن بختیار کو اپنی جسمانی قوت پر

باب ۱۵

ناز تھا اور وہ جو تنہا ہاتھی سے لڑ چکا تھا،[1] پست قامت بنگالیوں کی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتا تھا۔

راجہ لکشمن سین نودیہ سے بھاگ کر بکرم پور چلا آیا تھا جو ڈھاکے سے چند میل جنوب مشرق میں واقع ہے اور وہاں وہ اور اس کی اولاد غالباً مسلمانوں کی باجگزار بن کر عرصے تک حکومت کرتی رہی۔ کم سے کم فاتح کو اب ملک میں کسی حریف کا خوف نہ تھا اور اس نے بہار و بنگالہ میں جابجا اسلامی مدارس اور رباط و خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ اسلامی خطبہ، سکّہ[2] اور دیگر آئین کو رواج دیا اور اپنا پائے تخت لکھنوتی یا گور (گوڑ) کو بنایا جو نودیہ سے سو سوا سو میل شمال میں گنگا کے دوسری جانب واقع ہے۔ یہ اُس وقت چھوٹی سی بستی تھی۔ محمد بن بختیار نے صوبے کا مستقر اور نئی عمارات بنا کے اُسے بڑی رونق دی اور اسی وجہ سے بعض مورخوں نے اس شہر کی بنا کو اس سے منسوب کر دیا ہے۔

تبت کی ناکام مہم

لیکن ایسے منچلے سپاہی سے نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ نئے مقبوضات کے انتظام کے بعد اب اُسے بالکل فرصت اور بنگالے کی تازہ دولت قبضے میں تھی۔ یہ سُن کر کہ لکھنوتی سے تبت و ترکستان زیادہ دور نہیں ہیں، اسے ان ممالک کی فتح کا شوق چرایا۔ سکم کے

---

[1] یہ قطب الدین ایبک سے مذکورۂ بالا ملاقات کے وقت کا واقعہ ہے کہ بعض حاسد امیروں نے محمد بن بختیار کی تعریفیں کر کے تجویز کی کہ اسے ہاتھی سے لڑایا جائے۔ محمد نے کچھ شرم حضور اور کچھ قوتِ خداداد کے بھروسے پر یہ مقابلہ منظور کر لیا، اور میدان میں جب ہاتھی (سونڈ اٹھا کے) اس کی طرف بڑھا تو آہنی گُرز کی ایک دودستی ضرب اس زور سے اُس کے مُنہ پر لگائی کہ ہاتھی کو چکر آ گیا، اور مقابلے سے بھاگ گیا (طبقات ناصری۔ ۱۴۸ و ۵۵)۔

[2] اس بارے میں طبقات ناصری کی عبارت صاف نہیں ہے، لیکن راورٹی، اور اڈورڈ ٹامس کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ خطبہ و سکّہ سلطان معزالدین کے نام کا جاری کیا گیا تھا اور بعض فارسی اور انگریزی تاریخوں کا یہ قول غلط ہے کہ اُس نے خود اپنے نام کا سکّہ جاری کرایا جو خود مختاری کی علامت سمجھا جاتا تھا (راورٹی حاشیہ ۵۵۹۔ نیز دیکھو "کرانکلز آف دی پٹھان کنگز" حاشیہ صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۱)۔

ایک نومسلم سردار نے رہبری کا ذمہ لیا اور محمد بن بختیار دس ہزار سوار لے کر تبت کے ارادے سے روانہ ہوگیا۔ اپنی سرحد سے آگے چند منزل پر اس نے وہ ندی (بنگ متی) پار کی جس پر بہت قدیم محراب دار پل بنا ہوا تھا۔ اس ندی کا نام فارسی تاریخوں میں نئی نئی طرح سے لکھا ہے اور ملا عبدالقادر بدایونی اسے برہم پتر لکھ کر تصریح کرتے ہیں کہ یہی دریا "برہم کدی" کے نام سے مشہور ہے۔ حال میں اس دریا اور پل کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ وہ برہم پتر نہ تھا تو اس کا کونسا معاون تھا اور نہ یقینی طور پر اُس مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے جہاں تک محمد بن بختیار خلجی کی فوج پہنچی۔ بعض انگریز تاریخ نویسوں کا قیاس ہے کہ وہ سکم کے علاقے میں موجودہ دار جیلنگ سے کچھ بہت آگے نہیں جا سکا اور یہیں کے قبائل سے جو لڑائی ہوئی اس میں فتح پانے کے باوجود بہت سے مسلمان سوار کام آئے۔ اور انھیں معلوم ہوا کہ آئندہ اور بھی زیادہ تعداد سے سخت لڑائیاں لڑنی پڑیں گی۔ غرض محمد بن بختیار نے سرداروں سے مشورہ کیا اور یہ رائے قرار پائی کہ اس وقت مراجعت اور آئندہ سال زیادہ وسیع پیمانے پر فوج کشی کی جائے۔

واپسی پر وہ پل جس سے دریا عبور کیا تھا، ٹوٹا ہوا ملا۔ اس علاقے کے باشندوں کو مسلمانوں کی ناکام مراجعت کی خبر مل گئی تھی اور اب وہ ہزاروں کی تعداد میں اُن کا یہیں خاتمہ کر دینے پر آمادہ تھے۔ میدانی مقابلے میں مسلمان کامیاب ہوئے، لیکن اس غیر علاقے میں زیادہ قیام ناممکن تھا۔ کشتیاں میسر نہ تھیں۔ ناچار اُنھوں نے دریا میں گھوڑے ڈال دیے کہ جس طرح ممکن ہو دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں جہاں اُن کے حلیف یا باجگزاروں کا علاقہ تھا۔ عبور کی اس خطرناک کوشش میں ہزاروں سپاہی ڈوب گئے اور محمد بن بختیار خلجی اپنی سرحد میں پہنچا ہے تو اس کے ہمراہیوں میں سے دسواں حصہ بھی بچ کر سلامت نہیں آیا تھا۔ اس ناکامی کے رنج اور صعوباتِ سفر نے اُسے ایسا بیمار ڈالا کہ پھر وہ اپنے مستقر لکھنوتی تک بھی نہ پہنچ سکا اور چند روز بعد دیوکوٹ ہی میں جو اس کا سرحدی ضلع تھا، وفات پائی (۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء)۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کے ایک سردار علی بن مردان خلجی نے اسی بیماری میں اسے قتل کر دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہ محض شبہہ تھا جس کی بنا پر علی کو گرفتار کیا گیا اور شاید ثبوت جرم نہ ہونے ہی کے باعث کسی قصاص کی نوبت نہیں آئی۔

پھر قید سے نکل کر وہ سلطان قطب الدین ایبک کی پناہ میں دہلی پہنچ گیا تھا اور کچھ عرصے بعد وہاں سے ولایت بنگالہ کی سند لے کر لکھنوتی آیا جب سلطان قطب الدین کا انتقال ہوا تو اُس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس اعتبار سے بنگالے کا پہلا مسلمان بادشاہ یہی **علی بن مردان** خلجی ہے۔ اگرچہ، جیساکہ ہم آگے پڑھیں گے، بنگالے کے مسلمان حاکموں کی یہ خود مختاری کچھ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکی اور **علی مردان** کے جانشین کو سلطان شمس الدین ایل تمش نے شکست دے کر بنگالے میں اپنے نام کا خطبہ و سکہ رائج کرایا اور **بہار** کو جداگانہ صوبہ قرار دے کے وہاں ایک علیٰحدہ والی مقرر کیا تاکہ لکھنوتی یا بنگال خاص کے صوبہ داروں کی قوت حد سے زیادہ بڑھنے نہ پائے جن کا دارالسلطنت سے دُور ہونا ہمیشہ انھیں خود مختاری کی ترغیب دلاتا رہتا تھا۔

تیسری فصل قُطب الدّین ایبک

سلطان قطب الدین ایبک

نگرانِ "مُلوکِ معزیہ" میں سب سے زیادہ اقبال مند سلطان معزالدین کا ایک بدصورت غلام **قطب الدین**، جسے چھنگلیا کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے "ایبک شَل" یعنی خستہ انگشت کہتے تھے۔ اور یہ ہنسی کا عُرف ایسا زباں زد ہوا کہ اس کا پہلا حصہ بادشاہ ہونے کے بعد بھی قطب الدین کے نام کا جزو بنا رہا حالانکہ اس کے لفظی معنی صرف "انگشت" ہیں۔

ترائن کی دوسری لڑائی کے بعد کہرام و سمانہ میں اس کے والی مقرر کیے جانے کا حال ہم گزشتہ فصل میں پڑھ چکے ہیں جنوب مشرقی پنجاب کے یہ علاقے سلاطین غزنی کے عہد میں بار بار فتح ہو چکے تھے لیکن راقم الحروف کا قیاس ہے کہ سلطان معزالدین غوری انھیں مستقل طور پر ایک علیٰحدہ صوبہ بنا کر اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی پہلی تدبیر، یعنی صرف قلعۂ بھٹنڈہ کو سرحد کی ایک جنگی چوکی بنانا، ناکافی اور ناکام ثابت ہوئی تھی۔ دہلی اور شمالی راجپوتانے کی ریاستوں پر دباؤ رکھنے کے واسطے زیادہ فوج کی ضرورت تھی خاص کر اب، جب کہ اجمیر و دہلی کی قبول اطاعت کے ضمن میں ان ریاستوں کے اور چھوٹے چھوٹے راجہ بھی اصولاً مسلمانوں کے باجگزار ہو گئے تھے۔

نظر بریں، فوج کے مصارف نیز دیگر انتظامات کے لیے جنوب مشرقی پنجاب کے اُس علاقے پر مستقل قبضہ کرلیا گیا جس میں موجودہ ریاست ہائے این رُوئے ستلج اور قسمت انبالہ کے شمالی اضلاع شامل تھے۔ اس نئے صوبے کی سب سے جنوبی چھاؤنی ہانسی میں تھی۔

لڑائیاں اور فتوحات

یہ انتظام کرنے کے بعد سلطان معزالدین غزنی چلا گیا تھا لیکن اُس کے نئے صوبہ دار کو بہت جلد میرٹھ اور پھر دہلی پر فوج کشی کرنی پڑی۔ تاج المآثر کی عبارت سے یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کا راجہ جو کھانڈے رائے (یا گوبند رائے) کا عزیز تھا اور سلطان سے اطاعت کا عہد کرچکا تھا، اب منحرف ہو گیا تھا، لیکن میرٹھ کے متعلق اس قسم کی کوئی تصریح موجود نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ وہاں کے راجہ سے بھی قطب الدین باضابطہ باجگزاری کا اقرار لینا چاہتا تھا اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے حملہ کرکے یہ قلعہ فتح کرلیا۔ دہلی کی تسخیر میں کسی قدر زیادہ محنت اور دیر لگی لیکن فتح کے بعد اس پر قطب الدین نے قبضہ کرلیا اور کچھ عرصے بعد اسی شہر کو اپنا مستقر قرار دیا جس کے معنی یہ تھے کہ سلطان معزالدین کے نئے صوبے میں اب اضلاع میرٹھ و دہلی بھی شامل ہو گئے۔[1]

اس اثنا میں پرتھی راج کے بھائی نے اجمیر پر حملہ کیا۔ یہ ریاست پرتھی راج کے بیٹے **گولہ** (یا گولہ) کے حوالے کردی گئی تھی اور وہ اطاعت و خراج گزاری کے عہد پر قائم تھا۔ روایت میں اس کا نسب مشتبہ بتایا گیا ہے اور شاید راجپوتوں کے اس پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اسے پرتھی راج کا جائز وارث نہیں سمجھتے تھے، غرض انھوں نے پرتھی راج کے بھائی **بھراج** یا **ہیم راج** کی ماتحتی میں اجمیر کا محاصرہ کرلیا۔ غالباً ریاست اجمیر پر دباؤ رکھنے کی غرض سے مسلمانوں کی ایک جمعیت رنتھنبور میں پہلے سے متعین تھی اور اس موقع پر اس کی سلامتی بھی خطرے میں نظر آتی تھی۔ لہٰذا خود قطب الدین کو دہلی سے مدد کے واسطے آنا پڑا مگر بھراج اس مرتبہ لڑے بھڑے بغیر میدان سے ہٹ گیا اور قطب الدین راجہ گولہ کو وفاداری کے صلے میں خلعت دے کر واپس چلا آیا (۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء)

ظاہر ہے کہ ان فتوحات نے معزالدین کے پہلے انتظامات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کردی تھی اس لیے خود قطب الدین نے غزنی جاکر تمام واقعات اور صورت حال کی اطلاع دی اور

---

[1] تاج المآثر لذیر عنوان "استخلاص میرٹھ و دہلی" نیز ملاحظہ ہو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۱۶۔

باب ۵

اپنے آقا کی مزید خوشنودی اور اعتماد حاصل کرکے دہلی آیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد قلعۂ کول (علی گڈھ) کی تسخیر اور قنوج کے راجہ کی جنگی تیاریاں سن کر معز الدین کا آنا اور دوآب کی فتح کا ذکر اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ یہاں اتنا اضافہ کر دینا مناسب ہوگا کہ گو ان علاقوں میں تین یا کم سے کم دو صوبے علیحدہ بنا دیے گئے تھے۔ لیکن غالباً اسی زمانے میں قطب الدین کو صدر صوبہ داری یا اپنے آقا کی نیابت عطا کی گئی جس کے معنی صرف یہ تھے کہ ہندوستان کے دیگر صوبہ دار اپنے محاصل اور سالانہ اطلاعیں قطب الدین کی وساطت سے غزنی بھیجتے رہیں ورنہ اپنی اپنی جگہ پر ان کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی۔ ۵۹۱ھ (۱۱۹۵ء) میں قطب الدین کو پھر بھراج سے لڑنا پڑا جس نے اپنے بھتیجے گولہ کو اجمیر سے نکال کر شہر پر قبضہ کر لیا تھا، اور خود دلی کی طرف فوج روانہ کی تھی۔ اس راجپوتی فوج کو شکست ہوئی اور مسلمان اس کا تعاقب کرتے ہوئے اجمیر تک بڑھ آئے۔ بھراج نے باہر نکل کر مقابلہ کیا مگر ہزیمت پائی اور خودکشی کرکے اپنی جان دی۔ اجمیر پر مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا اور اب کے انھوں نے اجمیر میں مسلمان والی مقرر کیا کہ گرد و نواح کے سرکش راجپوتوں پر نظر رکھے۔ اسی سلسلے میں قطب الدین نے نہر والہ تک بڑھ کر ملک کو دشمنوں سے صاف کرنے کی کوشش کی اور وہاں کے راجہ بھیم دیو کو شکست دے کے بہت دور تک بھگا دیا۔

فتح نہر والہ

واضح رہے کہ شمالی ہندوستان میں اب یہی ایک بڑی ہندو ریاست باقی رہ گئی تھی اور اگرچہ وہ تا امکان پہلے سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے والوں کو مدد دیتی رہتی تھی، لیکن مذکورۂ بالا واقعے نے وہاں کے راجہ کو سخت اندیشہ مند کر دیا، اور اسی لیے جب آئندہ سال راجپوتانے میں پھر بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ مسلمانوں سے لڑنے پر کمر بستہ ہوئے تو نہر والہ کے راجہ نے اُن کی مدد کے واسطے بہت بڑی فوج آراستہ کی کیونکہ درحقیقت اب اُسے خود اپنی ریاست خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔

قطب الدین کو دہلی آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ راجپوتوں کے اس نئے جتھے کی اطلاع ملی اور اگرچہ سخت گرمی کا موسم تھا لیکن اُس نے کوشش کی کہ نہر والہ کی فوج کے پہنچنے سے پہلے راجپوتانے کے سرکشوں کا قلع قمع کر دے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دن پہلے ان کے مقابلے میں آ پہنچا تھا لیکن اُس دن لڑائی میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ مسلمان مارا مار صدہا کوس چل کر آئے تھے اور سفر ختم نہ ہونے پایا تھا کہ لڑائی شروع ہو گئی اور سخت گرمی میں،

جو ان کے مزاج و عادت کے بالکل خلاف تھی، وہ راجپوتوں سے مصروفِ جنگ ہو گئے۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح ہوتے ہی نہروالہ کی فوج آ پہنچی اور مزید کثرت نے دشمن کی ہمت مضبوط اور مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے۔ بایں ہمہ قطب الدین تھوڑی دیر تک اپنی بے دل فوجوں کو لڑاتا اور ذاتی بہادری سے اپنے سپاہیوں کو جوش دلاتا رہا۔ لیکن جب کامیابی کی کوئی امید باقی نہ رہی، ادھر زخم کھا کے اُس کے گھوڑے نے اسے زمین پر گرا دیا اور لوگوں نے بہ مشکل اُسے دوسرے گھوڑے پر سوار کیا تو وہ مجبوراً اجمیر کی طرف پسپا ہوا[ل]۔

اس کامیابی نے ہندوؤں کو اور بھی دلیر کر دیا۔ وہ مسلمانوں کا تعاقب کرتے ہوئے خاص اجمیر تک پہنچ گئے اور شہر سے کچھ فاصلے پر مقیم ہو کر کئی مہینے تک معمولی لڑائیاں لڑتے رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ مسلمانوں کا پوری طرح محاصرہ نہیں کر سکے اور جب غزنی سے تازہ کمک آنے کی اطلاع ملی تو جلد ہٹ کر منتشر ہو گئے۔

اب قطب الدین نے راجہ نہروالہ سے انتقام لینے کا تہیہ کیا اور ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء میں گجرات پر پیش قدمی کی۔ کوہِ آبو کے دامن میں راجہ کی فوج سے نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ خود راجہ بچ کر نکل گیا تھا لیکن اس کے پائے تخت پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، (ماہ ربیع الاول ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء) اور انھوں نے مستقل طور پر اس شہر میں اپنا والی مقرر کر دیا۔ بایں ہمہ یہ شہر جزیرہ نمائے گجرات سے باہر واقع تھا اور اس کی فتح سے مسلمان صرف ریاست نہروالہ کے شمال مشرقی حصے پر قابض ہو سکے۔ خاص جزیرہ نما اب تک ان کے اقتدار سے باہر رہا۔ البتہ اس راجپوت ریاست کی قوت ٹوٹ گئی اور اب وہ مسلمانوں کی ایسی خطرناک حریف نہ رہی جیسی کہ اس جنگ سے پہلے تھی۔

اس نمایاں کامیابی کے بعد معلوم ہوتا ہے قطب الدین کئی سال تک سلطنت کے اندرونی نظم و نسق کی اصلاح کرتا رہا اور ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء سے قبل اُسے کسی فوجی مہم کی ضرورت

ل۔ عام انگریزی تاریخوں کا ذکر کیا، خود فرشتہ نے اس واقعے کے بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا وہ راورٹی کی تحریر پر مبنی ہے جس نے اس واقعے کے لکھنے میں بھی حسب عادت بڑی تحقیقات اور احتیاط سے کام لیا ہے (دیکھو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۲۰)۔

نہ پیش آئی۔ سنہ مذکور اس نے بندیل کھنڈ کی ریاستوں پر لشکر کشی کی۔ لڑائی کا ظاہری حیلہ تو یہ تھا کہ یہ راجہ سلطان محمود کے وقت سے خراج گزاری کا جو عہد کر چکے ہیں اس کی تجدید کرائی جائے۔ لیکن قرینہ کہتا ہے کہ درحقیقت وہ دوآب کی حفاظت کے واسطے ان جنوبی ہمسایوں کو زیر کرنا چاہتا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ بندیل کھنڈ کے زیر نگیں آنے سے اسلامی سلطنت کی جنوبی حدود کوہستان بندھیاچل تک پہنچ گئیں اور تمام شمالی علاقے پہلے کی نسبت زیادہ محفوظ ہو گئے کیونکہ ان پہاڑوں کے دوسری جانب (یعنی وسط ہند میں) بھی کوئی ایسا جنگ جو ہمسایہ نہ تھا جس کی قوت خطرناک سمجھی جاتی۔

تتمہ باب ۱۵

اس عہد کی تاریخیں

آئندہ واقعات تاریخی کو بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ یہاں ہم اس عہد کے تاریخی ماخذوں پر ایک سرسری نظر ڈال جائیں۔ ہر مسلمان کشور کشا کے ساتھ اس کے مورّخ کا ہونا قریب قریب لازمی بات تھی اور اسی لیے فارسی تواریخ میں تمام اسلامی بادشاہوں کے تاریخی حالات خاصی تفصیل کے ساتھ محفوظ ہیں خاصکر جو بادشاہ زیادہ عرصے تک حکمراں رہے یا اپنے وقت کے اقبال مند فاتح گزرے ہیں اُن کے حالات بھی زیادہ مشرح موجود ہیں لیکن اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تاریخیں بالعموم بادشاہوں کے "جنگی وقایع" کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں بیشتر اُن کے رزمیہ کارنامے درج ہیں خاص خاص رفاہی کام، دربار کے جلسے، اور دیگر مشاغل شاہی کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ غیر معمولی حادثے، وبا، قحط، زلزلے یا اور بعض واقعات جن کا اثر ہمہ گیر ہوا ضمناً مذکور ہیں ورنہ مجموعی طور پر مورّخ کو بادشاہ کے صرف شخصی سوانح سے بحث ہوتی ہے اور عام اہلِ مُلک کے متعلق وہ کچھ بھی تحریر نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ سلطنت کے نظم و نسق اور آئین و مناصب یا ملکی تجارت و مصنوعات پر بھی ان کتابوں سے بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ زمانۂ حال کے مورّخ کی ضروریات ان تاریخوں سے پوری نہیں ہوتیں کیونکہ آج کل تاریخ لکھنے والے کا سب سے مقدّم فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ گذشتہ عہد کے آئین و قوانین، تمدن و معاشرت اور عام افکار و خیالات کی تصویر دکھانے کی کوشش کرے جس سے حال و مستقبل کے بہتر بنانے میں ہمارے خیال کو راہ ملے اور ہم اپنے اسلاف کے حالات سے کوئی مفید سبق حاصل کر سکیں۔

ان جدید ضروریات کے لحاظ سے بہت کم فارسی تاریخیں ایسی ہیں جو ہمیں تاریخ ہند لکھنے میں مدد دے سکتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ حال میں ہندوستان کی جو انگریزی تاریخیں لکھی گئیں اور مدارس کے نصاب میں داخل ہیں، اُن میں کشت وخون کی بے لطف داستانوں کے سوا کوئی کام کی بات نہیں نظر آتی۔ مگر اس کا الزام خود تاریخ لکھنے والوں کی ناواقفیت اور بے پروائی کو دینا چاہیئے کہ انھوں نے اُس عہد کے حالات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور دو چار فارسی تاریخیں سامنے رکھ کر اپنی کتاب تالیف کرلی۔ حالانکہ ان تشنہ تاریخوں کے علاوہ ہمارے پاس دوسری کتابوں کا بھی ذخیرہ موجود ہے جن سے اُس زمانے کے ٹھیک ٹھیک حالات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً ہم عصر علما کی تصانیف، صوفیا کے ملفوظات، مکتوبات، سوانح۔ شعرا کے تذکرے، دواوین، عام ادبی تصانیف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ جتنا زیادہ مطالعہ وسیع ہوگا اسی قدر ہم اُس عہد کے لوگوں کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم کرسکیں گے۔ مگر اتنی وسعتِ نظر کے ساتھ افسوس ہے کہ ہندوستان کے اسلامی بادشاہوں کی کوئی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔

واضح رہے کہ سو دو سو برس پہلے جب کہ چھاپے کا رواج نہیں تھا، کسی کتاب کے قلمی نسخوں کا محفوظ رہنا کچھ معمولی بات نہ تھی۔ چنانچہ صدہا کتابیں جن کے نام اور حوالے موجود ہیں، اب بے نشان ہوگئیں اور اسے بھی محض اپنے اسلاف کے علمی شوق کی دلیل سمجھنا چاہیے کہ ہزاروں آج تک محفوظ رہیں اور ہمیں ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ بایں ہمہ جو کتابیں موجود ہیں اُن کے قلمی نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کا رہ جانا گویا ناگزیر ہے اور جب تک بڑی احتیاط کے ساتھ ان کی تصحیح نہ کی جائے وہ اکثر ناقابل اعتبار نکلتے ہیں۔

طبقات ناصری اور اس کا انگریزی ترجمہ

زیر نظر عہد کی مشہور تاریخ **طبقات ناصری** اس کی مثال ہے جسے چند سال ہوئے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شایع کیا تھا۔ چھاپنے میں تصحیح کا اہتمام کیا گیا پھر بھی مطبوعہ نسخہ جا بہ جا غلط چھپا۔ اور کہیں کہیں سے معلوم ہوتا ہے عبارت ہی اُڑ گئی جس سے مطلب خبط ہوجاتا ہے۔ البتہ اس کے مترجم میجر ایچ، جی راورٹی کو جس قدر داد دی جائے کم ہے کہ انھوں نے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت نہ صرف بہت سے قلمی نسخوں کا بہ احتیاط مقابلہ کیا

تحفۂ بابِ ہند

بلکہ قریب قریب ساٹھ دوسری تاریخیں سامنے رکھ کر نہایت مفصل اور محققانہ حواشی لکھے ہیں اور اصل کتاب میں اختصار کی وجہ سے جو ابہام ہیں یا کہیں کہیں غلطی اور کمی رہ گئی ہے اُسے بڑی محنت سے دُور کیا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے حواشی متن کتاب سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں اور یہ انگریزی ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں چھپا ہے۔ اس فاضل مترجم کی سعی و تحقیق کو دیکھ کر قدرتی طور پر خیال آتا ہے کہ اگر ایسے چار پانچ اور محقق بھی ہندوستان کی فارسی تاریخوں پر توجہ کریں تو یقیناً بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں رفع ہو جائیں اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ اپنی اصلی شکل میں ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکے۔ غرض سلطان ناصر الدین کے زمانے تک میجر موصوف کا ترجمہ تاریخی معلومات کا لاجواب ذخیرہ ہے اور ہم نے اس کتاب کے ان ابواب کے لکھنے میں اس سے جا بجا مدد لی ہے۔ حاشیۂ زیریں پر جہاں کہیں صرف "راورٹی" کا حوالہ دیا ہے اس سے بھی میجر موصوف کا یہی ترجمہ طبقاتِ ناصری مراد ہے۔

حالاتِ مولف

اصل کتاب اور اس کے مولف **قاضی منہاج الدین** "جوزجانی" کے متعلق چند فقرے ایزاد کرنے ضروری ہیں کہ یہ بزرگ اس عہد کے نہایت مشہور علما و قضاۃ کے خاندان سے ہے سلاطین معینیہ کے آخری عہد میں یہ لوگ ہرات کے ایک شمالی ضلع "گوزگان" یا "جوزجان" میں رہتے تھے اور سلاطین غور سے اُن کے قدیمی تعلقات تھے۔ چنانچہ جب لاہور پر سلطان معز الدین کا قبضہ ہوا تو ہمارے مولف ہی کے باپ کو وہاں کی غوری افواج کا قاضی مقرر کیا گیا تھا بعض مورخوں نے اسی بنا پر یہ قیاس کیا ہے کہ وہ (یعنی مولفِ طبقات) لاہور میں پیدا ہوا لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ خود اس کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ اُس نے ہندوستان کی سرزمین اس وقت دیکھی جب کہ اُس کی عمر تیس سال سے متجاوز تھی اور اس وقت بھی اول اول وہ اُچھ (سندھ) میں آیا (۶۲۴ھ ۱۲۱۶ء) جہاں ابھی تک ناصر الدین قباچہ کی حکومت تھی۔ یہاں اس کی بہت عزت کی گئی اور اُچھ کی مشہور درس گاہ

۱؎ ۔ ان تاریخوں کے نام مترجم صاحب موصوف نے دیباچے میں اور نیز صفحہ ۸۲۹ (جلد دوم) پر تحریر کیے ہیں۔

تتمۂ باب ۱

مدرسۂ فیروزی کا وہ نگراں یا صدر معلّم مقرر ہوا[1]۔

تھوڑے دن بعد جب سلطان شمس الدین ایل تتمش نے قباچہ کو شکست دی اور اُچھ فتح کرکے دہلی گیا تو مولّف موصوف اس کے ہمراہ تھا، اور چند سال بعد گوالیار کا قاضی اور خطیب مقرر ہوا۔ پھر سلطانہ رضیہ کے زمانے میں وہ دہلی کے سب سے بڑے مدرسے ناصریہ کا صدر بنایا گیا اور اس عہدے سے ترقی کرکے خاص دار السلطنت کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا (۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء) لیکن سال آئندہ ایک جھگڑے کی وجہ سے اس کو یہ منصب اور دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنوتی آنا پڑا اور یہاں چند سال رہ کر اس نے بنگالے اور وہاں کے حکّام کے حالات سے واقفیت حاصل کی آخر میں غیاث الدین بلبن کی وساطت اور سلطان ناصر الدین کی مہربانی سے وہ پھر دہلی کا قاضی القضاۃ اور نیز خطاب "صدر جہاں" سے ملقب ہوا اور "تاریخ طبقات ناصری" لکھنے کے علاوہ ایک اور مثنوی "ناصر نامہ" بھی اُس نے اسی فیاض و حلیم بادشاہ کے نام پر نظم کی[2]۔

علوم ظاہری کے ساتھ مولّف موصوف علم باطنی یعنی تصوف میں بھی خاص درجہ رکھتا ہے[3]۔ اور مجموعی طور پر اس کے معزز اور ثقہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اسے تاریخی واقعات جمع کرنے کا نہایت عمدہ موقع حاصل تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گو وہ تاریخ کا عمدہ نقاد نہیں اور نہ اس کی کتاب عربی تاریخوں کی طرح مفصل اور جامع ہے، بایں ہمہ اول سے اس کو نہایت مستند و معتبر مانا جاتا ہے اور اسی شہرت کی بنا پر بعد میں ضیاء الدین برنی کو ہندوستان کی آیندہ تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔

تاج المآثر

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صاحب طبقات ناصری فارسی زبان کے سب سے قدیم نثر نگاروں میں داخل ہے اور پروفیسر براؤن نے اس کی تاریخ کا

---

[1] - طبقات ناصری صفحہ ۱۴۴۔

[2] - طبقات ناصری صفحہ ۲۱۰۔

[3] - اخبار الاخیار ۷۸ - فوائد الفواد صفحہ ۱۹۱ نیز دیکھو راورٹی کا "تذکرۂ مولّف" صفحہ ۳۰ و ۳۱۔

تتمۂ باب

خاص طور پر ذکر کیا ہے[1]۔ کیونکہ در حقیقت طبقات ناصری کی تکمیل، یعنی ۶۵۸ھ / ۱۲۴۸ء تک فارسی علم ادب میں نثر کی بہت کم کتابیں نظر آتی ہیں مگر اس اعتبار سے ہندوستان کا ایک اور فارسی ادیب بھی قابل تذکرہ ہے جس کا پروفیسر براؤن نے ذکر نہیں کیا۔ ہماری مراد تاج المآثر کے مصنف صدر الدین محمد بن حسن نظامی سے ہے جو چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان چلا آیا تھا اور اس کی کتاب بھی طبقات ناصری سے تیس بتیس برس پہلے مکمل ہو گئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر وہ ہندوستان کا سب سے پہلا مسلمان مورخ ہے جس کی اصل کتاب فارسی میں اب تک محفوظ ہے اور کتاب کے ایک قدیم نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ترائن کی دوسری جنگ (۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء) سے ۶۲۶ھ / ۱۲۱۷ء یا کچھ آگے تک کے حالات جمع کیے تھے[2] مگر مصنف کا خاص ممدوح قطب الدین ایبک ہے اور عام نسخوں میں زیادہ تر اسی کی فتوحات کا ذکر ملتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب جو نہایت عمدہ ہم عصر تاریخ ہو سکتی تھی مصنف کے شوق انشا پردازی کی بدولت محض شاعرانہ نثر کا ایک دلچسپ نمونہ رہ گئی ہے۔ جنگ کے اسلحہ، بزم کے لوازم، قدرتی مناظر اور موسموں کے بیان میں اس نے ورق کے ورق رنگ دیے ہیں۔ تحریر میں طرح طرح کی رنگینیاں اور صنعتیں دکھائی ہیں لیکن تاریخی واقعات و حالات کی تفصیل پر مطلق توجہ نہیں کرتا اور اسی لیے یہ کتاب مورخ کے لیے چنداں کارآمد نہیں۔ البتہ اس کی مرصع تحریر سے ایک حد تک اس عہد کے ادبی ذوق اور علمی خیالات کا پتا چلتا ہے اور کبھی کبھی خراسان و غور کے جنگ آزما شہسواروں کی تصویر بھی آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔

جامع الحکایات

ایک اور قدیم کتاب جو پایۂ تخت دہلی میں تکمیل کو پہنچی جامع الحکایات ہے[3]۔ اس کا مولف نور الدین عوفی ساتویں صدی ہجری کے اوائل کے مشہور فضلا میں شمار کیا جاتا تھا اور گو اس کا تذکرۂ شعرا "لباب الالباب" بھی نہایت کارآمد مجموعہ ہے

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۴۷۰۔

[2] الیٹ جلد دوم صفحہ ۲۱۰۔

[3] کتاب کا پورا نام "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" ہے۔

تتمۂ باب

لیکن اسے کبھی "جامع الحکایات" کی سی شہرت حاصل نہیں ہوئی جو اول سے فارسی علم ادب کی نہایت مقبول اور چیدہ کتاب مانی جاتی ہے۔ عوفی کا وطن بخارا تھا لیکن کفار مغل کی یورشوں نے جب ان علاقوں میں تباہی پھیلائی تو بہت سے اہل علم کی طرح وہ بھی پھرتا پھراتا سندھ آیا اور قباچہ کی سرکار میں "جامع الحکایات" لکھنے پر مامور ہوا۔ کتاب پوری نہیں ہوئی تھی کہ قباچہ اور اس کی ریاست کا خاتمہ ہوگیا اور قاضی منہاج الدین سراج کی طرح عوفی بھی سلطان شمس الدین کے دربار میں دہلی آگیا یہیں اس نے ۶۲۳ھ/۱۲۲۵ء کے قریب یہ کتاب پوری کی اور اسے اپنے فیاض مربی نظام الملک جنیدی کے نام سے معنون کیا جو اس زمانے میں سلطنت دہلی کا وزیر تھا۔ کتاب میں انبیاء، اولیا، اور بادشاہوں کے قصے اور محاضرات جمع کیے ہیں اور ان میں بہت سی روایتیں ایسی ہیں جو مورخ کے لیے نہایت کام کی چیز ہیں اور خود عوفی نے انھیں ایسے مستند ماخذوں سے جمع کیا ہے کہ ان کی صحت میں چنداں شبہہ نہیں ہو سکتا، لیکن یہ روایتیں مختلف ابواب کے تحت میں کچھ اس طرح متفرق ہیں کہ پوری کتاب کا مطالعہ کیے بغیر ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ تھوڑے دن ہوئے پروفیسر براؤن اس مفید کتاب کو چھاپنے کا انتظام کر رہے تھے اور ان کے زیر نگرانی یہ کام ہوا تو امید ہے کہ یہ دقتیں بھی ایک حد تک حل ہو جائیں گی۔[1]

بعد کی تاریخیں

ان مشہور تاریخوں کے علاوہ اس موضوع پر اور کتابیں بھی اس زمانے میں لکھی گئی ہوں گی جو مفقود و بے نشان ہوگئیں اور بعض کے صرف نام دوسری کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچ سکے ہیں لیکن اس نقصان کی ایک حد تک تلافی اس طرح ہوگئی ہے کہ بعد کے مورخوں نے ان قدیم ماخذوں سے نہ صرف مدد لی بلکہ جابجا ان کی اصلی عبارتیں نقل کر دی ہیں۔ اس قسم کی تالیفات میں زیادہ مشہور وہ ہیں جو اکبر بادشاہ کے زمانے میں مرتب ہوئی تھیں۔ واضح ہو کہ اس بادشاہ کے حکم سے قدیم کتابوں کا نہایت عمدہ ذخیرہ جمع کیا گیا تھا، اور بہت سے ادیب تصنیف و تالیف کے کام پر مامور تھے۔ سلطنت کے

۱۔ جامع الحکایات اور عوفی کے حالات کو تذکرہ لباب الالباب کے دیباچے میں کافی تفصیل و تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو الیٹ جلد دوم صفحہ ۱۵۵۔

امن و استحکام اور تیموری خون کی تازہ آمیزش نے مسلمانان ہند کے دل میں نئے ولولے اور علمی شوق پیدا کر دیے تھے غرض عہد اکبری میں چند تاریخیں ایسی تالیف ہوئیں جو درحقیقت بہت سی قدیم اور مستند تاریخوں کا لُبِّ لباب تھیں اور اب تک ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں طبقات اکبری۔ منتخب التواریخ (بدایونی) اور تاریخ فرشتہ زیادہ مشہور ہیں کہ ان کے مولفوں نے اپنے عہد سے چند صدی پہلے تک حالات اس خوبی سے جمع کیے ہیں کہ قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت خاص اس زمانے کی لکھی ہوئی کتابوں کے ساتھ ان کے بعد کی تالیفات کو بھی سامنے رکھنا ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

باب ۱۶

پہلی فصل :- دکن کی ریاستیں

اگرچہ بعض اوقات نربدا ندی کے جنوب میں تمام جزیرہ نمائے ہند پر "دکن" کا اطلاق کر دیتے ہیں، لیکن درحقیقت مسلمانوں کے عہد میں اس لفظ نے ایک حد تک اصطلاحی شان پیدا کر لی تھی اور دریائے کرشنا اس کی جنوبی سرحد سمجھا جاتا تھا جس کے سو سوا سو میل جنوب میں بڑھ کر "تامل کام" یعنی سرزمین تامل آجاتی ہے اور وہ پہاڑیاں جو مدراس کے شمال سے ہلالی شکل میں کوہ نیلگری تک آئی ہیں "جنوبی ہند" کی حدِ فاصل ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ دریا اور پہاڑ سے بڑھ کر جو چیز کسی ملک کو دوسرے ممالک سے جدا کرتی ہے وہ وہاں کے باشندوں کی قومی خصوصیات ہیں اور نسل و زبان کے لحاظ سے بھی "تامل کام" کے باشندے اپنے شمالی ہمسایوں سے متمیز ہیں، اسی بنا پر ہم اس فصل میں "دکن ریاستوں" سے صرف وہ ریاستیں مراد لیں گے جو کرشنا کے شمال میں تھیں۔ البتہ میسور کو جنوب میں ہونے کے باوجود دکن میں شامل کرنا پڑا کیونکہ دورِ وسطیٰ میں اس ریاست کا جو تعلق اہل شمال کے ساتھ رہا وہ جنوبی ہند والوں سے نہ تھا۔

لیکن جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ کو شروع کرنے سے پہلے ہمیں اس مضمون کی مشکلات پیش نظر رکھنی چاہئیں جنھیں قدیم تاریخ ہند کے مشہور مولف ونسنٹ اسمتھ نے ان الفاظ میں

باب ۱۶

بیان کیا ہے :-

"اگرچہ تحقیقات جدید کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے جزیرہ نمائے ہند کی قدیم تاریخ کو جوڑ کر اُس کا ڈھانچہ تیار کر لیا ہے لیکن ان خالی ہڈیوں پر ہر جگہ گوشت پوست چڑھا کر مسلسل تاریخ کی صورت میں پیش کرنا محال ہے۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کی قابلِ تعریف کوشش اور دیدہ ریزی سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، اُن سے فائدہ اُٹھانا گو ناگزیر ہے مگر تاریخ کے معمولی طالب علم کے لیے وہ زیادہ دلچسپ نہیں ہو سکتے اور نہ اُن کا یاد رکھنا آسان ہے۔ خاصکر جنوبی ہند کے فرماں رواؤں اور مشاہیر کے اکثر نام ایسے طویل و ثقیل ہیں کہ اُن کا محفوظ رکھنا بہت دشوار ہے ×× ××× دوسرے یہاں کی ریاستیں بیرونی دنیا سے کچھ ایسی بے تعلق تھیں کہ اُن کے تفصیلی واقعات صرف مقامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے کار آمد ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ اور دیگر وجوہ ایسی موجود ہیں کہ زمانۂ وسطیٰ کی ان جنوبی ریاستوں کا حال لکھنا، شمالی ریاستوں کی پیچیدہ تاریخ لکھنے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔۔۔"

خاندان چالوکیا کا فروغ

ابتدائی ابواب میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ دکن اور جنوب ہند دراوڑی اقوام کا گھر ہے۔ آریوں کے سیلاب سے تمام دراوڑی اقوام شمالی ہند کو خیرباد کہہ کے بندھیاچل کے جنوب میں آباد ہو گئیں اور اپنی سلطنتیں قائم کر لیں۔ جو تمدن وادئ سندھ میں پایا جاتا ہے اس کے اکثر اجزا دکن اور جنوب ہند میں بھی آئے ہوں گے۔ چنانچہ آندھرا، کرناٹک، اور تامل کام کے قدیم ادب اور آثار قدیمہ سے اس تمدن کا پتا چلتا ہے۔ رامائن میں بھی اس تمدن کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ لیکن آریوں کے دکن میں آنے سے پہلے کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ یہاں کونسی راجدھانیاں تھیں اور راجگان تھے۔ البتہ جب سے آریوں کا ورود ہوا دکن اور جنوب ہند کی چند جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ شمالی ہند کے تسلط کے صدیوں بعد آریا، دکن میں آئے، ورنہ بندھیاچل ان کی جنوبی سرحد تھی۔ قیاس یہ ہے کہ ساتویں صدی ق م کے اوائل میں آریا، دکن کی طرف آنے لگے۔ پہلے یہ برار میں آباد ہوئے، غالباً اس وقت برار آباد خطہ تھا اور اس کے بعد مہاراشٹر میں گوداوری کے

باب

کنارے آباد ہونے لگے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۳۵۰ ق م سے پہلے یہ تنجور، اور مدورا تک تمام مُلک سے واقف ہو گئے تھے۔ لیکن مہاراشٹر میں ان کا تسلط بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مرہٹی زبان براہ راست سنسکرت سے مشتق ہے۔ جنوب میں جس کو مُلک تامل کہنا چاہیے آریوں کی درآمد نہیں ہوئی۔ یہاں زبان اور قومیت پر آریوں کا اثر نہیں ہے۔

سب سے پہلے راجہ اشوک کے کتبات میں دکن اور جنوب ہند کا ذکر ملتا ہے۔ جب شمالی ہند میں سلطنت مُوریا قائم ہوئی اور اس کی وسعت بڑھی تو دکن بھی اس کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ چنانچہ راجہ اشوک کے عہد میں جس نے ۲۶۳ ق م سے ۲۲۹ ق م تک حکومت کی ہے دکن کا بہت بڑا حصہ سلطنت مُوریا کے زیرِ نگیں تھا، لیکن یہ اقطاع دُور دراز ہونے کی وجہ سے سلطنت مُوریا سے ملحق نہیں تھے بلکہ اس کی سیادت تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ برار، جہاں بھوج قبیلہ حکومت کرتا تھا نیم خود مختار راجدھانی تھی۔ اس کے علاوہ راشٹک۔ پیٹنک علٰحدہ راجدھانیاں تھیں جن پر سلطنت مُوریا کا اثر تھا، لیکن جب راجہ اشوک کا انتقال ہو گیا اور آہستہ آہستہ سلطنت مُوریا کمزور ہو گئی تو دکن کو شمال سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ یہاں ایک ایسی نئی طاقت قائم ہو گئی کہ وہ نہ صرف جنوب بلکہ شمال میں بھی اس کا سکّہ چلنے لگا، یہ آندھرا سلطنت تھی۔ اس کا اصل جغرافیہ تو دکن کا مشرقی حصہ ہے جہاں تلنگی زبان بولی جاتی ہے اور غالباً اس سلطنت کے ابتدائی رئیس اس زمانے میں بھی یہاں حکومت کرتے تھے جبکہ سلطنت مُوریا قائم تھی، ممکن ہے کہ سلطنت مُوریا کے یہ باجگزار ہوں۔ لیکن جب سلطنت مُوریا کو زوال ہو گیا، اور مگدھ میں سنگ خاندان اور کانو خاندان قابض ہو گئے تو آندھرا راجگان کو فروغ ہونے لگا۔ قیاس یہ ہے کہ ۲۷ ق م کے لگ بھگ اس سلطنت آندھرا کو فروغ ہوا، اور یہ اتنی ترقی پا گئی کہ جنوب سے آگے بڑھ کر مگدھ پر بھی قابض ہو گئی اور کانو خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ دکن میں یہ تمام مہاراشٹر پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دکن کی بہت بڑی سلطنت تھی جو چار صدیوں تک حکومت کرتی رہی اور اس کے کم و بیش ۳۰ راجگان گزرے ہیں ان میں بعض تو ایسے طاقتور تھے کہ انھوں نے مالوہ اور گجرات کی شاکہ سلطنتوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس دَور میں تمدن کے تمام شعبے عروج پر تھے۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے کئی شواہد پائے جاتے ہیں۔ اور پرانوں سے کئی شہر اور قصبوں کے نام ملتے ہیں جو

باب ۱۶

آندھرا راجگان کی سرپرستی میں آباد ہوئے تھے۔ دریائے گوداوری کے کنارے پیٹن کا قصبہ ان کی یادگار اب تک موجود ہے۔ آندھرا خاندان کے زوال اور خاتمے کے بعد جو تیسری صدی عیسوی میں ہوا، دکن کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہیں، اور اگر بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں یا حکمراں خاندانوں کا پتا چلتا بھی ہے تو ان کے صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں[1]۔ اور سچ پوچھئے تو عہدِ وسطیٰ کی جو کچھ بری بھلی تاریخ موجود ہے وہ چالوکیہ خاندان کے عہدِ فروغ سے شروع ہوتی ہے۔

اس خاندان کے راجہ خالص راجپوت ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اس میں شک نہیں راجپوتوں کا قبیلہ سولنکی (چالوکیہ، چالوکی، سولنکی) اب تک اسی نام سے راجپوتانے میں آباد ہے چونکہ یہ سولنکی بعض شہادتوں سے پریہاروں کے ہم نسل ثابت ہوئے ہیں، لہٰذا ونسنٹ اسمتھ کی رائے ہے کہ اگرچہ خاندان چالوکیہ غالباً راجپوتانے سے دکن میں آیا مگر نسلاً گوجروں ہی کی اس شاخ میں ہے جو "چاپ" کے نام سے موسوم تھی[2]۔

پل کیسن اول و دوم

بہرحال اس خاندان کا بانی **پل کیسن** (اول) Pulakesin ہوا ہے جس نے چھٹی صدی کے وسط میں شہر **واتاپی** پر قبضہ کیا اور ایک آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی۔ (یہ بستی جو آج کل بادامی کہلاتی ہے موجودہ بیجاپور کے ضلع میں واقع ہے) ابتدا میں یہ ریاست بہت چھوٹی تھی مگر بانی خاندان کو ابھی سے مہاراج ادھی راج بننے کا ارمان تھا، اور بیان کرتے ہیں کہ اس نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی، اس کی وفات کا ٹھیک سن معلوم نہیں لیکن اس کے دو بیٹوں نے اپنے عہدِ حکومت میں

---

[1] ان میں کدمب اور گنگ خاندان کے نام زیادہ مشہور ہیں، جن کی موجودہ میسور کے علاقے میں حکومتیں قائم تھیں۔ پہلے خاندان کی قدامت اشوکی کتبات سے ثابت ہے مگر تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک اس کے عروج کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ دوسرے یعنی گنگ خاندان کے راجہ گیارھویں صدی تک میسور کے بڑے حصے پر حکمراں اور دکن کی لڑائیوں میں حصہ لیتے رہے اور اسی خاندان کی ایک شاخ چھٹی صدی سے سولھویں صدی عیسوی تک ملک اڑیسہ پر فرماں روائی کرتی رہی۔ ان کے علاوہ رٹ اور کلچوری قبیلوں کے نام بھی ملتے ہیں جو دکن کے بعض اقطاع پر حکمراں تھے۔

[2] ارلی ہسٹری ص صفحہ ۴۲۴۔

باب ۱۲

حدودِ مملکت کو وسعت دی اور ساتویں صدی کے آغاز سے پہلے واتاپی ایک بڑی ریاست کا پایۂ تخت بن گیا۔ پل کیسن اول کا دوسرا بیٹا **منگلس** مرا تو سلطنت کے لیے اس کی اولاد میں سخت خانہ جنگی برپا ہوئی اور آخر اُس کا بھتیجا **پل کیسن** (ثانی) سب حریفوں پر غالب آکر تخت کا مالک ہو گیا (۶۰۸ء) یہی وہ راجہ ہے جس نے قنوج کے راجہ **ہرش** کے لشکرِ عظیم کو نربدا کے کنارے روکا اور تمام شمالی دکن پر تسلط حاصل کر لیا تھا کہتے ہیں کہ گجرات اور مالوے بلکہ راجپوتانے تک کے راجہ اس سے ڈرتے تھے اور جنوبی ہند کی لڑائیوں میں بھی اول اول وہی کامیاب ہوتا رہا۔ اس کی جنگی قوت اور وفادار فوج کا ہوئین چوانگ چینی نے بھی ذکر کیا ہے جو ۶۴۱ء میں پل کیسن کے دربار میں آیا تھا۔ اور اس زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس راجہ نے ناسک یا اس کے قریب کسی مقام کو اپنا مستقر بنا لیا تھا جس کا غالباً بڑا سبب یہ تھا کہ جنوب مشرق میں اُس کے بھائی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور ۶۱۵ء سے وہاں علیحدہ ریاست قائم ہو گئی تھی۔ اس حصۂ ملک کو ونگی کہتے ہیں اور اس کا پایۂ تخت پشت پور تھا جو پتھاپورم کے نام سے گوداوری کے ضلع میں ابھی تک آباد ہے۔

مگر پل کیسن کو آخری اور سب سے بڑی زک اپنے جنوبی دشمنوں کے ہاتھ سے پہنچی اور **پلوی** (Pallava) خاندان کے راجہ **نرسمہ ورمن** نے ۶۴۲ء میں شکست دے کر اس کا تمام ملک چھین لیا۔ غالباً اسی لڑائی میں وہ مارا گیا اور تیرہ برس تک یہ سلطنت شہر کانچی کے پلوی راجاؤں کے قبضے میں رہی اور گو ۶۵۵ء میں پل کیسن (ثانی) کے بیٹے نے اپنی موروثی ریاست پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن پلویوں سے ایک صدی تک برابر جنگ ہوتی رہی جس نے رفتہ رفتہ چالوکیہ خاندان کے راجاؤں کو کمزور کر دیا اور ۷۵۳ء میں ایک نئے خاندان نے ان کی رہی سہی قوت خاک میں ملا دی۔

راشٹر کوٹ

یہ خاندان **راشٹر کوٹ** کہلاتا ہے اور اس کا پہلا راجہ **دنتی** درگا ہوا ہے جس نے غالباً ۷۶۰ء میں واتاپی پر قبضہ کر لیا۔ دنتی درگا کو اس کے چچا کرشنا (اول) نے معزول کیا اور بعض جنگی فتوحات حاصل کرنے کے علاوہ ایلورا میں وہ عظیم الشان

کوہ تراشیدہ مندر بنوایا جو "کیلاش" کے نام سے مشہور ہے! اس خاندان کے چوتھے اور پانچویں راجاؤں نے سلطنت کو اور وسعت دی اور کوہستان بندھیاچل سے تنگ بھدرا ندی تک تمام دکن کو فتح کر لیا۔ مگر چالوکیہ خاندان کی مشرقی شاخ ابھی تک صوبہ ونگی کی مالک تھی اور خاندان راشٹر کوٹ (یا رٹا) کا چھٹا راجہ **اموگھ ورش** (Amoghava-rsha) بہت دن تک اس سے الجھتا رہا۔ کہتے ہیں کہ یہ راجہ ۸۱۵ء سے شاید ۸۷۷ء تک یعنی باسٹھ (۶۲) سال سریر آرائے ریاست رہا اور اس کی دولت وقوت کا عینی گواہ ایک عرب تاجر ہے جو نویں صدی کے وسط میں ادھر آیا تھا۔ واضح رہے کہ جنوبی گجرات اور ہندوستان کے مغربی سواحل انھی دکنی بادشاہوں کے قبضے میں تھے اور چونکہ وہ اپنی رعایا کی مرفہ الحالی خاصکر تجارت کی ترقی میں ساعی رہتے تھے لہذا سندھ کے عرب تاجروں پر، جن کے ہاتھ میں اُس وقت ہند کی بحری تجارت تھی، وہ بہت مہربان تھے۔ اسی تجارت کے سلسلے میں وہ عرب سوداگر (سلیمان)، دکن آیا، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اموگھ ورش اپنا پائے تخت مانکھیت میں منتقل کر چکا تھا جو آج کل مال کھیڑ کے نام سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں داخل ہے۔

اس خاندان کا ایک اور نامی راجہ اندر (ثالث) ہوا ہے جس نے شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی اور قنوج کے راجہ کو شکست دے کر اس کا پائے تخت چھین لیا۔ لیکن اس اولوالعزمی اور فتوحات کے باوجود اس راجہ نے زیادہ عمر نہ پائی اور صرف دو سال سلطنت کر کے فوت ہوگیا (۹۱۶ء)۔

چالوکیہ خاندان کا دوسرا دور

راشٹر کوٹ خاندان کا آخری فرماں روا **لک** (یا لگہ) تھا اور اسے ۹۷۳ء میں قدیم چالوکیہ خاندان کے ایک سردار نے شکست دے کر دوبارہ اپنی سلطنت قائم کر لی۔ مگر پہلی اور دوسری سلطنت میں فرق رکھنے کی غرض سے ان متاخرین کو **چالوکیان کلیانی** کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ اس دوسرے خاندان کے بانی راجہ **تیل یا تیلپ** (Taila) نے ممالک محروسہ کے موجودہ ضلع بیدر میں شہر **کلیانی** کو خود بسایا اور اپنا پائے تخت بنا لیا تھا۔

تیل نے چوبیس برس حکومت کی اور گجرات کے سوا تمام علاقہ جو پہلے کسی وقت سلطنت چالوکیہ میں داخل تھا، فتح کیا۔ جنوبی مالوے میں اس کی دھار کے راجہ منج سے کئی لڑائیاں ہوئیں اور اول اول سب معرکوں میں

باب ۱۶

یہ اقتدار قائم رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی سپہ سالار ملک کافور اور خواجہ حاجی دیوگری کے سرکش راجہ کو سزا دینے دکن پر حملہ آور ہوئے اور فتح مندوں کا یہی سیلاب خاندان ہوے سل کو بہا لے گیا۔ ۱۳۲۶ء میں جب مسلمانوں نے دوسری مرتبہ دوارسمدر کو فتح کیا تو اس خاندان کی خود مختار بادشاہی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

دیوگری کے راجہ

دیوگری (موجودہ دولت آباد) کی ریاست سلطنت چالوکیہ کی باجگزار تھی لیکن یہ سلطنت کمزور ہوئی تو وہاں کے رئیس خود مختار ہوگئے۔ یہ جادو (Yadava) خاندان کے راجہ کہلاتے ہیں اور تیرھویں صدی کے شروع میں ان کے راجہ سنگھن نے اس ریاست کو بہت وسیع و قوی بنا دیا تھا۔ لیکن یہ عروج چند روزہ تھا کیونکہ اول تو دکن کے راجاؤں کو باہمی جنگ و جدال سے فرصت نہ تھی دوسرے تیرھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی اور ۱۳۰۹ء میں یہ شمالی ریاست مستقل طور پر شاہانِ دہلی کا صوبہ بن گئی۔

دوسری فصل: جنوبی ریاستیں

ہندوستان کے سب سے جنوبی مثلث میں قدیم سے تین سلطنتوں کا پتا چلتا ہے: پانڈیا[۱]، چیرا[۲] (یا کرالا) اور چولا[۳]۔ پہلی کا ذکر مگاس تھینیز نے اپنی کتاب الہند میں کیا ہے۔ اشوک کی کتبات میں تینوں بلکہ ایک چوتھی ریاست کرال پترا کا نام بھی آتا ہے جو سب سے قدیم تھی اور آخر میں پانڈیا کا جزو بن گئی۔ ان تینوں میں سب سے جنوبی یہی ریاست پانڈیا تھی اور اس کے مغرب میں موجودہ کوچین تک ریاست چیرا کا علاقہ تھا۔ ساحل کورومنڈل اور میسور کا مشرقی علاقہ ریاست چولا میں داخل تھا اگرچہ باہمی جنگ و جدال آئے دن ان ریاستوں کی حدود کو بدلتی رہتی تھی۔ ان ریاستوں کے تاریخی واقعات بالکل تاریکی میں ہیں۔ اگرچہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ یہ قدیم سے متمدن ریاستیں تھیں اور یہاں کا تجارتی مال دور دور تک جہازوں میں جاتا تھا۔ تامل زبان میں پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی کئی نظمیں محفوظ ہیں

باب ۱۶

ملیالم زبان کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا اور جنوبی ہند میں ہر جگہ تامل بولی جاتی تھی۔ شہر مدورا اس کے قدیم علم ادب کا مولد و منشا مانا جاتا ہے جہاں شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ اس زبان کی قدیم نظموں میں سب سے زیادہ مشہور کورل، سلپٹ دھکارم اور منیمے کھلے ہیں اور اب تینوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ کورل میں اخلاق اور صفات حسنہ کی تعلیم ہے۔ سلپ دھکارم (یعنی چوڑی کی داستان) اور منیمے کھلے (یعنی "عقد جواہر") محض قصے ہیں جن سے اس زمانے کے مذہب اور تمدن کا پتا چلتا ہے۔ بہت سے شعرا اور امیروں کا بھی ان میں ضمناً ذکر آگیا ہے اور انھی کی بنا پر بعض اہل تحقیق نے جنوبی ریاستوں کے تاریخی حالات کا کچھ سراغ لگایا ہے۔ لیکن یہ حالات سنین کے اعتبار سے مسلسل نہیں اور اسی لیے پانچویں صدی عیسوی تک جبکہ جنوبی ہند میں ایک نئی قوم کو عروج ہوا، درحقیقت ان ممالک کی کوئی تاریخ نہیں۔

پالوا یا پلوی

یہ نئی قوم تاریخ میں پالوا (Pallava) یا پلو کے نام سے موسوم ہے اور ہم تلفظ کی آسانی کے لیے اسے پلوی کہنے لگے ہیں اور اسی میں یہ خیال بھی مضمر ہے کہ غالباً یہ لوگ پہلوی یا پارتھی نسل سے تھے مگر ونسنٹ اسمتھ اس خیال کو صحیح نہیں جانتا اور اس کے نزدیک یہ جنوبی ہند ہی کی کوئی جنگلی قوم تھی جس نے پانچویں صدی میں ریاست چولا کا شمالی علاقہ فتح کر لیا اور مستقل طور پر اپنی ایک ریاست علحدہ قائم کی جس کا پایۂ تخت کانچی (یا کانجی ورم) تھا۔ پھر چھٹی صدی عیسوی میں انھیں یہ اقتدار حاصل ہوا کہ جنوبی ہند کے سب فرماں روا کسی حد تک ان کے زیر دست ہو گئے یا کم سے کم ان سے خوف زدہ رہنے لگے تھے۔ ایک کتبے میں سمہا وشنو دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے چیرا، چولا، پانڈیا اور لنکا کے بادشاہوں کو شکست دی۔ اور یہ پلوی خاندان کا راجہ چھٹی صدی عیسوی کے آخری ربع میں فرماں روائی کرتا تھا۔ دیگر شواہد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عین عروج کے زمانے میں اس خاندان کے راجہ اڑیسہ کی سرحد سے پونیار یا پنیار ندی تک جزیرہ نمائے ہند کے مشرقی ساحل پر قابض تھے اور مشرقی میسور اور شمالی دکن کے راجہ ان کی سیادت تسلیم کرتے تھے۔ اگرچہ براہ راست ان کی حکومت صرف اس علاقے پر تھی جو آج کل ارکاٹ، مدراس، ترچناپلی اور تنجور کے انگریزی اضلاع میں داخل ہے۔ ساتویں صدی میں چالوکیہ خاندان کے راجاؤں نے ان سے

باب ۱۶

شمالی علاقہ (ونگی) چھین لیا تھا بایں ہمہ دو صدی تک ان کی قوت بنی رہی اور اسی زمانے میں اُن کے راجاؤں نے وہ قابل دید عمارات بنوائیں جو آج بھی اُن کی دولت و حشمت کی گواہی دیتی ہیں۔

مہندرورمن اور نرسمہاورمن

پلویوں کے مشہور بادشاہوں میں پہلا **مہندرورمن** (اول) گزرا ہے جو غالباً ساتویں صدی کے آغاز میں فرماں روائی کرتا تھا۔ اُس نے بعض کوہ تراشیدہ مناور بنوائے اور "مہندرواڑی" کے کھنڈر آج بھی اس کا نام یاد دلاتے ہیں۔ یہ شہر اس نے موجودہ ارکاٹ کے کچھ شمال میں آباد کیا اور اس کے قریب بہت بڑا تالاب بنوایا تھا۔ چالوکیہ خاندان کے راجہ پل کیسن (ثانی) نے غالباً ۶۱۰ء میں اسی کو شکست دی اور علاقہ ونگی چھین لیا جہاں اس خاندان کی ایک دوسری شاخ نے اپنی ریاست علیحدہ قائم کی تھی۔ اور اس کا ذکر پچھلی فصل میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے راجہ مہندر پہلے جین مت کا پیرو تھا مگر پھر "ویرشیو" فرقے کا معتقد اور اپنے پچھلے مذہب کا دشمن ہوگیا۔ چنانچہ جنوبی ارکاٹ میں جینیوں کی ایک بڑی خانقاہ اُسی نے منہدم کرادی تھی۔ مگر پلویوں کا سب سے اقبال مند فرماں روا **نرسمہاورمن** گزرا ہے جو مہندر کا جانشین تھا اور قیاساً ۶۲۵ء سے ۶۴۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ اُس نے چالوکیہ خاندان کے راجہ سے پچھلی ہزیمت کا بدلہ لیا اور پل کیسن کو شکست فاش دی۔ شاید اسی لڑائی میں یہ چالوکی راجہ مارا گیا اور اس کے پائے تخت پر پلویوں کا قبضہ ہوگیا (۶۴۲ء)۔

چینی سیاح ہوئین چوئینگ اسی راجہ کے زمانے میں اس طرف آیا اور چونکہ لنکا میں ان دنوں خانہ جنگی اور کشت و خون کا ہنگامہ برپا تھا اس لیے ہوئین چوئینگ نے وہاں جانے کا قصد ملتوی کیا اور کانچی ہی سے شمال میں واپس چلا گیا۔ اس کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت جنوبی ہند میں بودھ مت کے درویشوں کی بہت سی خانقاہیں موجود تھیں[۱]۔

---

[۱] ان خانقاہوں کو توڑ پھوڑ کر بعد میں ہندووں نے ان کی بجائے اپنے بت خانے بنائے تھے۔ حال ہی میں کنجی ورم کے بعض مندروں سے گوتم بودھ کی مورتیں دستیاب ہوئی ہیں اور ونسنٹ اسمتھ کو یقین ہے کہ آیندہ تحقیقات سے بودھ مت کے اور بہت سے آثار باقیہ اس علاقے میں دریافت ہوں گے (اوکسفرڈ ہسٹری ص۔ ۲۰۹)۔

لیکن عام طور پر جین مت کے فرقے "دگمبرا" کا زور تھا اور "ویرشیو" کا نیا فرقہ بھی بہت تیز ترقی کر رہا تھا۔

مگر نرسمہا ورمن کی سب سے بڑی وجہ شہرت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں نقاشی اور فنِ عمارت کو فروغ ہوا۔ **مامل پورم** نامی شہر کی بنا اسی نے ڈالی تھی اور وہاں اب تک وہ عالیشان "ہفت منادر" موجود ہیں جنھیں پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا۔ ان کو فنِ تعمیر و کوہ تراشی کی لاجواب یادگار مانا جاتا ہے۔ اور انھیں مندروں کے اندر چٹان کو تراش کر دیوی دیوتاؤں کی مورتیں بنائی ہیں یہ کام اتنے وسیع پیمانے پر شروع کیا گیا تھا کہ نرسمہا کی زندگی میں اتمام کو نہ پہنچا اور اس کے جانشینوں کو ہمسایوں کی یورشوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ اسے آخر تک جاری رکھ سکتے دوسرے ان کے شوقِ تعمیر کے لیے اور مقامات تھے جہاں انھوں نے آٹھویں صدی کے اوائل میں بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ مگر زوال گویا دولت و اقبال کی تاک میں رہتا ہے۔ پلویوں کی قوت کو عروج پر پہنچے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی کہ اُن کے زوال کے آثار نظر آنے لگے۔ عروج کے زمانے میں انھوں نے اپنے ہمسایوں کو خوب ستایا تھا اب خود ان کے ستائے جانے کی باری تھی چنانچہ آٹھویں اور نویں صدی میں شمال و جنوب کے رقیبوں نے انھیں بار بار شکستیں دیں اور نویں صدی کے ختم ہونے سے کچھ عرصے پہلے چولا خاندان کے راجہ **آدتیا** نے شکست فاش دے کر ان کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔ بعد میں کئی صدی تک ہم اُن کے مقامی راجاؤں کا کہیں کہیں نام سنتے ہیں مگر ان کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی اور غالباً سترھویں صدی کے اخیر تک اس قوم کا نام فقط تاریخ کے اوراق میں رہ گیا۔

چولا خاندان

پلویوں کا خاتمہ، چولا خاندان کی صحیح تاریخ کا آغاز ہے۔ یعنی صحتِ سنین کے لحاظ سے آدیتا کا بیٹا **پران تک** (اول) پہلا راجہ ہے جس کی جانشینی اور وفات کی ٹھیک تاریخ بتائی جا سکتی ہے۔ وہ ۹۰۷ء میں تخت نشین ہوا اور بیالیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ عہد حکومت کی درازی کے علاوہ اس کے اقبال مند ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس نے اپنے جنوبی حریفوں کو زیر کیا۔ پانڈیا خاندان کا راجہ شکست کھا کے وطن سے نکل گیا۔ پائے تخت مدورا پر فتحمندوں کا قبضہ ہو گیا اور پران تک نے آگے بڑھ کر

باب ۱۲

لنکا میں فوج اُتاری۔

جنوبی ہند کی ان ریاستوں میں باہم، اور لنکا والوں کے ساتھ آئے دن لڑائی ہوتی رہتی تھی اور کبھی ایک فریق غالب آجاتا تھا کبھی دوسرا لیکن راج راج دیو (Rajaraja Deva) کے زمانے میں چولا خاندان کو جو غلبہ حاصل ہوا اس میں کم سے کم نصف صدی تک کوئی کمی نہ آئی اور اُس عہدِ انقلابات میں یہ کچھ معمولی بات نہ تھی۔ ان کے اس عہدِ عروج کا آغاز ۹۸۵ء سے ہوتا ہے جبکہ خانہ جنگی، قتل اور سازشوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد راج راج تخت نشین ہوا اور خاتمہ ۱۰۳۵ء کو سمجھنا چاہیے جو اُس کے بیٹے راجندر کی وفات کا سال ہے۔ اس تمام مدت میں پانڈیا خاندان کے راجہ طوعاً و کرہاً اپنے شمالی ہمسایوں کی سیادت تسلیم کرتے رہے اور انھیں جنوبی ہند کی تیسری ریاست پر حملہ کرنے کی فرصت ملی چنانچہ ۹۹۳ء میں راج راج نے چیرا خاندان کے مُلک[1] پر فوج کشی کی اور موجودہ **کورگ** کا علاقہ فتح کرلیا۔ پھر اس نے جانب شمال پیش قدمی کی اور ونگی کے چالوکی راجاؤں کا قلع قمع کیا جو پلویوں سے چھین کر کئی صدی سے اس علاقے کے مالک بنے ہوئے تھے۔ راج راج کی شمالی فتوحات کی حد اڑیسہ کو سمجھنا چاہیے جس کے جنوبی حصے پر اُس کا قبضہ ہوگیا تھا جنوب میں اس اقبال مند راجہ نے لنکا سے خراج وصول کیا اور ایک بڑا جنگی بیڑا بنا کے قریب کے بعض جزائر فتح کرلیے۔ پھر بیس برس تک شمشیر زنی اور مسلسل فتوحات کے بعد اُس نے تلوار ہاتھ سے رکھی تو موجودہ "احاطۂ مدراس" کا قریب قریب تمام علاقہ سلطنت چولا میں شامل تھا۔

راج راج نے اپنی زندگی کے باقی دن امن و امان کے مشغلوں میں بسر کیے اور اپنے صدر مقام **تنجور** میں وہ عالیشان مندر تعمیر کیا جس کی دیواروں پر اس کے جنگی کارنامے کندہ ہیں۔ یہ عمارت اب تک اپنے نامور بانی کی یاد دلاتی ہے۔ اور اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خود وشنو کے پرستار ہونے کے باوجود اُس نے

---

[1] واضح رہے کہ ان ملکوں اور اُن کے شاہی خاندانوں کے نام ایک ہیں، یعنی چیرا، چولا اور پانڈیا (یا پانڈیاں) کے لفظ کا جس طرح اُن کے خاندانوں پر اطلاق ہو سکتا ہے اسی طرح اُن کے علاقے بھی اُنھیں ناموں سے منسوب کر دیے جاتے ہیں۔

بودھ مت والوں کے لیے بھی ایک مندر تعمیر کرادیا تھا اور پندرھویں صدی تک لوگ اس کی زیارت کرنے آتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں رومن کیتھولک پادریوں نے اسے کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر خود قبضہ کیا اور تڑوا کر اپنی عمارتیں بنوالیں[1]۔

راج راج کے بعد جب اُس کا بیٹا **راجندر** (اول) تخت نشین ہوا (۱۰۱۲ء) تو پھر جنوبی ہند کے سپاہیوں کی تلواریں جو اتنے دن سے میان میں پڑی پڑی زنگ آلودہ ہوئی جاتی تھیں، مختلف میدانوں میں چمکنے لگیں۔ اس علاقے کا یہی راجہ ہے جس نے شمال میں بنگالے تک یلغار کی اور تنجوری سواروں کے گھوڑوں کو گنگا کا پانی پلادیا۔ یہ ۱۰۲۳ء کے قریب کا واقعہ ہے اور اس وقت بنگالے میں مہی پال فرماں روا تھا جسے راجندر نے شکست دی۔ مگر ایسی فتح کا کوئی دیرپا نتیجہ نہ نکل سکتا تھا اور اس راجہ کی بحری فتوحات کا بھی یہی حال ہوا کہ گو اس کے بیڑے نے جنوبی برما تک میں چولا خاندان کا جھنڈا گاڑ دیا لیکن وہاں زیادہ عرصے ان کا قبضہ نہ رہ سکا۔ البتہ راجندر کا ان کارناموں پر فخر کرنا کچھ بےجا نہ تھا چنانچہ گنگا تک فاتحانہ پیش قدمی کی یادگار ہی میں اُس نے "گنگئے کنڈ" کا لقب اختیار کیا اور موجودہ ضلع ترچناپلی میں ایک نئے پائے تخت کی بنیاد ڈالی جس کا نام "گنگئے کنڈ چولا پورم" تھا۔ یہاں اس کے تعمیر کردہ محل اور عالیشان مندر کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔

راجندر کی وفات (۱۰۳۵ء) کے بعد اس خاندان میں تیس پینتیس برس تک اندرونی فساد اور خانہ جنگیاں برپا رہیں۔ مگر کشت و خون کی داستان میں یا اس زمانے کی بیرونی لڑائیوں میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں البتہ جب اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث یہ ریاست راجندر اول کے نواسے کے ورثے میں آئی تو کہنا چاہیے کہ جنوبی ہند کے نصیب جاگ اُٹھے۔

کلوتنگ چولا

یہ راج کمار جس کی ماں وِنگی کے چالوکی راجہ کو بیاہی گئی تھی، ایک طرف تو اپنے باپ کی ریاست (وِنگی) کا مالک تھا اور دوسری طرف ریاست چولا اسے ورثے میں مل گئی (۱۰۷۰ء) اور آیندہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نہ صرف

---

[1] ۔ ارلی ہسٹری صفحہ ۴۶۶۔

باب ۱۶

اُس کی بلکہ اس تمام علاقے کی خوش قسمتی تھی کیونکہ دونوں ریاستوں پر قبضہ ہونے کے بعد اس راجہ نے بیرونی فتوحات کے علاوہ اندرونی فتنہ وفساد سے رعایا کو نجات دلائی اور نظم ونسق میں مفید اصلاحیں کیں اور ۱۰۸۶ئہ[1] میں مالگزاری کی تشخیص اور زمین کی از سرِ نو پیمائش کرائی[2]۔

اس نے کلوتنگ چولا کا لقب اختیار کیا تھا مگر وہ اور اس کی اولاد چالو کی چولا خاندان کے نام سے تاریخ میں موسوم ہے تاکہ ان میں اور اصلی چولا خاندان میں امتیاز رہے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جنوبی ہند میں اُن کی سیادت قائم رہی اور عمدہ نظم ونسق کی بدولت مُلک میں امن وامان وخوش حالی کا دَور دورہ رہا۔ اس زمانے کے تمدن کا کچھ حال اگلی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ واقعاتِ تاریخی کے سلسلے میں یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ تیرھویں صدی میں چالوکی چولا خاندان میں ضعف آگیا ریاست پانڈیا کے خود مختار ہو جانے سے وہاں کے راجہ اور بھی کمزور ہو گئے اور آخر میں جب وجیانگر کی نئی سلطنت نے سر اُبھارا تو اُن کی سطوت کا آفتاب جو زوال کے درجے طے کر رہا تھا، غروب ہو گیا۔

پانڈیا اور چیرا

چولا خاندان کے انحطاط نے ریاست پانڈیا کو جنوب میں سب سے طاقتور بنا دیا تھا مگر اس کا یہ عروج زیادہ عرصے نہ رہا اور مسلمانوں کے دکن میں حملہ آور ہونے کے وقت وہاں کے راجہ رفتہ رفتہ اپنی خود مختاری کھو کر معمولی جاگیردار رہ گئے۔

ان کی اس سے پہلے کی تاریخ میں ہمسایوں سے جنگ وجدال یا مذہبی کشت وخون کی خوفناک روایتوں کے سوا کوئی کارآمد بات نہیں ملتی۔ مگر ان مذہبی خونریزیوں میں کم سے کم ایک واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں جب پانڈیا راجہ ندومارن

---

[1] یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان کو جب ولیم (فاتح) نے فتح کیا تو اس کے حکم سے اُس مُلک کی پہلی مرتبہ (اگرچہ کسی قدر ناقص) پیمائش اسی سال ہوئی تھی (۱۰۸۶ئہ)۔

[2] مسٹر کرشنا سوامی اینگر نے اس بات کی قدیم تحریری شہادت پیش کی ہے کہ جنوبی ہند میں اس قسم کی پیمائشیں بہت پہلے سے رواج پا چکی تھیں۔ اس مضمون پر ان کی کتاب "این شیئنٹ انڈیا" کا چوتھا باب خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔